اسلام اور مستشرقین

جلد سوم

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

ں، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ - یوپی (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلہ دارالمصنفین نمبر ۱۵۸

نام کتاب : اسلام اور مستشرقین جلد سوم

مرتب : سید صباح الدین عبدالرحمٰن

صفحات : ۳۰۴ + ۶ = ۳۱۰

ایڈیشن : ۲۰۰۳ء

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

ناشر : دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

قیمت :

باھتمام

عبدالمنان ہلالی

فہرست مقالات

اسلام اور مستشرقین جلد سوم

دیباچہ

اس وقت ہمارے ناظرین کے ہاتھوں میں جو کتاب ہے وہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے سلسلۂ اسلام اور مستشرقین کی تیسری جلد ہے، جو بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس سلسلہ کی چوتھی اور پانچویں جلد کے بعد شایع ہو رہی ہے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں ۱۹۸۲ء میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس میں جو مقالات پڑھے یا پیش کیے گیے تھے، وہ تو دوسری جلد میں شائع کر دیے گیے ہیں، لیکن اس سمینار کے بعد جو مقالات معارف میں چھپنے کے لیے آئے یا معارف کے لیے ہمارے رفقا نے لکھے وہ اس تیسری جلد میں جمع کر دیے گیے ہیں، ان کے علاوہ مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی مرحوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مستشرقین کے عنوان سے قصص القرآن میں جو مضمون لکھا تھا، وہ بھی اس میں ہے، ایک بار پھر یاد دلا دیں کہ ان جلدوں کی ترتیب کے وقت یہ خیال آیا کہ اس موضوع پر اردو اور عربی میں جو اچھے مضامین شائع ہوئے ہیں ان کو جمع کر کے اگر الگ الگ جلدوں میں شایع کر دیا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا، اس سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے جو کچھ لکھا تھا، وہ چوتھی جلد میں ہے اور اس کی پانچویں جلد میں وہ مضامین ہیں جو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین کے متعلق لکھے تھے، اس کی چھٹی جلد بھی زیر طبع ہے، اس میں وہ مضامین ہیں جو ہندوستان کے اندر اردو میں لکھے گئے یا جو عربی سے خاص طور پر ترجمہ کرائے گیے اور اسی طرح ساتویں جلد کی اشاعت کا بھی خیال ہے اور اگر ممکن ہوا تو ان جلدوں میں اور اضافہ کیا جائے گا۔

اب تک اردو میں ایسے لٹریچر بہت کم تھے، ان جلدوں میں کافی مواد آ گیا ہے، اس میں شک نہیں کہ مستشرقین نے اسلام کے خلاف اپنی زہریلی تحقیقات کا ایک انبار لگا دیا ہے

اور مستقبل میں بھی وہ اس سے زیادہ ڈھیر لگادیں گے، ان سب کا تو جواب دینا ممکن نہیں، گو ایک بیدار اور ترقی کرنے والی قوم کا یہی شیوہ ہونا چاہیئے کہ اس کے معاند اور ناقد اس کے مذہب کے خلاف جو زہر پھیلائیں، اس کا تریاق پیش کرتے رہیں، مگر ان مستشرقین کے لٹریچر کے انبار سے گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ پرانے مستشرقین جو کچھ لکھ گئے ہیں، انہیں کو نئے مستشرقین اپنے خاص ماہرانہ انداز میں دہراتے رہتے ہیں، اگر ہمارے ناظرین ان کے گم راہ کن معلومات، دوراز کار تاویلات اور متضاد ومتناقض تلبیسات کی دو چار باتوں سے بھی واقف ہو جائیں تو ان کے اندازِ فکر، طریقۂ بیان اور طرزِ تحریر کے مکروفریب سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے میں کامیاب رہیں گے، دارالمصنفین سے جو یہ جلدیں شائع ہو رہی ہیں، ان سے ہمارے ناظرین کو اسی قسم کی مدد ملے گی، امید ہے کہ ہمارے وہ نوجوان جو مستشرقین کی بہ ظاہر پراز معلومات تحقیقات سے متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے ان جلدوں کا مطالعہ بڑا کارآمد ہوگا۔

اس سلسلہ کی ترتیب میں ہمارے رفقا مولوی ضیاالدین اصلاحی، مولوی عبیداللہ کوٹی ندوی، حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی اور مولوی عبدالباری مصحح سے ہر طرح کی مدد ملی۔

سید صباح الدین عبدالرحمن
دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
یکم دسمبر ۱۹۸۶ء

ہدایاتِ ربانی

اور کافر لوگ ناحق کی باتیں پکڑ پکڑ کر جھگڑے نکالتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے حق بات کو نیچا دکھائیں اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس (عذاب) سے ان کو ڈرایا گیا تھا، اس کو دل لگی بنا رکھا ہے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے، پھر وہ اس سے روگردانی کرے اور جو کچھ اپنے ہاتھوں (گناہ) سمیٹ رہا ہے، اس (کے نتیجہ) کو بھول جائے، ہم نے اس حق بات کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، اور اس کے سننے سے ان کے کانوں میں ڈاٹ (دے رکھی) ہے اور اگر آپ ان کو راہِ راست کی طرف بلائیں تو ایسی حالت میں وہ ہرگز راہِ راست پر نہیں آئیں گے۔ (کہف: ۵۶-۵۷)

اور آپ سے یہود اور نصاریٰ کبھی خوش نہیں ہوں گے، جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جائیں، آپ صاف کہہ دیجئے کہ حقیقت میں تو ہدایت کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے۔ (البقرہ: ۱۲۰)

تم یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بنانا، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا۔ (مائدہ: ۵۱)

روسی استشراق

از

جناب محمد اسد شہاب صاحب جدہ سعودی عرب
مترجمہ مولوی عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔ رفیق دار المصنفین

جب استشراق اور مستشرق کے الفاظ کو مطلقاً بولا جاتا ہے تو ذہن مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ استشراق پر کسی قوم یا حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے، مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں اور روس کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اسلامی امور و مسائل کی جانب جس قدر اعتناء کیا ہے، وہ کسی طرح مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین سے کم نہیں ہے۔

بہت سے عرب اور مسلمان مصنفین نے یورپی استشراق و مستشرقین کے بارہ میں کتابیں لکھی ہیں، مگر روس یا مشرقی یورپ کے استشراق اور مستشرقین کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں روسی استشراق کی ابتدا اور نشو ونما کا ذکر کیا جائے گا۔

استشراق کا دائرۂ کار اور طریقۂ عمل جدا جدا ہوتا ہے، مگر اس کا خاص رخ اور مطمح نظر مخصوص مصالح و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے اس کا معاملہ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی ہوتا ہے۔ نیز کبھی وہ کسی حکومت کے زیر سایہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے، ایسی صورت میں اس کے لئے مخصوص بجٹ بنایا جاتا ہے اور وہ کبھی اپنی حکومت کی ملکی و سیاسی مصلحتوں سے بے تعلق نہیں رہتا۔

پہلے زار روس اور اب کمیونسٹ روس کی وسط ایشیا میں کئی نو آبادیاں ہیں جیسے ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان، ترکمانستان، کرمینستان وغیرہ۔ یہ سب مسلم ریاستیں ہیں جن کی مجموعی آبادی ایک سو بیس ملین سے کم نہ ہوگی، یہ تمام ریاستیں معدنی ذخائر، پٹرول اور زرعی پیداوار سے مالامال ہیں، موجودہ روسی سامراج کی اہمیت ان ہی زرخیز ریاستوں سے وابستہ ہے، اگر یہ اس کے قبضہ سے نکل جائیں تو پھر روس کا کوئی سیاسی وزن باقی نہیں رہ جائے گا۔

روس ایک سامراجی حکومت کی طرح ان ریاستوں پر حکومت کر رہا ہے، اس نے اپنی داخلی و خارجی سیاست کے استحکام کے لئے ان ریاستوں کو زیادہ اہمیت دینے کی پالیسی وضع کی ہے، اس لئے وہ ان ریاستوں کے مسلمانوں کی جانب خاص توجہ مبذول کئے ہوئے ہے، اور ان کے عقائد و افکار، تہذیب و ثقافت اور رجحانات و میلانات کا بھی برابر مطالعہ کرتا رہتا ہے،

تاکہ اس کی استعمار پر مبنی سیاست بھی مضبوط و مستحکم رہے اور کسی بیرونی یا اندرونی مسلم مداخلت کا بھی اندیشہ نہ رہے۔

روسی استشراق میں سیاسی مصالح کے تحت تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے تاکہ وہ اپنی ان وسیع و عریض اور شاداب و زرخیز نو آبادیوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھاتا رہے، دراصل روس استشراق کے معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے جس پر ہالینڈ گامزن رہ چکا ہے، اسی بناء پر وہ اپنی تحقیق و مطالعہ کے اداروں کو ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے جن سے اس کے اصل مقاصد پر پردہ پڑا رہتا ہے، اور کہیں سے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان علمی و تحقیقی کاموں کے پس پشت کچھ دوسرے اغراض بھی ہیں، ہالینڈ نے تو استشراق کا لفظ بھی باقی نہ رکھا اور اس کے بجائے "اسلامی امور کی کونسل کا دفتر" نام رکھ کر اپنی استشراقی سرگرمیاں جاری رکھیں، ناموں کے انتخاب میں روس نے بھی اسی اصول کو اپنایا ہے، اس کے مختلف اداروں کے کچھ نام ملاحظہ ہوں:

(۱) معهد فنون شرقية (انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل آرٹس) (۲) مكتب شؤون اسلامية (آفس آف اسلامک افیرز) (۳) دار الافتاء (۴) مشرقی علوم کے ادارے (۵) جمعية اتحاد العلوم (۶) روس عرب فرینڈشپ سوسائٹی (۷) معهد الدراسات العليا للشؤون الاسلامية (انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسٹڈیز فار اسلامک افیرز) (۸) ادارۂ دینیہ برائے امور اسلامیہ۔

اسی طرح کے خوبصورت اور جاذب نظر ناموں کے پردے میں مستشرقین اور اسلامی امور کے ماہرین اپنے کارنامے انجام دینے میں مصروف ہیں۔

۱۸۵۲ء میں زار روس نے روسی مستشرقین اور عربی زبان کے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل کی جس کے بیشتر اراکین یہودی تھے، اس کمیٹی کا بنیادی اور اولین مقصد ان ضروری ولازمی وسائل کی فراہمی تھا جن کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا جاسکے اور فلسطین میں یہودی مہاجرین کو آباد کرایا جائے، روسی وفد کے زیر انتظام ان کے مریضوں کے لئے شفاخانے قائم کئے جائیں، روسی نمائندوں نے بیت المقدس کو ایک مرکز یہ کہہ کر بنایا کہ وہ وہاں روسی گرجاگھروں کی دیکھ بھال کریں گے۔ کیونکہ وہاں ایسے مسیحی بھی تھے جو روسی آرتھوڈکس مسلک کے پیرو تھے، نیز ان کے زیر نگرانی مختلف انسٹی ٹیوشن تھے۔

۱۸۶۲ء میں روس نے اس کمیٹی کے ممبروں کا ایک وفد خفیہ طور پر فلسطین بھیجا تاکہ یہ لوگ وہاں کے یتیم خانوں، شفاخانوں اور ان یہودی زائرین کی رہائش گاہوں کا جائزہ لیں جو دیوار گریہ کی زیارت کے لئے پوری دنیا سے وہاں آتے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں یہ کمیٹی ایک خودمختار سوسائٹی میں تبدیل ہوگئی، اس کا بنیادی بنیادی ضابطہ اصول (؟) مرتب ہوا، اس طرح ارتقار کا ایک مرحلہ طے ہوا، یہ تبدیلی محض نام کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ اب دائرہ کار بھی وسیع تر ہوا، اور ایک مختصر مدت میں اس سوسائٹی نے فلسطین اور بعض دوسرے عربی ممالک میں سو سے زیادہ اسکول قائم کر لئے، ان کے دروازے گو سب نو واردوں کے لئے کھلے تھے، لیکن اکثریت یہودیوں ہی کی تھی، ان اسکولوں کے نام قومی و وطنی ناموں پر تھے، ان میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد اس وقت دس ہزار سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

۱۸۸۲ء میں اس سوسائٹی نے سوسائٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت اختیار کر لی اور اپنا تعلق ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات (اسلامک اسٹڈیز) سے قائم کر لیا، سوسائٹی نے اس مقصد کے لیے ایک خاص علمی باڈی کی تشکیل کی جس میں اسلامی تحقیق و مطالعہ سے شغف رکھنے اور عربی و اسلامی تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو شامل کیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اس سوسائٹی نے ارکیولوجک مشن (بعثت اثریہ) کے نام سے عرب ملکوں کی زیارت کے لیے ایک وفد بھیجا تاکہ یہ فلسطین میں قیام کر کے وہاں کے آثار قدیمہ کا جائزہ لے۔

اس وفد نے دمشق، بیروت، حمص، حلب، حماۃ، مشرقی طرابلس، بیت المقدس اور خلیل کا دورہ کیا، اور ایک لمبی مدت تک بیت المقدس میں ان آثار علمیہ کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہا جن کا تعلق یہودیوں سے تھا، یہ یہودیوں کے قومی وطن کو منصۂ شہود پر لانے اور اسے تاریخی دلائل سے ثابت کرنے کی تمہید تھی، وفد اس موضوع پر اپنی مکمل رپورٹ اور دستاویزات کے ساتھ ماسکو واپس آیا اور آنے کے ساتھ ہی اس نے اسلامیات کے فضلار و ماہرین کا ایک اجتماع کیا، اس میں روسی مستشرقین کی ایک سوسائٹی کی تجویز منظور کی گئی، اس سوسائٹی کو روس کی اکاڈمی آف سائنسز کا تعاون بھی حاصل ہوا، اس سوسائٹی میں مندرجۂ ذیل روسی مستشرق شریک ہوئے:

(۱) ایف. ایس سیکوروف (۲) جے جے کراسکوفسکی (۳) اے. این برتشیف (۴) ایس. بی تالستوف (۵) ایف. ایف. بیلیفومینکایا، موخرالذکر دونوں حضرات اکاڈمی آف سائنسز کے بھی ممبر تھے۔

روسی مستشرقین کی یہ پہلی سوسائٹی تھی جو سرکاری طور پر اکاڈمی آف سائنسز کے تابع تھی، اس سوسائٹی کا پہلا خاص مقصد عرب ممالک اور عرب قوموں سے متعلق ہر ہر چیز کا مطالعہ تھا، اس کے بعد پھر مسلمانوں کا دینی، معاشرتی، ثقافتی، تاریخی اور اقتصادی جائزہ لینا تھا۔

اکاڈمی آف سائنسز کے اہم فرائض میں یہ بھی تھا کہ وہ علوم اسلامیہ کے خصوصی ماہرین کو تیار کرے، تاکہ وہ آئندہ روسی مستشرقین کی سوسائٹی میں داخل ہو سکیں اور ان کے اغراض و مقاصد میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔

ان امور و مسائل کو روس نے جن مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں

(۱) روس اور استنبول کی خلافت اسلامیہ کے درمیان پشتینی عداوت اور دیرینہ آویزش جس کی وجہ سے ترکی اور روس میں مسلسل جنگ برپا تھی۔

(۲) روس کی اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ۔

(۳) روس کے توسیع پسندانہ عزائم جس نے اسے پڑوس کے دولت مند علاقوں کا حریص بنا دیا تھا، اور وہ بحرابیض متوسط، خلیج عرب، اور بحر عرب تک پہونچ جانے اور عالمی بحری گذرگاہوں پر قابو پانے کی فکر میں لگ گیا تھا

(۴) وسط ایشیا میں مسلمانوں کو دبائے رکھنا تاکہ وہ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔

(۵) روسی سیاست کی طرف عالم اسلام کو متوجہ کرکے اس کے لیے ہمدردی اور تائید حاصل کرنا، ان اغراض کے پیش نظر روس نے عرب اور مسلمانوں سے متعلق ایک ایک چیز کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

یہ سوسائٹی ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی اس لئے اس نے ۱۹۷۲ء میں اپنے قیام کے نوّے برس گذر جانے کا جشن منایا، یہ جشن انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے مرکز میں یکم مئی کو منایا گیا، یکم مئی کو روسی مزدوروں کی عید کے دن کی حیثیت حاصل ہے، اس موقع پر مستشرق ایس۔ ایل۔ میتفنسکی نے جو سوسائٹی کے صدر بھی تھے ایک جامع رپورٹ پیش کی جس میں اس سوسائٹی کی نوّے سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تھا، اس رپورٹ میں جو چیز نہایت اہم ہے وہ اس بات کا اقرار ہے کہ اس سوسائٹی نے فلسطین میں یہودیوں کے تاریخی آثار کی حفاظت اور مرمت میں نمایاں خدمات انجام دیں، سوویٹ روس نے روسی مفاد کے پیش نظر معاشی ترقی میں عربوں کے ساتھ قربت اور ہم آہنگی میں جو پیش رفت کی، اس میں اس سوسائٹی کے کردار کو بھی اہمیت حاصل رہی، اس تقریب میں مستشرق کے۔ پی اسٹار کوف نے عالم اسلام کو اپنا موضوع بنایا، مستشرق ایم۔ اے کورسٹوفتیسف نے مصر میں قدیم فرعونی مذاہب اور توریت و زبور سے ان کا تعلق، کے موضوع پر مقالہ پڑھا، مستشرق ایل، وائی ناری رادزمی نے عرب و روس تعلقات تاریخ اور واقعات کی روشنی میں، کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

یہ سوسائٹی مختلف اوقات میں سیمناروں، کانفرنسوں اور کانگریسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے، ان موقعوں پر پڑھے

جانے والے تمام مقالات کی طباعت واشاعت کا انتظام بھی اسی سوسائٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

چند روسی مستشرقین کے نام اور عہدے (۱) یویوجان غوروف، ہیڈ آف دی انسٹیٹیوٹ ماسکو (۲) بلغولوف ماہر فقہ اسلامی (۳) یوبی کالیا، ماہر ادب عربی (۴) کریزینبیج ڈائرکٹر انسٹی آف لینن گراڈ اور ماہر ادب عربی وتاریخ اسلامی (۵) خالدوف، ماہر ادب عربی (۶) غردتفسٹ ماہر لغت ونحو (۷) میخائیلوف ماہر ادب عربی (۸) بیدوتوفسکی، ماہر تاریخ یمن (۹) یوشاکوف، ماہر سیاست ومعاشیات (۱۰) سفیتلانا ماہر ادب عربی ومذاہب (۱۱) بردودوف ماہر ادب عربی، مذاہب اسلامیہ وسیاسی تحریکات (۱۲) شوموسکی، ماہر جغرافیہ وعلم البحار (۱۳) کلیدوفش، ماہر فقہ وتاریخ اسلامی (۱۴) نزالوف، ماہر فقہ اسلامی (۱۵) کلیموفیش، سوسائٹی کے ترجمان کے مدیر اعلیٰ (۱۶) سیلیا بیدٹ اٹھی ترجمان کے تعلیمی مدیر (۱۷) اکلی منیفریا (۱۸) پالیردسکایا (۱۹) تالیری مارسیس، ادیب ونقاد (۲۰) الیکزنڈر شٹرین ودلبین، فلسفی اور شاعر (۲۱) یوری لشین (۲۲) یوری غلاسوف، عربی زبان کے ادیب وانشاپرداز (۲۳) یوری لسوف (۲۴) فلادیمیر میکیی موف، عربی زبان کے انشاپرداز (۲۵) اغناز یوسیلوف (۲۹) الینا عردسس (۲۷) غیانکاریو فیفوریلی (۲۸) تخفینسکی صدر تگلو سائٹی (۲۶) کوردسفیتیف، ماہر تاریخ عربی (۳۰) ناوراد یزی، علوم وتاریخ اسلامی کے پروفیسر (۳۱) ساناروف (۳۲) احمار کردوا (۳۳) میتائیل بیدروف (۳۴) گریگوری سرباٹوف۔

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مستشرق میخائیل بیڈروف جو ایک یہودی الاصل اور صیہونی الاتجاہ مستشرق ہیں، اصل میں کون ہیں؟ یہ دوسری جنگ عظیم میں روسی فوج کے ایک کیپٹن تھے، بعد میں یہ چیکوسلواکیہ میں فوج کی ترتیب دینے چلے گئے، دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے ان کو ایک عرب ملک میں اپنا سفیر مقرر کیا، یہ انتہائی متعصب صیہونی مستشرق ہیں، روس سے یہودیوں کو فلسطین کی جانب منتقل کرنے کے پیچھے اصل دماغ انھیں کا تھا، ۱۹۳۵ء میں انھوں نے 'ارقون زوامی لومی' نامی ایک جماعت قائم کی جو بعد میں اسرائیلی فوج کا ایک حصہ بنی۔

ادارۂ اقوام ایشیا اس ادارہ کا مقصد بھی وہی ہے جو سوسائٹی کا ہے، البتہ یہ ادارہ ان تمام مقالات کو جو مستشرقین روس کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ تحقیق ہوتے ہیں جانچنے اور پرکھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے، اور انہی مقالات کی روشنی میں عرب اور اسلامی ممالک کے بارے میں روس کی خارجہ پالیسی اپنا طریقۂ کار اختیار کرتی ہے۔ اس ادارہ کو نامور روسی مستشرقین کے تحت رکھا جاتا ہے، مثلاً افنی بلیلیف، ڈاکٹر پلسکی، گریگوری سرباتوف، بورس دانسینخ، فلادیمیر

تس بویسکی، فردنیکا فورد ٹیا، اس ادارہ نے عرب ممالک سے متعلق چند کتابیں بھی شائع کی ہیں، مثلاً سوریا و لبنان (۱۹۶۴ء) جزیرۂ عرب و خلیج (۱۹۶۵ء) لیبیا (۱۹۶۵ء) عراق (۱۹۶۶ء) مصر (۱۹۶۸ء)، ان کتابوں میں مذکورہ ممالک کا انتہائی تفصیلی اور تحقیق سے جائزہ لیا گیا، اس جائزہ کی ابتداء ان ممالک میں اسلام کے داخلہ کے وقت سے ہی شروع ہوتی ہے، ان کتابوں میں مذہبی رجحانات، فقہی مسالک، عام عقائد، مذہبی اختلافات، لوگوں پر ان کے اثرات، حکومت اور سیاسی تعلقات پر ان مذہبی اختلافات کا اثر، حکومتوں کی خوبیاں اور خامیاں وغیرہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اسلامی حکومتوں کے کمزور پہلوؤں پر روس اپنی سیاست کو مرکوز کر دیتا ہے، مذہبی اختلافات کے پردہ میں روس کا یہ عمل رہا ہے کہ وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کو برانگیختہ کرنے والے پروگرام اس طرح مرتب کرتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ شدید ہو، یہ سب اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو خبر تک نہیں ہو پاتی، باہمی اختلافات اور دشمنی بڑھنے کی وجہ سے روس کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائے اور بزعم خود نئے انقلاب پسند طبقہ اور رجعت پسندوں کے مخالف افکار کو ان حلقوں کے فکر و عمل کی زینت بنائے۔

<u>لینن گراڈ کا کتب خانہ</u> | روس میں جتنے کتب خانے ہیں وہ سب استشراقی سوسائٹی سے تعاون کرتے ہیں، مشہور کتب خانوں لینن گراڈ کا کتب خانہ ہے یہ اسلامیات کے بارہ ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے، خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ کمیونسٹوں کے قبضہ کے وقت ان کے دست برد سے محفوظ رہا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب بربادی کے بعد اتنی بڑی تعداد محفوظ رہی تو وہ کس قدر نایاب اور وافر ذخیرۂ کتب رہا ہوگا جسے سپرد آتش کر دیا گیا، مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کی بھی ایک بڑی تعداد اس کتب خانہ میں جنہیں عالم اسلام اور غیر عالم اسلام میں ہر زبان میں چھپنے والی کتابیں شامل ہیں، روسی قوم کو ان کتابوں کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے لیکن مستشرقین کو ان کتابوں سے مراجعت اور استفادہ کا حق حاصل ہے۔

مستشرق گریگوری سرباٹوف کے بیان کے مطابق تاشقند کے کتب خانہ میں اس وقت اسّی ہزار اسلامی کتابیں ہیں جن میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں شامل ہیں یہ کتابیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں ہیں، صرف عربی کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار سے کم نہیں، روسی مستشرقین کی محنت اور اسلامیات سے ان کے گہرے شغف کے نتیجہ میں سوسائٹی کی ازبکستان شاخ نے کئی اسلامی کتابوں کو ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۲ء تک روسی زبان میں منتقل کیا اور یہ عمل اب بھی جاری ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں روس کی پالیسی دوہری ہے، اندرون ملک مقبوضہ مسلم ریاستوں کے بارہ میں اس کا

رزعمل اس طرزِ عمل سے قطعی مختلف ہے جو وہ دوسرے مسلم ممالک کے ساتھ روا رکھتا ہے، اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں وہ ندد اور سختی کا رویہ اپناتا ہے، لیکن ان اسلامی ممالک میں جہاں اس کا نفوذ اور غلبہ نہیں، وہ حکومت وقت کے خلاف تحریک کی تائید کرتا ہے، تخریبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ ں تحریکوں کو مادی فلسفے سے نہ صرف روشناس کراتا ہے بلکہ گرویدہ بھی بنا دیتا ہے، مذہبی اختلافی مسائل کو نمایاں کر کے نئی نسل کو جو ان اختلافات کی سطحیت سے تنگ آچکی ہوتی ہے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے رانے نظریات، قومی و وطنی مصلحتوں کے لیے ضرر رساں ہیں، اسلامی نظریات کو بے بنیاد اور بے جان ثابت کرنے کی کوشش کے بعد نئی نسل کے سامنے اشتراکیت اور سعادت کی ضامن قومیت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، سوویت روس کی ایسی آماجگاہیں ایشیا اور افریقہ دونوں جگہ ہیں، روس کو یقین ہے کہ اپنے ... امکانات اور وسائل کے ساتھ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا، ان سارے منصوبوں کی بنیاد دراصل انہی جائزوں پر ہوتی ہے جن کو روسی مستشرق پیش کرتے ہیں۔

خوبصورت اور شہد آگیں ناموں کے لیبل کے ساتھ یہ سوسائٹی اپنے ان جائزوں کو پیش کرتی ہے، مثلاً کلمۃ البحث العلمی، الدراسات التطبیقیۃ وغیرہ، علمی تحقیقات اور معروضی مطالعات کے یہ لیبل محض فریب کے لیے ہوتے ہیں، حقیقت میں یہ اسلامی قوموں کے لیے زہریلے اور خطرناک مواد سے پُر ہوتے ہیں، مثلاً مستشرق کلیمروشر کی کتاب جس کا نام ’الاسلام نشوءہ و مستقبلہ‘ ہے اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

"قرآن کی وہ رائیں جو کائنات، زمین اور آسمان کے بارہ میں ہیں، بالکل ابتدائی ہیں، اور سائنس کے منافی ہیں۔"

اس قسم کے بے بنیاد دعوؤں سے لبریز ان تحقیقات میں صرف الفاظ کی کھوکھلی ملمع کاری ہوتی ہے، علمی متانت سے بے نیاز، استہزا، تحقیر، آسمانی مذاہب پر بہتان اور عیب جوئی اور خوردہ گیری کی کثرت ہوتی ہے، اور اسلامی شخصیتوں کے لیے صرف حقارت آمیز الفاظ ہوتے ہیں ۔

روس کی اکاڈمی آف سائنسز نے مشرقی ادب کے مطالعہ میں تخصیص کے لیئے بھی ایک ادارہ قائم کیا ہے اس ادارہ میں مشرقیت کے قصوں، کہانیوں، افسانوں، دیومالائی واقعات، قومی روایات اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس ادارہ

سکے ذمہ دار بھی مستشرق ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ روسی مستشرقین کی تالیفات کو روسی مفاد کے مطابق ترکی، عربی، فارسی، ہندی، اردو، چینی اور دوسری زبانوں میں شائع کرتا ہے۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص ملک کے حالات کے مطابق صرف اسی ملک کی زبان میں وہ کتاب شائع کی جاتی ہے، دوسری زبانیں اس کتاب کی قدر و قیمت سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ کیموچ کی کتاب جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی ادارہ نے شائع کی ہے۔

روسی استشراق کی سیاست منزل بہ منزل

روسی استشراق نے اپنے محدود مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی سرگرمیوں کو تیز کرنے کا پروگرام بنایا اور مختلف ممالک میں، کانفرنسوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی اشاعت کے نئے طریقے اپنائے، سیمینار وغیرہ وسط ایشیا کے شہروں میں خاص طور سے منعقد کرائے گئے کہ وہاں اسلام کا نام اب بھی باقی ہے۔

۱۹۷۰ء کی ستمبر میں تاشقند میں ایک عالمی مذاہب کانفرنس ہوئی جس میں تمام مذاہب کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ دنیا والوں کے سامنے خصوصاً ان لوگوں کے سامنے جو یہ کہتے ہیں کہ روس آسمانی مذاہب سے برسرپیکار ہے، یہ ثابت کیا جائے کہ روس مذاہب سے جنگ نہیں کرتا بلکہ وہ آسمانی مذہبوں کی حمایت کرتا ہے جس کی دلیل یہ کانفرنس ہے، اس کانفرنس کے بعد تاشقند میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی، ۱۹۷۳ء میں ازبکستان میں مشہور مسلمان فلسفی فارابی کی یاد میں ایک بڑا جشن منایا گیا، ایک جشن ابن سینا کی یاد میں بھی منایا گیا، قزاقستان میں وسط ایشیا کے مسلمانوں کے دینی ادارہ کی تاسیس کے تیس سال گذر جانے پر بھی ایک جشن کا اہتمام ہوا، امام بخاری کی یاد میں بھی محفل جشن منعقد ہوئی، ان تمام جلسوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں روس کی دعوت پر عالم اسلام کی ممتاز اور مایہ ناز شخصیتیں شریک ہوتی رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان پروگراموں کے ذریعہ روس نے بعض مسلمانوں کا اعتبار بھی حاصل کر لیا تھا کہ اسلام، کمیونسٹ نظام حکومت کے مخالف طاقت نہیں بلکہ موافق ہے اور یہ کہ مسلمان روس میں آزاد و خوشحال رہیں۔ کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبوں سے بھی اس کی شہادت دلائی گئی، روس ان موقعوں پر یہ بھی اعلان کرتا رہا کہ وہ اسلامی آثار و باقیات کی نگہبانی و حفاظت کر کے روس میں اسلام کا نام زندہ کیے ہوئے ہے، بوسیدہ مساجد و مقابر کی مرمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا، چنانچہ امام بخاری اور امام ترمذی کی قبروں کی دیکھ بھال بھی اس نے کرائی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ایک ماہنامہ سائنس اور مذہب کے نام سے شائع ہوتا ہے، اسے

روسی مستشرقین کی اکثریت کا قلمی تعاون حاصل ہے، اس رسالہ کے پہلے شمارہ میں اس اسلامی انسٹیٹیوٹ کے دستور واغراض ومقاصد یہ تحریر کیے گیے ہیں: (۱) مسلمانوں کے درمیان سے روحانی معنویت کو کمزور کرنا، ان کو ان کے عقائد سے دور کرنا اور ایسے افکار ونظریات کو نشو ونما دینا جو ان کے دین میں شک وشبہ پیدا کر دیں (۲) مسلمانوں میں دلکش مادی چیزوں کو خوبصورت اور جاذب اسلوب میں پیش کر کے فساد پیدا کرنا اور ایسی صورت پیدا کر دینا کہ وہ اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہونے کے لئے خود بخود آمادہ ہو جائیں، ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جو اسباب ووسائل اختیار کئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔ اسلامی تعلیمات ونظریات کو قدیم، افسردہ اور بوسیدہ ثابت کیا جائے، اور اس طرح یہ ظاہر کیا جائے کہ سائنس کے دور میں ان نظریات کا زمانہ کے قدم بہ قدم چلنا ممکن نہیں رہا، اشتراکی نظریہ اور اس کے مادی فلسفہ کی تائید میں خود مسلمان علماء وزعماء کے اقوال پیش کیے جائیں کہ تنہا یہی فلسفہ انسان کی خوشحالی کا ضامن ہے اور ان مذہبی اختلافات سے بچا جا سکتا ہے جو انسانیت کے لئے مضر اور مسلمانوں کو پسماندگی کی جانب لے جانے والے ہیں، اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کا احیاء اس طرح کیا جائے کہ اس تہذیب پر فخر کیا جا سکے اور ہر اس شخص کی تائید کی جائے جو اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کے احیاء کا کام کرتا ہو، ایسے مصنفین کی کتابیں خرید کر انھیں تقسیم کے لیے دوسری جگہوں میں بھیج دیا جائے۔

ان مقاصد اور ان وسائل کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی یہ روسی کوششیں کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، ایک روسی صحافی شارلوٹ سائکوسی کا بیان ہے کہ سوویٹ یونین نے سوسائٹی کی تجویز کے مطابق بیرون ملک کے اسلام پر کام کرنے والے غیر مسلم ریسرچ اسکالروں میں مفت تقسیم کرنے کے لیے تو قرآن مجید کے نسخے شائع کیے مگر خود روس کے اندر انھیں تقسیم نہیں کیا گیا، استاذ یوسف فراج لکھتے ہیں:۔

"اسلام کے بارے میں سوویٹ روس کی پالیسی دو رخی ہے، اندرون ملک مکمل دشمنی اور بیرون ملک وقتی دوستی، مثلاً تاشقند کے ایک اسلامی ادارہ نے ایک عمدہ کتاب شائع کی جو روس میں اسلام کی زندۂ جاوید یادگاروں کی رنگین تصویروں سے مزین تھی یہ کتاب بیرون ملک کے ممتاز مسلمانوں میں تقسیم کی گئی، اس میں ایک مسجد اور مشہور مسلمان احمد یاسوی اور باشلیقان محمد کی قبروں کی تصویریں بھی شامل تھیں لیکن روس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ دونوں شاندار عمارتیں اب کمیونسٹوں کے لیے بطور ڈاک بنگلہ استعمال ہو رہی ہیں، روس میں پروپیگنڈہ کے لئے جو لٹریچر شائع کیا جاتا ہے، وہ بجز چند استثنائی صورتوں کے اکثر روس میں ناپید ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید

کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن شایع کیا گیا جو [illegible] کے مسلمان فضلاء کے پاس بھیجا گیا مگر [illegible] خود روس میں [illegible][1]

قرآن [illegible] باوجود تلاش بسیار کے ماسکو میں نہیں مل سکا، قرآن مجید کی طباعت و اشاعت ماسکو کے پروپیگنڈا کا محض ایک جزو تھا، قرآن مجید کے بارے میں روسی مستشرقین کے خیالات کا اندازہ اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

"قرآن اپنی ترکیب کے لحاظ سے ایک پیچیدہ کتاب ہے، جس میں عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے قصے اور دیومالائی کہانیاں بڑی تعداد میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ حضرت یوسف، یونس اور عیسیٰ مسیح وغیرہم کے قصے ہی اس کتاب کا بڑا جزو ہیں۔"

"دارلوکا" یہ ادارہ مطالعات آداب شرقیہ کے شعبہ کے ماتحت ہے، یہاں بھی ایشیا کے قصے، کہانیوں، اساطیری روایات اور کلاسیکی ادب پر داد تحقیق دی جاتی ہے، اور عربی و اسلامی ادب پر ہی خاص طور پر روایت کی نظر مرکوز کی گئی ہے، لینن گراڈ کے مستشرقین اس ادارہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ۱۹۵۶ء کے بعد سے اس ادارہ نے کئی عربی و فارسی کتابوں کو روسی زبان میں منتقل کیا ہے، تونس، الجزائر، مصر، عراق بلکہ تمام عرب ممالک اور ہندوستان، افغانستان اور ایران کے اہل قلم کی نئی کتابوں کو جن کا تعلق افسانہ، کہانی اور شاعری سے ہو، یہ ادارہ روسی زبان میں منتقل کرتا ہے، عرب مصنفوں میں احسان عبد القدوس اور توفیق الحکیم کی کتابیں خاص طور سے روسی زبان میں منتقل ہوئی ہیں، ان کتابوں سے روسی مستشرقین اور استشراق نواز طلبہ نے بڑی رغبت کا اظہار کیا ہے، یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محض ان کتابوں کی علمی و فنی قدر و قیمت ہی ان کی مقبولیت کا سبب نہیں ہوتی، بلکہ ان کتابوں کے صفحات کے دریچوں سے جس معاشرہ کی جھلک نظر آتی ہے، افراد کے جو خط و خال سامنے آتے ہیں اور ذہنوں میں ان قصوں، کہانیوں اور اشعار کا جو ناگزیر اثر ہوتا ہے، وہ ان مستشرقین کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے، اسی پر روسی مطالعہ اور تجزیہ کا دار و مدار ہوتا ہے۔

بیرونی کتابوں کی حوصلہ افزائی | یہ ادارہ بیرون ملک کے مصنفین کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دیتا ہے جن میں اشتراکیت کی روح جلوہ گر ہو، مثال کے طور پر انڈونیشیا کے مارکسی ادیب براموڈیا اننتا تور کی کتابیں شایع ہوتے ہی مکتبوں سے چند مہینوں میں غائب ہو جاتی ہیں، اخباروں اور رسالوں میں ان کتابوں کی مقبولیت پر مضامین لکھے جاتے ہیں، ایک جائزہ کے

---

[1] انتصار الاسلام ص ۴۹۔

مطابق یہ معلوم ہوا کہ روسی دائرہ اثر کے تحت کام کرنے والا ایک ادارہ مکتبوں سے تمام کتابیں خرید لیتا ہے، پھر مؤلف
[نا]شر کے علم کے بغیر جسے مناسب سمجھتا ہے، ان کتابوں کو بطور ہدیہ پیش کرتا ہے، ظاہر ہے کہ مؤلف کو اپنی کتابوں کی اس قدر
[مقبو]لیت پر فخر ہوتا ہے اور ناشر کو مزید اڈیشن شائع کرنے کا حوصلہ ملتا ہے، اس طرح ماسکو کو ادبی و سیاسی فائدہ حاصل ہوتا ہے
[ا]س قسم کی مثالیں دوسری زبانوں کی مطبوعات مثلاً سریانی، کردی، آرمینی، ترکی، عربی وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

مسلم ممالک کے موجودہ اور مسلسل بحران پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر واقعہ اپنے پیش رو واقعہ سے جڑا
[ہو]ا ہے، اور واقعات کے اس تسلسل میں متعلقہ زبانوں کے رسائل اور اخبارات کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے جو قومیت، مقامی تہذیب
[او]ر قدیم تمدن کے تازہ خداؤں کی حمد و ثنا کی دعوت دیتے ہیں، پاکستان میں بنگالی قومیت اور بنگلہ زبان پر حد سے زیادہ فخر
[کیا] جاتا ہے بالآخر بنگلہ تحریک کے زیر اثر بغاوت پھیلی اور ایک ملک دو نیم ہو گیا، عرب دنیا میں ہر عرب ملک اپنے محدود و مختصر
[خ]طۂ زمین کے گن گا رہا ہے اور ایک زبان، ایک ثقافت اور ایک تمدن ہونے کے باوجود ایک مکمل عربی اکائی کا وجود دشوار
[ن]ظر آتا ہے۔

جب مسلمانوں میں کوئی رخنہ پیدا ہو یا کسی ترقی پذیر قوم میں کوئی دراڑ پڑ جائے اور اگر یہ رخنے دینی عقائد و مسائل سے متعلق
[ہو]ں تو روسی مستشرقین کی نگاہ ان موقعوں کو منتخب کر لیتی ہے اور اپنا اثر دکھانے لگتی ہے

۱۹۵۱ء میں روسی مستشرقین کی ایک کانفرنس میں مستشرق سرکوف نے کہا تھا کہ ہماری حکومت کو چاہیے کہ وہ تیسری
[د]نیا یعنی غیر وابستہ ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو زیادہ اہمیت دے۔ ظاہر ہے تیسری دنیا کے اکثر ممالک، اسلامی ہی ہیں، اور
[ا]بھی ہی کہ روس نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے سازگار ماحول اسی تیسری دنیا کا پایا۔

۱۹۶۰ء کی ایک کانفرنس جنوری ۱۹۶۹ء میں اکادمی آف سائنسز کے زیر اہتمام روسی مستشرقین کی ایک اہم کانفرنس ماسکو میں
[من]عقد ہوئی، اس کا موضوع دینی نفسیات تھا، اس میں عالم نفسیات مستشرق بلاٹونوف نے کہا:

"تدین (مذہب پرستی) کے نفسیاتی مظاہر میں کسی بھی مظہر کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ فرد کی ذاتیات باہمی کے
حتمی نتیجہ کی صورت میں نمو پاتا ہے، مذہب کا وجود انسانوں میں خوف کا شعور پرورش کرتا ہے اور بیکاری
یا فرصت واقعیت سے بعید خیالات کی تخلیق کرتی ہے حالانکہ خیالات کو پاک کرنے کی ضرورت ہوتی ہے،
اس شعور سے لاشعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہایت اہم ہے کہ ان عناصر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے تاکہ انسان میں

مذہبی شعور کی موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے "۔

انسان کی طبیعت میں بنیادی مذہبی جذبات کے بارے میں ایک اور ماہر نفسیات مستشرق فوبجیل لکھتے ہیں :۔

" مذہبی اعتقادات کو ایک ضروری حاجت بنانے میں مذہبی احساسات کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے "۔

لینن گراڈ کے ماہر نفسیات بادُڈیجین کا قول ہے کہ :

" مذہب پرستی کا مظہر انتہائی جذباتیت اور ذہنی فساد کے نتیجہ میں صادر ہوتا ہے "۔

کیفنسکے مستشرق بی۔ اے۔ لو بوئنگ کا خیال ہے :

" مذہبی ذہنیت کا انسان دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے، ایک تو عالم طبعی، دوسرا عالم مافوق الطبیعی ایسے انسان کی مددیوں کی جا سکتی ہے کہ اس کے طبیعاتی تصورات کو تقویت دی جائے اور خیالات کی اصلاح کی جائے "

لینن گراڈ کے ایک مستشرق ڈی۔ ڈی اینکیمان کہتے ہیں :

" بنیادی طور پر ایک غیر مذہبی شخص، ماحول کے اثرات سے مذہبی ہو سکتا ہے "۔

آر۔ بوکین کا اعتقاد ہے کہ

" مذہبی احساسات گرچہ شاذ ہیں، لیکن اصل بنیاد یہی ہیں اور انہی پر مذہبی تصورات کی بنیادیں استوار ہیں جو محض وہم اور فریب ہیں، چونکہ دینی احساسات کا مقابلہ احساسات ہی سے کیا جا سکتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس مذہبی شعور کی جگہ دوسرے احساسات کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ بدل دیا جائے "۔

مسلمانوں کے بارے مستشرق جاکونسکی کے مبلغ علم کا اندازہ اس قول سے ہو سکتا ہے :

" اس دنیا میں لوگ ہمیشہ خدا کے وجود کے معتقد رہے، گو اس اعتقاد میں مذہبی روایات و خرافات کا اثر کار فرما رہا، مسلمان بھی انہی لکیروں پر چل رہے ہیں جن کو قرآن نے ابھارا ہے، ان روایات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مہینہ بھر جسے وہ رمضان کہتے ہیں، کھانے پینے سے باز رہتے ہیں "۔

مشہور مستشرق کلیمو فنیش جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے کہتے ہیں :

" کسی بھی مذہب پرست قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکلیہ ختم کر دے اور انسانیت کو گمراہ کرنے والے اپنے بوسیدہ افکار کو یکسر ترک نہ کر دے، مذہب کا خاتمہ ترقی کا

تقاضا ہے اور اس کے لیے یہ کار واجب ہے"۔

"جمال الدین افغانی کی پان اسلامزم تحریک کے بارہ میں کلیموفیتش کا خیال ہے کہ:

"انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پان اسلامزم تحریک کی فکر مشرق میں ظاہر ہوئی، یہ تحریک رجعت پسندانہ سیاسی تحریک تھی"۔

اسلام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"اسلام کی اپنی خاص تاریخ ہے، اس کے عقائد، روایات اور خاص رسم و رواج ہیں، اسلام کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جائے جن میں اسلام کی نشو و نما ہوئی"۔

عرب سے باہر اسلام کے پھیلنے کی وجہ مسلمانوں کے فوجی حملے اور ان کی فتوحات ہیں، ایشیا و افریقہ کے تہذیب یافتہ ممالک کے باشندوں کو غلام بنالیا جانا بھی اسلام کے پھیلنے کی ایک وجہ ہے۔

عربی فوجوں کے لشکر جب شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرتے تو بربادی و پامالی کی جانب جلدی کرتی لوٹ کھسوٹ، مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کو غلام بنالینا اور ان باشندوں کی اکثریت کو برباد کر دینا ان کا شیوہ تھا، مسلمانوں کا خلیفہ جو ایک بڑی حکومت کا صدر ہوتا تھا اس کی ذات میں دینی، فوجی اور شہری اقتدار اعلیٰ بیک وقت جمع ہوجاتا۔

اسلام کے کاہنوں (علماء) کا فرض سب سے پہلے یہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کریں اور اس طرح وہ کھلے مالی استحصال کے لیے وجہ جواز قائم کرتے، جو اس دور میں عام تھا۔

چونکہ خلافت کے عہد میں اسلام، حکومت کا سرکاری مذہب ہوتا تھا، اس لیے حالات خود بخود ان کاہنوں (علماء) کو ممتاز مقام دینے میں معاون ہوتے ہے۔

کلیموفیتش نے اپنی کتاب "اسلام، ماضی اور مستقبل" کو جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے اس مشہور فقرہ پر ختم کیا ہے، جو کہ کتاب "مارکس اینگلز سے" نقل کیا گیا ہے۔

"مذہب ایک وہمی سعادت ہے اور حقیقی سعادت کے حصول کیلئے اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے، مارکس کا قول ہے کہ مذہب ایک تاریخی مظہر ہے جس کی جڑیں طبقاتی معاشرہ میں پیوست ہیں اور بڑھتی ہیں"۔

اس جائزہ کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ روسی استشراق اپنے حقیقی رجحانات و مقاصد میں اسلام کے خلاف علانیہ اور پیہم برسرپیکار ہے۔

اسلام اور مستشرقین

از

پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ

حرف آغاز: اسلام، اسلامی تاریخ اور امت مسلمہ کی رہبری کا سرچشمہ چونکہ قرآن مجید یعنی کلام الٰہی رہا ہے، اس لئے اسلام اور مستشرقین کے مطالعہ میں بھی اگر اسی مرجع و مصدر کی جانب رجوع کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوگا بلفظ مستشرق کی لغوی و نحوی تفسیر و تحلیل کی جا سکتی ہے، اور باب استفعال سے خواص کی تعیین کے بعد استشراق پر جرح و تعدیل بھی ممکن ہے، مگر راقم الحروف اس پورے مسئلہ کو نئے زاویہ سے حل کرنے کی تائید میں ہے، اور وہ قرآنی زاویہ ہے اگر آج بھی قرآن کریم امت مسلمہ کی فکر کا نقطۂ آغاز اور منتہائے پرواز بن جائے جس طرح قرون اولیٰ کے مومنین باصفا اور مخلصین لہ الدین کا تھا تو نہ صرف سیاسی و سماجی، معاشی و ثقافتی میدانوں میں فتح و فیروزمندی کا غلغلہ مچ سکتا ہے، بلکہ علوم و فنون اور سائنس میں بھی شادمانی و کامرانی کا مژدۂ جانفزا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ لا سکتا ہے، بعض احباب کو یہ تجویز عجوبہ معلوم ہو سکتی ہے، اور وہ یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ "قرآن کریم اور مستشرقین کا باہمی ربط کیا ہے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اسی ربط کے انکشاف کے بعد ہمارا سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور آج جو خلفشار علمی دنیا میں مستشرقین نے مچا رکھا ہے ہماں کے شاگردان رشیدان مسلم اعتذاریوں نے برپا کر رکھا ہے، اس کا علاج بھی ممکن ہے،

اگر قرآن کریم اسلامی نظام حیات کا منشور ازلی ہے تو اسے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہئے، قرآن میں امت مسلمہ کی ہدایت کے لئے بہت سے احکام نازل ہوئے مسلم حکمرانوں اور دانشوروں نے جب جب ان احکام سے روگردانی کی خسارہ میں رہے، اور زمانہ اس پر شاہد ہے، وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، امت مسلمہ کی حکومتوں کے لئے جو خارجہ پالیسی قرآن نے متعین فرمائی تھی، وہ ہمیشہ برحق ثابت ہوئی، اور آج تو اظہر من الشمس ہے، علم و دانش، ریسرچ و تحقیق کے میدان میں بھی یہی پالیسی ازلی و ابدی حیثیت رکھتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ان احکام الٰہیہ کو نظر انداز کیا اور اس کی سزا پائی۔ علم و دانش کے میدان میں بھی احکام الٰہیہ کی سرتابی کے نتائج مختلف نہیں ہو سکتے،

اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ امت مسلمہ کو یہ فرمان دیا تھا:۔

(الف) وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى	یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے
حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ	جب تک تم ان کے طریقہ پہ نہ چلنے لگو، صاف
هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ	کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے، ورنہ اگر
بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ	اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی
مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝	خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی
(بقرہ - ۱۲۰)	دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے،
(ب) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں
وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ	کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے
بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ	رفیق ہیں، اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ
(مائدہ ۵ : ۵۱)	ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرق یا مستشرقین کون ہیں، اور ان کی نسل کہاں سے چلی ہے؟ اس کا جواب بھی اظہر من الشمس ہے، مستشرقین روزِ اول سے آج تک یہود و نصاریٰ رہے ہیں، خواہ مشرق میں ہوں، خواہ مغرب میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۱۹۸۳ء تک مستشرقین کی تاریخ محض مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى کی تفسیر و تعبیر رہی ہے۔ بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انہی آیات کی تعبیر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و دانش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزوِ اعظم رہا ہے، مسلم اعتذاری اسکول کے فیاض اراکین خواہ کسی قدر مستشرقین کے کارناموں کی تحسین پیش کریں، ان کی تفسیرات کو دامن عفو میں جگہ دے کر ان کو صدارت کی کرسی پر بٹھا کر انہیں ہار پہنائیں، مگر وہ لَنْ تَرْضٰى کے معنی میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ انہیں حق ہے کہ ہمیں متقشف، متعصب اور غیر منصف قرار دیں، مگر قرآن کے معنی میں تبدیلی کا انہیں حق نہیں، جس کی دو صفتیں ہیں، ازلیت ہے اور ابدیت بھی، قرآن کریم کے دعویٰ کے اثبات کیلئے ہمیں اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی، اس کے بغیر معنی لَنْ تَرْضٰى کی تشریح ممکن نہیں،

اسلام اور مستشرقین: ابتدائیہ | فرمان الٰہی یعنی اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ تا ابد اسلامیہ کا نقطۂ آغاز رہا ہے، اور بے منتہائے پرواز بھی، یہ تحریک حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمد صلعم (۵۷۰ - ۶۳۲ء) پر ختم ہوئی، ایک طرف تکمیل دین (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) کا منشور جاری ہوا، دوسری طرف یہ اعلامیہ بھی جاری کر دیا گیا کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ کے لیے مقبول نہیں، وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۔ (آل عمران ۸۵) نیز ہر مومن کا شعار ہے کہ من حیث مسلم اپنے خالق اور باری کے ہاں ہی واپس ہو وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران ۔ ۱۰۲) اسلام کی یہ داخلی و خارجی پالیسی یہود و نصاریٰ کے لئے ہمیشہ ناقابل قبول رہی، اسی لئے وہ اسلام دشمنی پالیسی کے سربراہ رہے۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے خلفائے راشدین کے دور تک یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمن پالیسیاں اظہر من الشمس رہی ہیں، تاریخ اسلام کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے، ان تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی جائے گی، یہ مقالہ یہود و نصاریٰ کے علمی و فکری، ذہنی و نفسیاتی رجحانات کی ایکسرے رپورٹ ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۲ء تک علی حالہ قائم ہے، نیز ان علمی روایات کی سراغ رسانی مقصود ہے جو یہود و نصاریٰ بالخصوص دیگر مستشرقین کی اسکالرشپ، ریسرچ تالیفات و تصنیفات کا طرۂ امتیاز ہے۔

جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق (۷۰۰ یا ۷۴۹ء) سے جا ملتا ہے، جس نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا اور تحریری مناظرات کا منفیانہ دور شروع کیا اور بزنطینی تاریخی روایات کا مصدر اول تسلیم کر لیا گیا، دمشقی جان نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی، اس نے اسلام کو وثنی (Paganism) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا، چونکہ اسلام کی تمسیخ کے لیے آنحضرت صلعم کی سیرت، شخصیت و دعوت کی تمسیخ ضروری تھی، اس لئے اس نے آپ کی حیات طیبہ اور سوانح پر حملہ شروع کیا، آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپکو دیومالائی قصوں کا ہیرو بنا دیا، داستان سازی کے اس صنعت خانہ میں آنحضرتؐ کے بارے میں طرح طرح کے افسانے اور مضحکہ خیز وحشی خرافات گھڑے گئے، یہی کہانیاں لاطینی یا بزنطینی تاریخ اور بعد میں چرچ کی اسلامی تاریخ کا حصہ بن گئیں، اور مستشرقین کی اسکالرشپ کا مصدر اصلی بھی، جان اور اس کے پیروؤں نے آنحضرتؐ کو بے دین قرار دیا، نیز نبی کاذب کا خطاب دے کر اسلام کو ایک فاسد دین قرار دے دیا، اس نے آنحضرتؐ پر الزام لگایا کہ آپ نے ایک پادری کی معیت

ہیں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کیا، اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی ہے۔

جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرتؐ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق و ریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا، اس نے زینب بنت جحش اور زید بن حارثہؓ کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب عنادین ہیں، ساتھ ہی جان نے تعدد ازدواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب De Haere sibus کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جان کے پیروؤں نے ان ہی بنیادوں پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار کھڑا کر دیا، یہی منفیانہ لٹریچر مغربی اسکالرشپ کے لئے حوالجات کا کام دینے لگے، بلکہ مڈل ایجز (ازمنہ وسطیٰ) سے لے کر مغربی نشأۃ ثانیہ اور نشأۃ ثانیہ سے لے کر انتہائے بیسویں صدی تک مستشرقین کے لئے مصادر کا کام دیتے رہے، اسلام دشمن ادب کے اسی انبار میں ایک نامی گرامی رسالہ قابل ذکر ہے، یہ رسالہ عبدالمسیح بن اسحاق الکندی کی طرف منسوب ہے، چونکہ اس کا اثر مستشرقین پر آج تک موجود ہے، اس لئے مغربی اسکالرز نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، انیسویں صدی میں ولیم اس کا عربی متن پروٹسٹنٹ مشنری اسکول کے استعمال کے لئے ۱۸۸۰ء میں لندن سے شائع کیا گیا، ولیم میور نے اس کا تلخیصی ترجمہ زیر عنوان The Apologe of Al-Kindi لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع کیا، یہ رسالہ مڈل ایجز میں رہنما اصول کا کام دیتا رہا، مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، رسالہ کے مرکزی مضامین میں آنحضرت صلعم کی نبوت کا انکار، قرآن کا مذاق (اسے خبط خیالات کا غیر مربوط مجموعہ قرار دینا) سیرت محمدیہؐ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے، یہ رسالہ یورپ میں مڈل ایجز کی اسکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا، آج بھی رسالہ کا آسیب مستشرقین کے سر پر سوار ہے، یہی رسالہ بیزنطینی مولفین کا مصدر بھی رہا، بغور دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ بیسویں صدی کی اسکالرشپ اپنی بھاری بھرکم تنقیدی اصطلاحات، معروضی اور سائنسی جرح و تعدیل کے زبان دراز دعووں کے باوجود اس رسالہ کی گرفت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکی ہے،

آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین (۷۵۲ء۔ ۸۱۸ء) نے کرانکل لکھی، اس تاریخ The Chranicles of Theosophane, the confessor

کو اناسٹیس Anastasius نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنا لیا اور یہ دونوں کتب مستشرقین کے مصادر (Sources of reference) بن گئے، کرانکل درحقیقت مڈل ایج میں شائع شدہ خرافات کا مجموعہ ہے اس کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے، مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ محمدؐ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، اور ان کو امی کہنا کذب ہے، اس کا بدیہی مقصد یہ تھا کہ اگر محمدؐ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کر دیا جائے تو منطقی طور پر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے یہودی اور عیسائی الہامی کتب اور مصادر کا بغور مطالعہ کیا اور انہی معلومات کی مسخ شدہ صورت کا نام اسلام ہے، یہ کہانی اس لئے وضع کی گئی کہ اسلام کی اصلیت (یہودی الاصل یا عیسائی الاصل — Origins of Islam) کو ثابت کیا جائے، آج مغربی امریکی جامعات (یونیورسٹیوں) کا محبوب ترین موضوع درس اصلیت اسلام ہے جس میں ان ہی قدیم مضامین کی تجدید کی جاتی ہے، اسی کرانکل میں آنحضرتؐ کے جنونی دورے (Epileptic fits) کی داستان بھی گھڑی گئی، اس قسم کے بے شمار افسانے مذکور ہیں، جن کے اعادہ کی گنجائش نہیں،

نویں صدی عیسوی میں شاہ بیسل (۸۶۷ء۔ ۸۸۶ء) کی فرمائش اور حکم پر ایک بزنطینی مؤلف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک کتاب Refutatio Mohammad لکھی، جس میں آپؐ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا، قرآن کو کذب اور خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے اساسی عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا شدید مذاق اڑایا، مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ اصل خدا کی پرستش سے دور ہیں، اسلام چونکہ عیسیٰ ابن مریمؑ کے عقیدہ کا حامی ہے اور عیسیٰ ابن اللہ کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے، اس لئے مؤلف کی نظر میں یہ مذہب اور اس کے پیامبر و داعی سب کاذب ہیں، دسویں اور گیارہویں صدیاں ان ہی افسانوں کی بازگشت ہیں،

مستشرقین کا جو گروہ اسپین کی سرزمین سے اٹھا۔ وہ ان ہی مصادر کا پروردہ تھا، اسلامی علوم و فنون تہذیب و ثقافت کا سکہ تقریباً نو سو سالوں تک اندلس میں قائم رہا، مگر مستشرقین اسپین نے کبھی اس بات کی سعی نہیں کی کہ بزنطینی مصادر کے بجائے براہ راست اسپین کی اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں، انھوں نے کرانکل کے افسانوں پر اپنی اسکالرشپ کی بنیاد ڈالی، دو مثالیں کافی ہیں، قرطبہ کا پوپ (St Eulogius) جو عرصہ دراز تک مسلم کلچر کا مطالعہ کرتا رہا اور مسلم علماء و فضلاء کے ساتھ رہا، اپنی تالیف Liber Apologeticus Martirum کی بنیاد کرانکل اور

لاطینی مسودات و مخطوطات پر رکھی، جس کا اعتراف خود بھی کیا ہے، اس نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف شدت نفرت کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ حیوانی زبان تک استعمال کی ہے، یہ کتاب بھی دیومالائی قصوں سے سجائی گئی، کچھ افسانے تو خود ساختہ ہیں اور کچھ کتاب نکل وغیرہ کے رہین منت ہیں، اسی طرح سان پرڈو پاسکل (San pardo pascal) نامی دوسرے اندلسی اسکالر کی تالیف Sobre Elseton Mahometana کندی کے رسالہ کا چربہ ہے، ان دونوں مؤلفین کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت کا آتش سلگ رہا ہے، ان کے خیال میں اسپین پر اسلامی حکومت عیسائیوں کے لئے عذاب الٰہی تھی، اسلام انکی نظر میں عیسائیت کا بدترین جانی دشمن تھا، اس سلگتی آگ کو چرچ کی تاریخ نے مزید شعلہ بداماں بنا دیا، چونکہ یہی کتب، تالیفات و مصادر، عام قاری، علماء اور اسکالرز کے مراجع تھے، اس لئے نفرت و حسد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی ونسنٹ ڈی بیوس (Vincent de Beauvais) متوفی ۱۲۶۴ء نے ان تمام داستانوں کو اپنی تالیف Specculom Historicale میں جمع کر دیا۔ اور آنحضرتؐ کو دشنی paqah اور ذلیل (Low born) ثابت کیا۔ ان کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کو برقرار رکھا۔

کارزار صلیب اور مستشرقین اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی، اس کا نقطۂ عروج کارزار صلیب تھا، مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لئے صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سالوں تک جاری رہیں، اور پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکری قوت مسلم شرق اوسط پر زندگی کے لئے موت اور آبادی کے لئے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی، ۱۰۹۹ء میں پہلی خون آشام جنگیں ہوئیں، دوسری صلیبی جنگ ۱۱۴۷ء میں لڑی گئی اور تیسری معروف صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین اور شہنشاہ انگلستان رچرڈ کے درمیان ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۳ء تک جاری رہی، چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۲ء اور ۱۲۰۴ء کے درمیان لڑی گئی، اور ۱۲۱۷ء میں پانچویں صلیبی جنگ پیش آئی، چھٹی صلیبی جنگ کا واقعہ ۱۲۲۸ء میں پیش آیا، جب یہ تمام کاوشیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں کی تاراجی کے لئے اہل صلیب نے منگول قوت کے ساتھ عسکری اتحاد ۱۲۴۹ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان قائم کیا، اسی اتحاد کا نتیجہ تھا کہ زوال بغداد کا واقعہ ۱۲۵۸ء میں پیش آیا، آٹھویں صلیبی جنگ ۱۲۷۰ء میں پیش آئی، نویں صلیبی جنگ ۱۳۶۵ء اور آخری دسویں صلیبی جنگ ۱۳۶۶ء میں پیش آئی، ان صلیبی جنگوں اور خون آشامیوں کا تعلق مستشرقین سے بڑا گہرا ہے، کیونکہ پانچ صدیوں میں یورپ کے مفکرین، مؤلفین اور شعراء اسلام کے خلاف مسیحی جذبات کو گدگداتے، اسلام اور مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتے اور ان کے اندر شہادت کا جذبہ پیدا کرکے آمادۂ پیکار ہونے کی

روح پھونکتے رہے، جنگ صلیبی پر اسٹی ون رنسی مان (Steven Runciman) کی تین[3] جلدیں قابل مطالعہ ہیں ہلاکو کی زوجہ خاصہ (Dokuz Khatun) ایک عیسائی خاتون تھی، جو ہلاکو کی افواج کو مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتی رہی بلکہ حملۂ بغداد کے موقع پر وہ خود ہلاکو کے ساتھ معرکہ میں شریک تھی، ہلاکو کا سب سے زیادہ معتمد علیہ کمانڈر (Kutabuga) بھی نسطوری عیسائی تھا، اور بغداد کی مہم میں شریک تھا، جب بغداد برباد ہوا تو اسّی ہزار افراد قتل کئے گئے (ملاحظہ ہو رنسی مان کی جلد دوم صفحات ۲۴۶ تا ۳۰۱، نیز ملاحظہ ہو راقم الحروف کی فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات باب چہارم ص ۱۷۰ تا ۲۸۳) صلیبی جنگوں کی پانچ سو سالہ تاریخ (۱۰۹۹ء، ۱۵۶۴ء) کے دوران یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو لٹریچر پیدا کیا، اس کا سرسری جائزہ لن توضیٔ... کی تشریح کے لئے ضروری ہے۔

تمام صلیبی جنگوں میں یورپ کی مشترکہ عسکری قوت کا دیوالیہ نکل گیا، اسی شکست فاش کی بنا پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت کی نئی لہر دوڑ گئی، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت کے ساتھ میدان مبارزہ میں اُتر آیا شعراء نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کر دی، اس میں دانتے کا نام نامی قابل ذکر ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کی تمسیخ کی نئی تحریکیں چل پڑیں، ۱۱۴۱ء میں پیٹر (peter the venerable) نے چند عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے، رابرٹ (Robert) اور ہرمن (Herman) نامی مؤلفین نے چار عربی کتب کے تراجم کئے، جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، رابرٹ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور پیٹر نے اس کی تردید کی، نیز یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں، پیٹر کی تحریرات اور تالیفات نے یورپ میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی کا دور شروع کیا یہی تالیفات مستشرقین کے معصوم مصادر بنے رہے، اب اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں لاطینی زبان کے علاوہ یورپ کی دیگر زبانیں بھی صف آرا ہو گئیں، نثر کے ساتھ نظم بھی صف آرا ہوئی، فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا، یہاں پر چند امہات الکتب کا ذکر کافی ہوگا۔

والٹر (Walter of Sens) نے لاطینی زبان میں اور الکزنڈر (Alexander Dupont) نے فرانسیسی زبان میں آنحضرت ؐ کے خلاف دل کھول کر لکھا، ایک شعری مرثیہ گیارہ سو بیالیس [۱۱۴۲] اشعار پر مشتمل زیر عنوان

(Avila Muhamitl) لکھا گیا، اور اسے بارہویں صدی کے شاعر ایمبری کو (Embrico of Maint) کے نام سے منسوب کر دیا گیا، اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف نفرت کا امنڈتا ہوا ایک طوفان تھا، ہر قسم کے غلیظ الفاظ استعمال کئے گئے بعضوں نے اسی مرثیہ کو ہائلڈبرٹ (Hildebert of Taurs) نامی شاعر (متوفی ۱۱۳۳ء) کی طرف منسوب کر دیا یہ مرثیہ گویا آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کا شعری مجموعہ تھا، اسی قسم کی شعری سیرت زیر عنوان اوٹیو دی محمد — (Otiode Machomet) ۱۱۰۹ء اشعار پر مشتمل تھی، والٹر نے وسط بارہویں صدی میں لکھی جو پہلے مرثیہ کا نقش ثانی تھا، حروب صلیبیہ پر تالیفات کا ذخیرہ ہوا معروف مؤلف گلبرٹ (Guilbert of Nogent) نے پہلی صلیب پر ایک کتاب زیر عنوان گیستا (Giesta Dei Der Frahcoos) لکھی اور ۱۱۱۲ء سے قبل ہی مکمل کر دیا، اس تالیف میں آنحضرتؐ کی سیرت پر ایک باب ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا چربہ ہے، آنحضرتؐ کے نام تک کو مسخ کر ڈالا گیا ہے، اور محمدؐ کے بجائے ماتھوس (Malhomus) لکھا ہے، اس میں راویوں کی زبانی داستانیں نقل کی گئی ہیں، سب سے دلچسپ افسانہ جو مؤلف نے درج کیا ہے وہ لائق سماعت ہے، مذہب اسلام کے وجود کے سلسلہ میں مؤلف رقمطراز ہے کہ الکزنڈریا (Alexandria) کے پیٹریارک (Patriarch) کا الکشن ہونے والا تھا، اس انتخاب میں حصہ لینے والا امیدوار پادری اپنے انتخاب سے مایوس ہو گیا تو اس نے چرچ کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ تیار کیا، اس مقصد کی خاطر اس نے محمدؐ کے ساتھ سازباز کیا اور عیسائیت میں پھوٹ ڈالنے کے لئے محمدؐ کو زبردست تربیت دی اور آپ کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہؓ سے کروا ڈالی، پادری مذکور نے محمدؐ کی حمایت کی اور ان کی نبوت کا اعلان کیا تاکہ مسیحیت پر ضرب کاری پڑ سکے، چنانچہ محمدؐ اس طرح نبی بن گئے اور مذہب اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی، اس طرح مذہب مسیحیت میں تفرقہ پڑ گیا، جو ہنوز باقی ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ داستان گھڑی گئی کہ محمدؐ خود پادری (cardinal) تھے، اور پوپ (pope) کے مرتبہ پر ترقی پانے کے امیدوار بھی، مگر جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ روم سے بھاگ کر عربیہ گئے اور وہاں نبوت کا دعویٰ کر دیا، ایک روایت کے مطابق یروشلم کے بشاپ سرگیس (Sergius) نے محمدؐ کو نبوت کے دعویٰ پر اکسایا اور ان کے لئے قرآن نامی کتاب لکھی،

بارہویں صدی عیسوی کی خرافات نویسی میں دو ایسے مؤلفین ضرور نظر آتے ہیں جنھوں نے مستشرقین کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنی چاہی، مگر ان کی حیثیت آٹے میں نمک کی تھی، ولیم نامی مولف — (William of Mal

(mesbury) نے اسلام اور وثنیت (paganism) میں فرق پیدا کیا اور لکھا کہ اسلام چونکہ توحید کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے وثنی نہیں ہو سکتا، ۱۱۲۰ء میں اس نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان محمدؐ کو نہ تو خدا مانتے ہیں، نہ ہی ان کی پوجا کرتے ہیں اسکے برخلاف وہ محمدؐ کو محض خدا کا نبی تسلیم کرتے ہیں، دوسرا مؤلف الفونسو (Alfonso) تھا جو اصلاً یہودی تھا، مگر ۱۱۰۶ء میں مصلحتاً عیسائیت قبول کر چکا تھا، عیسائیت اور یہودیت کی باہمی رقابت و تصادم محتاج تعارف نہیں، دو ہزار سالہ رقابت کے باوجود آج وہ قرآن کی تصدیق کے مطابق بعضهم اولياء بعض ہیں، آج یہ حقیقت جس طرح عیاں ہے، شاید تاریخ کے کسی زمانہ میں اس طرح آشکارا نہ تھی، الفونسو نے یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک افہامی ڈائیلاگ لکھا جس میں اسلام کے متعلق بہتر خیالات کا اظہار کیا، شاید مسیحی دنیا کو جو یہودیوں کی جانی دشمن تھی غیرت دلانا مقصود ہو، تیرہویں صدی عیسوی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی، ۱۲۷۱ء میں ولیم (William of Tripoli) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی، تاکہ مشنری اپنی تبلیغ کے لئے استعمال کر سکیں، اس سوانح میں مؤلف خرافات کے علاوہ کچھ پیش نہ کر سکا، اس نے قرآن کریم کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ گھڑا، اس کے خیال میں قرآن مجید کی ترتیب و تالیف آنحضرتؐ کے وصال کے پندرہ سال بعد ہوئی، اس کی تدوین کا کام ایک کمیشن کے حوالہ کیا گیا تھا، چونکہ آنحضرتؐ کی تعلیمات میں کوئی نئی اور مفید بات اراکین کمیشن کو نظر نہیں آئی، لہٰذا انھوں نے خود ہی قرآن نامی کتاب کی تدوین کر ڈالی، یہ تمام خرافات لاطینی روایات کے اجزائے ترکیبی بنتے چلے گئے، مستشرقین نے آنحضرتؐ کی کامیابی کے دو اہم رازوں کا انکشاف کیا، ایک تو جادو تھا اور دوسرا عیاری تھا، مؤلفین نے اصرار کیا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، نبوت کے انکار کے لئے یہ دلیل پیش کی گئی کہ آنحضرتؐ نے خود اپنے آپ کو ایک عام آدمی قرار دیا ہے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا، لہٰذا وہ نبی ہو نہیں سکتے۔

ازمنۂ وسطیٰ سے نشأۃ ثانیہ تک مستشرقین کا سفر

دانتے اٹلی کا معروف شاعر، ازمنۂ وسطیٰ اور نشأۃ ثانیہ کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، دانتے (۱۲۶۵ء سے ۱۳۲۱ء) نہ صرف اٹلی کی نشأۃ کا جد امجد ہے، بلکہ یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے، اس کی معروف و شہرۂ آفاق نظم (The Divine Comedy) کو نشأۃ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم کی تدوین و تاسیس میں دانتے نے آنحضرتؐ کی احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے، میڈرڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاذ پلاسیوس (Placious) نے ۲۵ سالہ ریسرچ اور جانکاہ اور دیدہ ریز محنت کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ دانتے نے اس نظم کی تدوین میں نہ صرف معراج کی احادیث سے استفادہ کیا ہے بلکہ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور

المعری کی رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا، دانتے نے علوم اسلامیہ اپنے اطالوی استاد برونیولو - Brunello) (latini سے جو عربی زبان کا ماہر تھا، حاصل کئے، نظم کی ترتیب میں فتوحات مکیہ کی نقل کی۔ یورپ میں احادیث معراج پر خاصا مواد موجود تھا، پیرس کی لائبریری میں احادیث معراج پر مخطوطات بھی موجود تھے۔ پروفیسر مانارٹ نے اپنی کتاب زیر عنوان "بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں مطالعۂ اسلام" میں ان فرانسیسی مسودات کے نام تک گنائے ہیں، جہاں تک دانتے کی رسائی ممکن تھی، غزالی کی الدرۃ الفاخرۃ اور معراج نامہ تک دانتے کی رسائی تھی، کتاب المعراج کے لاطینی اور فرانسیسی تراجم اس وقت موجود تھے اور دانتے کی پیدائش (۱۲۶۵ء) سے پچاس سال قبل ۱۲۰۶ء میں شائع ہو چکے تھے (professor Cerulli ـــ... کا اصرار ہے کہ نظم کی تدوین میں دانتے نے ان ہی مصادر سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس متشرق شاعر نے جو علوم اسلامیہ میں دخل رکھتا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے پیغمبر اسلامؐ کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اس لئے کہ انھوں نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی، وہ تفریق مذہب کے مجرم بنے۔ شاعر کی دریدہ ذہنی کا یہ عالم ہے کہ آنحضرتؐ کو مثلہ کردہ زیر عذاب دکھلاتا ہے۔ یہ اصحاب قدسیہ مسخ شدہ صورتوں میں زیر عذاب ہیں اور ان کا جرم کبیر یہ تھا کہ انھوں نے مذہب میں افتراق پیدا کیا، انفرنو (inferno) کے کینٹو ۲۸ (canto 28) میں دانتے رقمطراز ہے:

(نقل کفر کفر نہ باشد)

Behold, how mutilated is Mohamet,
in front of me the weeping Ali goes.
His face cleft through from forelock to the chin
And all others that you see about,
Fomenters were of discord and of schism
And that is why they are so gashed asunder.

(دی ڈوائن کمیڈی، ترجمہ ال۔ گرانٹ دہائٹ۔ نیویارک ۱۹۴۸ء۔ لیہ کینٹو ۲۸)

دانتے پر صلیبی جنگوں کی ناکامی و شکست کا ایسا اثر تھا کہ اس نے سارے یورپ کو اپنی شعری قوت سے ہلا دیا، ایک طرف پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ بد سلوکی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف فاتح قدس صلاح الدین ایوبی کو بھی اس نے جہنم میں

منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھایا۔ (ملاحظہ ہو کینٹو ۲۸ Inferno) اسلام دشمنی کے اس مظاہرہ کے بعد دانتے نے صلیبی شہسواروں اور شہدا کو جنت میں فرحاں اور شاداں دکھایا، کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے لیے شہید ہوئے تھے، جنت (pradise) کینٹو ۱۸ میں دانتے ان کی شادمانی کا ذکر کرتے ہوئے نام بہ نام خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Ansinen myeyes saw passing on the cross
William of orange and stout Renoat
Duke godfrey, de Bool illon and Robert Guy serard[1]

ان اشعار اور نظموں نے مغربی جذبات میں آگ لگا دی اور نشاۃ ثانیہ کے دور میں جب رواداری، اخوت اور روشن خیالی کی تحریکات سر اٹھا رہی تھیں، دیگر مذاہب کے ساتھ انصاف کا مطالبہ ہو رہا تھا، مستشرقین کا رویہ اسلام کی جانب علیٰ حالہ قائم رہا، ۱۳۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کا زمانہ نشاۃ ثانیہ کا ابتدائی زمانہ تھا، نشاۃ کے بعد دوسری طاقت ور تحریک جو یورپ میں اٹھی وہ رومانی تحریک (۱۷۵۰ء سے ۱۸۳۰ء) تھی، جس نے یورپ کی روایات کہنہ کو چیلنج کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، نئے خیالات پر مبنی انقلاب انگیز تحریکیں چلتی رہیں، رومی اور یونانی تہذیب سے آزادی حاصل کر کے خود مغربی تہذیب کی داغ بیل ڈالنے کی زبردست تحریک چلی، مذہبی تقشف و تعصب کے خلاف نئے مکاتب فکر وجود میں آئے، مگر اسلام کے متعلق مستشرقین کے رویہ میں بال برابر فرق نہیں آیا، نشاۃ ثانیہ کا پورا دور

---

[1] دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید معلومات کے لئے راقم حروف کی دو کتابیں پیش نظر رہیں:

(الف) فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات (جامعہ کراچی ۱۹۷۶ء) صفحات ۵۶۱ تا ۵۹۱، اس حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ معراج اور یروشلم جزو لاینفک ہیں، یورپ کی نشاۃ ثانیہ پر معراج کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ دانتے نے ابن عربی سے کیا کچھ لیا ہے؟ اس کا نصی تقابل، کامیڈی میں جنت و جہنم وغیرہ کے نقشے ابن عربی سے مستعار لئے گئے، ان کا نقشہ جاتی تقابل، وغیرہ وغیرہ۔

(ب) فکر و فن (جامعہ ڈربن) ۱۹۸۱ء (اردو عربی اور فارسی مقالات کا مجموعہ) ملاحظہ ہوں صفحات از ۵۸ تا ۸۳ زیر عنوان دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات، ص ۹۵ تا ۱۱۲ بھی ملاحظہ ہوں زیر عنوان جرمن شاعر لسنگ کا منظوم ڈرامہ ناتھن دانا

… یجز یعنی ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کے زیر اثر رہا، وہی افسانوی اور دیومالائی تعبیر وتفسیر اسلام کا مقدر تھا، چونکہ نشأۃ ثانیہ کے مصادر لاطینی مصادر (Latin Chronicles) تھے، اس لئے ان سے رستگاری ممکن نہ تھی، ہر روایت پر صلیبی اور بزنطینی چھاپ پڑی ہوئی تھی، یہی مصادر آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے، سوانح محمدؐ میں یہی لکھا گیا کہ آپ الحاد اور بے دینی کے ملزم تھے، آپ نے عیسائیت میں تفریق پیدا کی، آپ کو کاذب قرار دے کر اسلام کو عیسائیت کا ازلی دشمن تصور کیا گیا، خود مسیحی طبقات میں کشمکش شروع ہو گئی رومن کیتھولک چرچ نے پروٹسٹنٹ چرچ پر اسلام دوستی کا الزام لگایا اور انھیں اسلام ہمدرد قرار دیا، دونوں فرقوں کے درمیان یہ مسئلہ موضوع نزاع بن گیا۔ اس پورے عہد میں آنحضرتؐ اور اسلام کے لئے نجس الفاظ استعمال کئے گئے، جو مڈل ایجز کا امتیازی نشان تھا، آنحضرتؐ کے لئے رذیل الفاظ مثلاً کاذب — (Cunning Imposter, Lying deceiver, Blasphemsus emjssary of satan) وغیرہ عام تھے، بعض مستشرقین نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ کو تضییع اوقات قرار دیا، بعض نے لکھا کہ محمدؐ کا نام سنتے ہی خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

سترہویں صدی کے بعد مغربی استعمار کا ظہور اور مصلحت بینی کی تحریک، مستشرقین کے مصادر میں نئے اضافے

سترہویں صدی عیسوی نے مستشرقین کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے، یہ صدی عروج استعمار کی صدی تھی، عالم اسلام عموماً انگریز فرنچ ڈچ وغیرہ کے پنجۂ استبداد میں آچکا تھا، اس طرح مغربی اقوام براہ راست عالم اسلام سے ٹکرائیں، مسلم کلچر اور علوم اسلامیہ سے ان کا سابقہ ہوا، مستشرقین سیاح ان ممالک کا دورہ کرنے لگے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تمام لاطینی اور بزنطینی روایات کی ضد تھی، اس تضاد نے مستشرقین کے سامنے سوالیہ نشانات کھڑے کر دیئے۔ اس اثنا میں استعماری قوتوں نے مثلاً برطانیہ، فرانس اور ڈچ وغیرہ نے سیاسی، معاشی لوٹ مار کے ساتھ اسلامی علوم وفنون، مسودات ومخطوطات کے نادر نسخوں کی بھی لوٹ ... کی، اور تمام عالم اسلام سے اسلامی گنجہائے گراں مایہ اور صدیوں کی علمی وفکری کاوشات کے خزینے اٹھا کر لندن اور پیرس اور ہالینڈ لے گئے اور اپنے کتب خانوں اور میوزیم کی زینت بنا ڈالی، آج بھی ان نوادرات کی نمائش یورپ میں ہو رہی ہے، جہاں ناظرین فخر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

پیرس میں سنہ ۱۹۷۳ء کی بین الاقوامی مخطوطات کی نمائش دیکھ کر راقم سطور انگشت بدنداں تھا۔

مستشرقین اب نئے مصادر اسلامی سے دوچار ہوئے، عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی تحریک چلی کیونکہ ان کے

بغیر ان مصادر تک رسائی ممکن نہ تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس اور لندن میں عربی کے شعبے کھلے، سنہ ۱۶۴۹ء میں قرآن کریم کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شائع ہوا، سترہویں صدی کی سب سے طاقتور تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی، جس میں غیر عیسائی مذاہب و عقائد کے منصفانہ مطالعہ پر زور دیا گیا، ان تحریکات کے دباؤ میں بعض مستشرقین نے بھی اسلام پر نظر ثانی یا از سر نو تجربہ کی دعوت دی اور اسلام کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی، اب مستشرقین کے سامنے تین اہم مصادر تھے (۱) ازمنۂ وسطیٰ (مڈل ایجز) کا روایتی مواد (تاریخ و سوانح وغیرہ) نیز لاطینی مصادر (کرانکل وغیرہ) (۲) اسلامی اور عربی مصادر جو استعمار کے ذریعہ دستیاب ہوئے، اور (۳) مغربی سیاحوں کے سفرنامے جو انھوں نے مسلم ممالک کے دورے اور سیاحت کے بعد مرتب کئے۔

مستشرقین کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی یہ دیکھ کر حیرت زدہ اور ششدر رہ جاتا ہے کہ ان تمام تحریکات اور نئے مصادر کا کوئی اثر مستشرقین کے رویہ پر نہیں پڑا، نہ ہی ازمنۂ وسطیٰ کی روایات سے گلو خلاصی ہو سکی، وہ اب بھی لاطینی روایات کے اسیر رہے، یورپ میں اب مزید انتشار پھیلا، کیونکہ سیاحوں کے سفرنامے لاطینی اسکالرشپ کے خرافاتی نقشے سے بالکل مختلف تھے، آنحضرتؐ کے بارے میں ایک دوسرا اور مضحکہ خیز افسانہ گھڑا گیا، یعنی محمدؐ ہرقل کی فوج میں باغی تاجروں کے قائد تھے، اور عربوں کے باغی گروہ کے کیپٹن بھی تھے، مگر ایران پر حملے کے وقت محمدؐ نے ہرقل کی فوج کا ساتھ دیا انگریز فلسفی راجر بیکن (R. Bacon) نے آنحضرتؐ کو من حیث جادوگر پیش کیا، اور اپنے مقالات بالخصوص (Of Boldness) میں آنحضرتؐ کے بارے میں خرافات وضع کیں

زمانہ سفر کرتا گیا، وقت آگے بڑھتا گیا، مگر مستشرقین رجعت قہقری کرتے رہے، یورپ میں جدید دور کا آغاز ہوا، "جاگو ہوا سویرا" کی اذان دی گئی، مارٹن لیوتھر کی قیادت میں چرچ اور خرافاتی رسم و رواج کے خلاف ایک قیامت برپا ہوئی، خیال تھا کہ جدید یورپ میں اصلاحات کا مفکر اعظم مارٹن لیوتھر اسلام کے بارہ میں شاید نرم رویہ اختیار کرے، اسکے بالکل برعکس اسنے اسلام اور مسلمانوں کو مسیح کا دشمن گردانتے ہوئے اسلام کو ترکوں کا مذہب قرار دیدیا، چونکہ مارٹن کا سارا حملہ چرچ اور پوپ کے خلاف تھا اسی لئے اُسنے آنحضرتؐ کو پوپ سے بھی زیادہ بدتر قرار دیا، اُسنے مطالبہ کیا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس امر کی تحقیق کی جائے کہ آیا اسلام اور محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کے آخری دشمن تھے، تاکہ یہ مسئلہ حتمی طور پر طے ہوجائے کہ اسلام اور محمدؐ ہی مارٹن کے خیال میں مذہب عیسائیت کی بربادی کے ذمہ دار تھے، لیوتھر نے آنحضرتؐ کو گاگ اور میگاگ کا خطاب دیا۔

چونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ کا پروردہ تھا، (یہ روایت ہنوز جاری ہے) اسی لئے مذہبی نفرت ان کی

اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز تھا، اس کو اسکالرشپ کہنا اسکالرشپ کی توہین ہے، یہ سارا ریسرچ مواد درحقیقت مشنری پروپیگنڈا تھا، چند مثالیں کافی ہیں، سترہویں صدی کے نامی مؤلف بڈول (Bedwell) متوفی ۱۶۳۲ء نے اپنی تالیف "محمد کاذب" (Mahammed in Impostures) میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت گستاخی کی، جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہے (Genebard) نامی کیتھولک مولف کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمدؐ نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان مثلاً لاطینی، عبرانی، اور یونانی میں نہیں کی، بلکہ ایک وحشی زبان میں کی، چونکہ محمدؐ خود (العیاذ باللہ) جانور (Beast) تھے اس لئے قرآن کو بھی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا،

اینڈری (Andre du Ryer) نے چند عربی کتب کے انگریزی ترجمے کئے، ساتھ ہی ۱۶۴۹ء میں قرآن کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ بھی پیش کیا۔

جدید تحریکات کے زیر اثر سترہویں صدی میں اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا، مگر لاطینی خرافاتی روایات سے گلو خلاصی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بعض روشن خیال اسکالرس نے وقتاً فوقتاً روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی، ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک (Edward Peacoke) متوفی ۱۶۹۱ء تھا، موصوف نے چند عربی کتب کے ترجمے کئے، نیز حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس نے سیرت محمدؐ پر نظر ثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا، اٹلی کا پادری مستشرق (Abb Louismaracci) نے قرآن کا لاطینی ترجمہ کیا اور اپنی تالیف پروڈمس (prodo musad Refutationem) میں اسلام پر زبردست حملے کئے، آنحضرتؐ کو واضح الفاظ میں نبی کاذب قرار دیا، سترہویں صدی میں الیکزنڈر راس (Alexander Ross) نے اپنی تالیف پنڈیلیا (Pandeblia) ۱۶۵۳ء میں جو تقابلِ ادیان پر لکھی گئی تھی، لاطینی خرافات سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اسلام کے بارے میں پہلی بار چند اچھے کلمات استعمال کئے، انگریزی چپلین یا پادری (Chaplain) مسمی ایڈلین - (Lancelot Addison) نے حیات و موت محمد (Life and death of Mahammad) کے زیر عنوان اپنی کتاب ۱۶۷۸ء میں لندن سے شائع کی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف مؤلف کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی کتاب قرآن کو شائع نہیں کیا، ۱۶۹۷ء میں ناردیچ کا ڈین (Dean of — Norwich) مسمی ہمفری (Humphery pridoax) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی اور آپ کو نبی کاذب —

(Imposter) قرار دیا، مؤلف نے اعتراف کیا کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے مؤلف رکاڈو (Ricado) سے بے حد متاثر ہوا تھا، ہمفری کی کتاب تقریباً ایک صدی تک مستشرقین کے لیے حوالہ کا کام دیتی رہی، کتاب کا مرکزی مضمون اسلام کو فراڈ ثابت کرنا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سیاسی مفادات کے زیر اثر نام نہاد اسلامی لٹریچر کی افزائش

سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں اٹھارہویں صدی میں اسلام پر زیادہ لٹریچر تیار ہوا، اسمیں سیاسی مفادات کا دخل زیادہ تھا، مگر مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی بھی لاطینی روایات اور ازمنۂ وسطیٰ کے عقائد کی زد میں رہی، سب سے پہلا ڈچ مستشرق ایچ۔ ریلان (H.Relan) نے آنحضرتؐ کی جانب رویہ میں تبدیلی پیدا کی، اپنی معروف تالیف "مذہب محمدؐ" (Dereli-gione Mahommedica) ۱۷۰۵ء میں اس نے ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات سے رہائی کی کوشش کی، اور اسلام اور محمدؐ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، غالباً یہ پہلا مستشرق تھا جس نے رواداری (Tolerance) کا مطالبہ کیا، اس نے پہلی بار یہ تحریک چلائی کہ مشرق کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا، یہ مطالبہ یقینی طور پر پہلا مطالبہ تھا کہ اہل مغرب کے بجائے خود مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب و کلچر کی تفسیر و تشریح پیش کریں اور اہل مغرب کے افہام و تفہیم کا ذریعہ بنیں، مذہب کو اس کے مخالفین ہمیشہ مسخ کرتے ہیں، مؤلف نے واضح الفاظ میں تحریر کیا کہ یورپ میں اسلام کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس قدر تمسخر کا شکار رہا ہو، مؤلف نے اس امر پر بھی اصرار کیا کہ اصل اسلام کو کماحقہ سمجھنے میں خود عیسائیت کا فائدہ ہے، اور یہ افہام و تفہیم دوستی کے ذریعہ ممکن ہے دشمنی کے ذریعہ نہیں عیسائیوں کا غرور اسی طرح کم ہو سکتا ہے اور ان کے اندر شکر ایزدی کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے عیسائیت جیسے مذہب کی نعمت سے انہیں سرفراز کیا، ریلان درحقیقت پہلا مستشرق تھا جس نے اسلام کے ساتھ تاریخی انصاف کا مطالبہ کیا اس تحریک کا اثر دیرپا نہ تھا، بعض مؤلفین ان خیالات سے متاثر ضرور ہوئے، مثلاً کاؤنٹ ڈی (Count de Boulainvilliers) نے اپنی کتاب (Vie de Mahomet) (لندن ۱۷۳۰ء) میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا، لیکن اس کے خلاف حملے شروع ہو گئے، اور اس پر مسیحیت کی تخفیف کا الزام بھی لگایا گیا، ناقدین کے مطابق یہ کتاب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی، جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی، مؤلف نے اسلام کو پہلی بار ایک عقلی مذہب (Rational Religion) قرار دیا اور آنحضرتؐ

کو نبی تسلیم کرلیا، یہ اقدام تمام سابقہ مسیحی اور یہودی مستشرقین کے معاندہ مزاج کے خلاف تھا، اس میں نہ صرف قرون وسطیٰ کی عجز اور لاطینی خرافات کی نفی تھی، بلکہ نشأۃ ثانیہ جیسے روشن خیال دور کی اسلام دشمنی کے خلاف بھی پہلی صدائے بازگشت تھی، یہ رویہ مستشرقین کے لئے ناقابل قبول تھا، اس کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت پڑی، تاکہ یہ خیالات یورپ میں جڑ نہ پکڑ سکیں، چنانچہ یہی ہوا، جارج سیل (George Sale) اور راڈول (J.M. Rodwell) کے معاندانہ جذبہ میں شدت پیدا ہوئی، سیل نے بڑی چستی کے ساتھ آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False Religion) قرار دے دیا، جین گگنیر (Jean Gagnier) نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کتاب ۱۷۲۳ء میں اور دوسری ۱۷۴۸ء میں منظر عام پر آئی، ان دونوں کتب کا مقصد بولین ویر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ویر کی تالیف کے مقابلہ میں ایک نئی تالیف محمد (Vie de Mahomet) پیش کی جو اسٹرڈم سے ۱۷۳۲ء میں شائع ہوئی کتاب کے مقدمہ میں بدبخت مؤلف نے آنحضرتؐ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن بلکہ خدا کا بھی دشمن قرار دیا، چونکہ روشن خیالی، انصاف اور حق پسندی کا دباؤ یورپ پر بڑھتا جارہا تھا، اس لئے بعض مؤلفین نے ان سے متاثر ہوکر چند کلمات خیر عرض کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اس ضمن میں سیوری (Savary) نامی مؤلف کا ذکر کافی ہے، موصوف نے ۱۷۸۳ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا، اور اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرتؐ کے لئے نرم الفاظ استعمال کئے، اور آپ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا، مگر ازمنۂ وسطیٰ کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کراسکا، اسی لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کردیا، اور قدیم نظریہ کی تائید کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدۂ توحید کے مسئلہ کو لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی۔

ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کا نام محتاج تعارف نہیں، زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر موصوف نے آفاقی شہرت حاصل کی اور انگریزی تاریخ نویسی کے معمار بن گئے، ۱۷۸۸ء میں کتاب مذکور کے پچاس ویں باب میں اسلام اور محمدؐ کے بارے میں نہایت دلسوز رائے کا اظہار کیا، رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرتؐ کو نبی کاذب (Impostor) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرتؐ آخری ایام میں شہوت اور لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی (lust and ambition) سے مغلوب ہوگئے، محمدؐ ظلم، فراڈ اور ناانصافی کا مجسمہ تھے، اسلام ان ہی

ذرائع سے پھیلا، یہ تھی اس روشن خیال مؤلف اور مورخ کی رائے جس نے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ نویسی پر ربع صدی صرف کی، اور نہ صرف روما بلکہ اس سے متعلق تمام معلوم اقوام کے احوال لکھے جن کا تعلق رومی حکومت سے رہا تھا، اس میں اسلام اور مسلمان سب سے نمایاں تھے، کیونکہ اہل روما سے ان کا ٹکراؤ ہوا تھا،

اٹھارہویں صدی کی دوسری عظیم شخصیت جو انقلاب فرانس کے بانیوں میں سے ایک ہے، وہ والٹیر (Valtaire) کی شخصیت ہے (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء) والٹیر فرانسیسی آسمانِ فکر کا تابندہ ستارہ اور مصلحین کا پیامبر تھا، اٹھارہویں صدی پر اس کے افکار کی کارفرمائی بلکہ سلطانی قائم رہی، مگر والٹیر جیسا مفکر اسلام اور محمدؐ کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہ سکا، اس نے اپنے ڈرامہ (play) موسوم بہ (Le Fanall sou ou Mahomet Lapropheis) میں جو ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آئی، اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا، اس نے یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمدؐ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا، یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب (Impostor) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب (False barborous relision) سے موسوم کیا، اس نے اپنے ڈرامہ کو پوپ (Pope Benedict xtv) کے نام منسوب کر دیا، اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، مسلمانوں کو درندہ، جنگلی اور وحشی قوم (Barbarous Seci) کا خطاب عطا کیا، اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا، مجموعہ مقالات (Essai sur les Moeurs et L' desnation) میں اس نے آنحضرتؐ کو برطانوی سیاستداں کرام ول (Cromwall) کی عیاری سے تشبیہ دی ہے، والٹیر نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ کی پوری دعوت میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی، اسکے سوا کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر مستشرقین پر پڑا، ان میں ایک ڈیڈراٹ (Diderot) ہے، جس نے آنحضرتؐ کی گھناؤنی سیرت پیش کی اور آپ کو عقلیت (Reason) کا دشمن اور عورتوں کا دلدادہ ثابت کیا، فرانسیسی مستشرق رینان (۱۸۲۳ء تا ۱۸۹۲ء) (Rennan) نے بھی اسلام کو عقل کا لاعلاج دشمن (Incurable Enemy reason) قرار دیا،

اٹھارہویں صدی کی مختصر روح فرسا روداد کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب قاری انیسویں صدی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ خلف اپنے سلف سے اور متبعین اپنے پیش رووں سے زیادہ متقشف، متعصب

اور زہر آلود ثابت ہوئے، ان پر نہ تحریک تجدید کا کوئی اثر پڑا، نہ ہی یورپ کی روشن خیالی، رواداری اور انصاف کی تحریکات نے ان کے دل کو موم بنایا، شدت نفرت میں وہ اپنے بزرگوں اور متقدمین سے بھی بازی لے گئے،

انیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور ان کے اسکالرشپ کی نیرنگیاں

انیسویں صدی کی جھولی میں جو میراث آئی وہ بھی اسلام دشمنی کی میراث تھی، سابقہ رویہ میں مطلق تبدیلی نہیں آئی، ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۲ء تک تقریباً نصف صدی میں متعدد کتب اسلام اور محمدؐ پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر ڈیوڈ پرائس کی تالیف (Chrono-logical Retrospect of Mahommedan) تھی، جو ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۱ء تک شائع ہوئی۔ مؤلف نے اپنی تاریخ میں آنحضرتؐ کے عہد سے لیکر ہند کے مغل شہنشاہ اکبر تک کے تاریخی وقائع درج کئے ہیں، دوسری اہم قابل ذکر تالیف ایڈورڈ افام (Edward Upham) کی ہے، موصوف نے ترکی کی تاریخ (History of ottomon Empire) لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی، مؤلف نے آنحضرتؐ کو حسب معمول نبیٔ کاذب کے لقب سے یاد کیا۔

یہ پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ صلیب کے بعد سے نثری ادب کے دوش بدوش نظم نے بھی اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پیش رو شعراء کا ذکر مختصراً گذر چکا ہے، یہاں پر انیسویں صدی کے شہرۂ آفاق جرمن شاعر گیٹےؒ کا ذکر لازمی ہے، گیٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر، اور انیسویں صدی کے نصف اول پر گہرے اثرات چھوڑے، شاعر نے بظاہر دراسات اسلامیہ اور شرق اوسط سے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، مگر درحقیقت اسلام کے خلاف اپنے پیش رو قائدین کے نقش قدم سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا بلکہ آگے نکل گیا، ۱۷۷۳ء میں اس نے آنحضرتؐ پر ایک نظم ترانہ محمد Mahomet (Gesang) لکھی، آنحضرتؐ کو ایک چشمہ سے تعبیر کیا، اور وحدۃ الوجود کا مدرس بتاتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کئے، گیٹےؒ کے اسی بیان پر کارلائل کو اس قدر حیرت ہوئی کہ اس نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا کہ اگر واقعتاً گیٹےؒ کا تبصرہ صحیح ہے تو ہم سارے عیسائی دراصل مسلمان ہیں، گیٹےؒ نے ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۹ء تک اپنی نامکمل نظم لکھی، شاعر نے ثابت کیا کہ محمدؐ ابتدا میں مخلص تھے، بعد میں وہ مادیت اور بوالہوسی کے شکار ہوگئے اور ان کا روحانی حصہ ضائع ہوگیا، یہ وہی کلاسیکی مضمون ہے جو آج تک مستشرقین کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز ہے، شاعر نے یہ بھی ثابت کیا کہ محمدؐ کی شخصیت مبہم اور غیر واضح تھی، ایکٹ اوّل میں اس نے آنحضرتؐ کو چاند تاروں کا پجاری ثابت کیا ہے، بعد میں ایک خدا کی عبادت کی طرف مائل ہوتے ہوئے دکھایا ہے، ایکٹ دوم کا مرکزی موضوع اسلام کی اشاعت اور پیروان اسلام کی کثرت ہے، ایکٹ سوم میں شاعر بتاتا ہے

کہ محمدؐ نے فتح مکہ کے بعد کس طرح اپنی گرفت کو مستحکم کیا اور مذہب اسلام کو پھیلایا، آنحضرتؐ نے اسی مقصد کے لیے قوت اور عیاری دونوں کو استعمال کیا، ایک پنچ میں شاعر آنحضرتؐ کو مادیت سے مغلوب ہو کر ایک سلطنت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے دکھاتا ہے، ان نظریات سے گوئٹے کے عقائد ونفسیات جھلک کر سامنے آجاتے ہیں، یورپ کی فضا ہمیشہ مکدر رہی، دو ایک مستشرقین نے اگر انصاف کا مطالبہ کیا تو وہ ملعون ومعتوب ہوئے، انیسویں صدی کی ممتاز شخصیات میں کارلائل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، درحقیقت پوری صدی اس کی ذات میں ڈوب گئی، ۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء تک کارلائل کا نام نامی زندہ رہا، انیسویں صدی کے نصف اول تک فضا مسموم رہی، مگر نصف ثانی میں پھر اسلام اور محمدؐ کی جانب رواداری اور انصاف پسندی کے مطالبے شروع ہوئے، اس تحریک کے قائدین میں کارلائل کا نام قابل ذکر ہے، یہ مطالبہ بربنائے اخلاص نہیں تھا، بلکہ یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، سیاسی تبدیلیاں تھیں، اور شبانہ روز جدت پسند اور سائنسی ترقیات کے چیلنج کی کشمکش تھی، تعصب اور تقشف کے خلاف عام لہر یورپ میں بڑھتی جا رہی تھی اسی فضا (Iiberal Climats) نے بعض مستشرقین کو اسلام کے خلاف سابقہ موقف پر نظر ثانی کے لیے مجبور کیا، تبدیلی کا یہ سہرا یورپ کی سب سے طاقتور رومانی تحریک (Romantic Movement) کے سر ہے، جس نے یورپ کے تمام فرسودہ نظام حیات، کلاسیکی عقائد، تقشف اور تعصب کو ایسا چیلنج کیا کہ سارا یورپ ہل گیا، سیاست ہو یا ثقافت، ادب وکلچر ہو یا دین ومذہب ہر میدان پر اس کا زوردار اثر پڑا، یہ تحریک دراصل کلاسیکی نظریات کے خلاف ایک بغاوت تھی، اس سے ٹکرانا مشکل تھا، کارلائل ان ہی تحریکات سے متاثر ہوا، اس تحریک کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ نوخیز نسل کے اندر اپنے پیش رو متقدمین کو چیلنج کرنے کی جرأت مندانہ ہمت پیدا کر دی، تمام رسم ورواج کا قلع قمع ہو گیا، نقلی اور بناوٹی زندگی کے بجائے اصلی اور فطری زندگی گذارنے کی دعوت دی گئی، اس نے مشرق کے حقیقی مطالعہ اور افہام وتفہیم کا دروازہ بھی کھول دیا، اسی کا اثر تھا کہ کارلائل نے اپنے دیگر موضوعات کے ساتھ اسلام کو بھی موضوع بحث بنا لیا، یہ امر واضح رہے کہ انیسویں صدی تک مستشرقین کلیۃً اسلامی اسکالر نہیں تھے، جیسا کہ آج ہیں" بلکہ ہر فن مولیٰ تھے، اسلام کا مطالعہ اسی کا ایک حصہ تھا،

کارلائل اسلامی رویہ میں ہرگز مخلص نہیں تھا، اس نے اسلام اور محمدؐ کو موضوع بحث محض اس لئے بنایا کہ اب اسلام قبول کرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا، اس نے واضح الفاظ میں لکھا کہ محمدؐ پر بحث اس لئے نہیں کی ہے کہ وہ ممتاز نبی

تھے، بلکہ محض اس لئے کہ اب ارتداد کا مطلق خطرہ نہیں تھا، اب کوئی عیسائی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھا اب ہم آزادی کے ساتھ اسلام کے بارے میں لکھ سکتے ہیں، اور محمدؐ کے بارے میں چند اچھے کلمات بھی استعمال کرسکتے ہیں، یعنی اسلام اور محمدؐ کی مخالفت اس لئے کی جارہی تھی کہ اسلام کی عالمی قبولیت کو چیلنج کیا جائے، ملاحظہ ہو (The Herd as Prophet نیویارک ۱۹۵۲ء ص ۱۱)

اس مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ایک بیدار مغز ناقد کارلائل کی تالیف کے تحسینی کلمات کو جو اس نے اسلام یا محمدؐ کے بارے میں لکھا تھا پڑھتا ہے، تو اس کے قلب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا،

کارلائل کی تعریفیں ملاحظہ ہوں، وہ رقمطراز ہے کہ اسلام اور محمدؐ کے خلاف افترار اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے وہ ہم عیسائیوں کے لئے باعث شرم ہے، یہ باتیں کہ محمدؐ کاذب تھے، یا مذہب اسلام مجموعۂ خرافات ہے، اس روشن دور میں قابل قبول نہیں، محمدؐ کی تعلیم ۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کا مشعل ہے، بارہ صدیوں سے انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں، کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں، (ص ۱۲) اس نے بطور خلاصہ لکھا کہ محمدؐ نے عربیہ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاکھڑا کیا، کارلائل پر سیل کے ترجمۂ قرآن کے واضح اثرات موجود ہیں، اس کے خیالات اور تحریر پر بھی اس کی چھاپ ہے، بلکہ یہی ترجمہ اس کے لکچر کی اساس ہے، ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرتؐ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نے آپ کو تاریخ کی عظیم شخصیت، ایک بڑا امیر اور قائد (Great human person) کی حیثیت سے ابھارنے کی سعی کی، مگر پھر اسی کارلائل کے دیگر کلمات کو پڑھ کر قاری ششدر رہ جاتا ہے، جب وہ آنحضرتؐ کو جنگلی اور بادیہ نشین (Son of The Wilderness) غیر مہذب حیوانی اور وحشیانہ آغوش فطرت کا پروردہ (Uncultured Semi-barbarous son of nature) قرار دیتا ہے، یہ بیانات تاریخی حقائق کے خلاف ہیں، آنحضرتؐ قریش مکہ میں اٹھے جو معصر تہذیب، دولت وتجارت کی قیادت کررہے تھے، نہ تو وہ بادیہ نشین تھے، نہ ہی صحرائی جانور تھے، کارلائل کی نیت جو بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریریں ڈیاول دور کے تعصب اور خرافات سے پہلی بار بغاوت تھی، یہ تبدیلی رواداری اور انصاف پسندی کی جانب ایک نیا قدم ضرور تھا، مگر کارلائل کی ان تحریرات کو دیگر مستشرقین نے بے حد ناپسند کیا، اور کارلائل کی تالیفات پر رومانی تعبیرات کا ٹھپہ لگادیا، قدیم

روش سے سرتابی کو معصیت تصور کیا،

انیسویں صدی کے وسط تک آنحضرتؐ کی سوانح کے عربی مصادر مثلاً ابن ہشام کی سیرت واقدی اور ابن سعد اور طبری کی تالیفات یورپ [illegible] عام طور پر رائج نہیں ہوئی تھیں یہ سب مسودات اور مخطوطات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے، لیکن رینکے نے [illegible] کی تحریک چلائی اور مصادر کی سراغ رسانی کا زور ہوا تو تاریخ نہمی میں نیا انقلاب برپا ہوا، عربی مصادر کے مطالعہ پر زور دیا گیا، جرمنی کے مستشرقین نے مسلم شرق اوسط، برعظیم ہند و پاک کے دورے شروع کیے، کتب خانوں کی تاریکیوں میں پڑے محتاج توجہ مسودات و مخطوطات کو روشنی میں لایا، کریمر (Alfred van Kremer) نے دمشق سے واقدی کی کتاب المغازی کا نسخہ برآمد کیا، ہندوستان سے تین قیمتی مخطوطات برآمد ہوئے، اسپرنگر اور دیگر مستشرقین نے دہلی سے آنحضرتؐ کی سوانح پر تین قیمتی مخطوطات حاصل کیے [illegible] کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی مخطوطات برآمد ہونے شروع ہوئے۔ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے قدیم ترین نسخے ہندوستان سے بھی برآمد ہوئے، اواخر انیسویں صدی تک یہ مخطوطات یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہونے لگے، اور اس طرح مستشرقین یورپ کی رسائی اصل مصادر تک عام ہوگئی، ان ہی بنیادوں پر نئی کتب کا ظہور ہونے لگا۔

گسٹاو ویل (Gustav Weil) نے آنحضرتؐ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب (Mohammad - der prophet sein Leben und seine Lehre) لکھی، مولف کے پاس ابن ہشام کا قدیم نسخہ موجود تھا، اس کے مطالعہ اور تحلیل و تفرید میں اس نے تاریخی تنقید کے [illegible] اصول اور قواعد و ضوابط اختیار کیے، اور آنحضرتؐ کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ اختیار کیا، مگر قدیم مکتب فکر سے آزاد نہ ہو سکا، اس کا موقف قدیم اور فرسودہ خیالات کے مدار سے ہٹ نہیں سکا۔ اس کے خیال میں چونکہ محمدؐ قدیم اور جدید بائبل کا خوبصورت درس توحید اس قوم میں واپس لائے جو ایمان کھو چکی تھی، اس لیے محمدؐ کو غیر مسلم بھی خدا کا پیامبر تسلیم کر سکتے ہیں، بالفاظ دیگر اسلام کو عیسائی الاصل اور یہودی الاصل ثابت کیا، بہرحال ان تحریرات نے رواداری کی فضا کو تقویت بخشی، اور دیگر مستشرقین پر بھی اس کا اثر پڑا۔

فرانسیسی مستشرق کاسن دی پرسی دل (Caussin de perceval) نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ عرب

(Essai sur li Histoire Arabes) لکھی اور اپنے رویہ میں نرمی کا مظاہرہ کیا۔ ولیم میور اپنی زہر افشانیوں کے لئے معروف ہے، مگر وہ نئی تحریکات سے متاثر ہو کر کم از کم اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کا دعویٰ ضرور کرنے لگا۔ فرانسیسی مستشرق نے بڑی ہمت سے کام لیکر لکھا کہ محمدؐ کو محض کاذب کہنا ناانصافی ہے، وہ اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو جہالت سے نکالکر روشنی کی طرف لائے،

"تاریخی مصادر کی نقدی تنقیدات اور تنقید تاریخ کے نئے اصول وضوابط نے مزید نت نئے مسائل لاکھڑے کئے" سب سے پہلا مسئلہ آنحضرتؐ کی سیرت کے اصلی مصادر کی ثقاہت کے متعلق اٹھایا گیا۔ مستشرقین تحقیقات کے بعد پھر اپنے اصلی موقف پر پہنچ گئے، یعنی اسلام اور محمدؐ کی دعوت یہودی اور عیسائی روایات کی مسخ شدہ صورت ہے، اس میں کوئی نیا پن نہ تھا، یہ تو وہی قرون اولیٰ زمانہ کی بازگشت تھی، البتہ اس پورے موضوع کا ایک نیا علمی نام وضع کیا گیا جسے ہم اسلام کی اصلیت کے نام سے جانتے ہیں، اور جو آج مغربی جامعات کا محبوب موضوع درس و تدریس ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

۱۸۳۳ء میں ابراہام گیگر (Abraham Geiger) نے ایک مقالہ زیر عنوان محمدؐ کے یہودی مصادر و آخذ (What did Muhammad take from judaism) پیش کیا اور بہت سے نئے نظریات کی داغ بیل ڈال دی، اب ایک نئی تحریک چل پڑی کہ یہودیت و نصرانیت اور اسلام کے درمیان قریبی ربط و ضبط ثابت کیا جائے، تاکہ محمدؐ کے یہودی و عیسائی آخذ کو حتمی طور پر ثابت کر دیا جائے، یہاں پر اس کتاب کا ذکر کر دینا قاری کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ۱۹۳۳ء میں نیویارک سے زیر عنوان "اسلام کی یہودی بنیاد" (The Jewish Foundation of Islam) شائع ہوئی، اور اس کے مؤلف ییل یونیورسٹی (Yale University) میں سامی زبانوں کے پروفیسر چارلز کٹلر ٹوری (Charles Cutler Torrey) ہیں اس پر مقدمہ معروف مستشرق روزنتھال (Franz Rosenthal) کا ہے جس نے ابن خلدون کا ترجمہ کیا ہے، اور اسلامی تاریخ نویسی پر مبسوط کتاب بھی لکھی ہے، اس کتاب پر مبسوط نقد راقم الحروف کی کتاب پیغمبر اسلام اور مستشرقین میں ملاحظہ ہو، اسلام کی اصلیت اب مستشرقین کا محبوب موضوع بن گیا ہے اور تین معروف مستشرقین ولیم میور، اسپرنگر اور نالدیکی، اس تحریک کے سرخیل بن گئے، اسپرنگر نے آنحضرتؐ کے مطالعہ کا ایک نیا اسکول قائم کیا جسے بائیلوجی یا علم الامراض یا اسباب امراض کا اسکول

کہا جاتا ہے ہے، یہ واضح رہے کہ میور کی طرح اسپرنگر بھی برطانوی سول سروس کا ملازم تھا، اس نے اسلام اور آنحضرتؐ پر متعدد کتب لکھیں، ان میں حسب ذیل تین تالیفات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حیات محمدؐ اصل مصادر کی روشنی میں الہ آباد ۱۸۴۸ء

1- Life of Muhammad from origind Sources, Allahabad. 1848

۲۔ حیات اور تعلیم محمدؐ (۳ جلدیں، مطبوعہ برلن از ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء

2- Des leban- and Lehre des Muhammes (Berlin 1861. 1865 3 vols)

۳ محمدؐ اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ، (ہیمبرگ ۱۸۸۹ء)

3- Mohammad under Koran: Eine psychologische Studies (Hamburg 1889)

ان تالیفات نے جنہیں اسلام کی اصلیت کے اثبات پر پوری قوت صرف کی گئی تھی، نقد و نظر کا ایک نیا طوفان برپا کر دیا، اسپرنگر چونکہ خود ڈاکٹر تھا، اس لئے اس نے چودہ سو سالوں کے بعد بھی اسلام اور محمدؐ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا، طبی معائنہ کی رپورٹ میں اس نے ثابت کیا کہ آنحضرتؐ اعصابی مریض، یا مصروع (Epile — ptic) تھے

طبی معائنہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آنحضرتؐ کا نروس سٹم چونکہ خراب تھا، اس لئے ہذیان اور بدحواسی کے دورہ میں انہوں نے قرآن کی تصنیف گڑھ لی، نیز اسلام نامی مذہب کو گڑھ لیا۔ اب اسلام ہذیان الاصل قرار پایا' محمدؐ پر چونکہ ہذیان یا امتلاس اور اعصابی اضطراب جو محض ہنسنے اور رونے کا سبب بنتا ہے Hysteric — frenzy کے دورے پڑتے تھے، اس لئے اسلام وجود میں آ گیا۔

اسلام کی اصلیت کی یہ بالکل نئی اور اچھوتی تعبیر سامنے آئی، اب آنحضرتؐ کی سیرت و سوانح کو طبی نقطۂ نظر سے (patho logical Approach) دیکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، اور اسے مستقل ایک اسکول کی حیثیت دیدی گئی، فرائڈ اور دیگر علمائے نفسیات کے دور میں یہ اسکول جنسی آسیب کی زد میں آ گیا، جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

سر ولیم میور برطانوی سول سروس کا ملازم اور اسکوٹش اصلیت کا متقشف کیتھولک عیسائی تھا، اس نے چار جلدوں میں حیات محمدؐ لکھی، جو لندن سے ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان شائع ہوئی، یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ

برطانیہ اسلام کے ازلی دشمنوں میں رہا ہے، صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رچارڈ کی شکست کا غم ہنوز باقی ہے، اس کا انتقام برطانیہ نے تاسیس اسرائیل کے بعد لے لیا ہے، مگر نفرت کی آگ سلگ رہی ہے، ولیم میور کی حیات محمد (Life of Muhammad) دراصل دریدہ دہنی اور ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا مجموعہ ہے، خالص کیتھولک نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، مگر انگریزی خوان عوام کے لئے مستند مصدر رہی ہے، ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کو نبی کاذب کا خطاب دیکر یورپ کے ان مستشرقین کے خلاف سخت برہمی کا مظاہرہ کیا، جو اسلام اور محمد ﷺ کے ساتھ رواداری کا مطالبہ کر رہے تھے، اور اعلان کر دیا کہ اہل یورپ اپنے روایتی موقف میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، ولیم میور کی شدت نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام اور محمد ﷺ اور قرآن کریم کو تہذیب، آزادی اور حق کا بدترین دشمن قرار دیا، ایسا دشمن جو آج تک انسانی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا، اس کا عقیدہ تھا کہ محمد ﷺ (نعوذ باللہ) شیطان کے آلۂ کار تھے، ولیم میور یہ تمنا اور آرزو لیکر دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن اہل اسلام توبہ کریں گے اور عیسائیت قبول کر کے جہل و ضلالت سے نجات حاصل کریں گے۔

تاریخی تنقید کا مکتب فکر جو نالدیکے نے قائم کیا تھا، اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے، نالدیکے، اسپرنگر اور ولیم میور سے زیادہ دریدہ دہن ثابت ہوا، اس نے تاریخ قرآن (Geschichte des Qorans) لکھی جو برلن سے ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی، آج تک یعنی سو سالوں سے مستشرقین کی رہنمائی کے لئے یہ تاریخ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس نے اپنے پیش رو کے طبی معائنہ سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ محمد ﷺ ہذیان کے مریض نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی اور جذباتی دورے (Fits of emotions) کے مریض تھے، اسی دورے کے زیر اثر انکو اس بات کا یقین آ گیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، اسی میں انہوں نے قرآن کی تالیف کر ڈالی، ساتھ ہی اسلام نامی مذہب کی داغ بیل ڈالی دی، یہ تمام تالیفات ان کے مرکزی خیالات اور عمومی مضامین ازمنۂ وسطیٰ یا لاطینی خرافات سے کسی طرح مختلف نہ تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور اسلام کا تحلیلی اور سائنسی مطالعہ

انیسویں صدی کے اواخر سے مستشرقین، نقد اسلام کے نئے مکاتب فکر کی تاسیس میں لگے ہوئے تھے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے، جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، قاری کا مذاق بدلتا گیا، سیاسی اور معاشی احوال میں تغیر آتا گیا، مستشرقین کی اسکالرشپ چولے بدلتی گئی، پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی جانے لگی۔

جیسے جیسے یورپ کی فضا بدلی مستشرقین کی اسکالرشپ بھی بدلی، ایک زمانہ تھا جب آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کی امکانی سعی کی گئی، جنس و جنگ کے اتہامات لگائے گئے، اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے یا یہودیت و مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینے کا چرچا تھا وغیرہ وغیرہ، جب یورپ پر نفسیات کا بھوت سوار ہوا تو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ میں نفسیاتی اور طبی قوانین نافذ کئے گئے، اور سعی کی گئی کہ نفسیاتی امکانیات اور جوہر و توانائی (Peyochdrnatea) کی روشنی میں آنحضرتؐ اور اسلام کا معائنہ کیا جائے، چنانچہ محمدؐ کے مطالعہ میں علم الامراض کے اصول نافذ کئے گئے، اسٹریا کا معروف عالم نفسیات فرائڈ (Freud) متوفی ۱۹۳۹ء حیات انسانی پر جنس کا آسیب بنکر سوار ہوگیا، اواخر انیسویں[29] صدی سے آنحضرتؐ کی سیرت و سوانح کے مصادر پر نقد اور جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع ہوا، اب نقد کا سارا زور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرۃ النبی کی تحلیل و تفرید پر تھا، قرآن کریم کو غیر مرتب اور مبہم توہمات کا مجموعہ قرار دیا گیا، غیر مہذب اور غیر متوازن ہونے کی وجہ سے غیر ثقہ بھی سمجھا گیا، یعنی قرآن، اسلام اور محمدؐ کی تحریکات کی واضح صورت پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن پر سنگین حملوں کے بعد نزلہ احادیث نبویہ پر اترا، چونکہ احادیث قرآن کے بعد مصدر ثانی کی حیثیت رکھتی تھیں، لہذا ان کو منہدم کرنا مستشرقین کا اولین فریضہ تھا، اب احادیث کے کذب و افترا کے افسانے گھڑے گئے، یوں تو نالدیکے نقدِ حدیث کے اسکول کا سرخیل تھا، لیکن انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل گولڈزیہر (Innac Goldzher) نے ڈالی اور اپنی تالیف دراساتِ محمدیہ (Mohammadenisch - studien) میں اپنے نظریہ کی اساس ڈالی، اس نے اس سوال کے ذریعہ کہ کیا سیرت نگاری کے لئے احادیث پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ سب سے عظیم فتنہ کھڑا کیا، بیسویں صدی میں مستشرقین کی اسکالرشپ زمانہ کے ساتھ دو حصوں میں بٹ گئی، ایک تو انکار حدیث کے مکتب فکر سے منسلک رہی اور دوسری نئی ابھرتی ہوئی اشتراکی یا کمیونسٹ تحریک کی گود میں پرورش پانے لگی، اول الذکر مکتب فکر نے غیر یقینی کردار کے احادیث کی فہرست مرتب کی اور ان احادیث کو خوب اچھالا جو مذہبی اور سیاسی فرقوں نے ذاتی مفادات کے پیش نظر گڑھی تھیں، یا جو خاص قبائل، افراد اور احکام کی تائید میں تھے، گولڈزیہر نے ان تمام احادیث کو مسترد کر دیا، انکار حدیث کے بعد گولڈزیہر نے سیرت کے مصادر پر جراحی شروع کر دی، اور ان کو بھی اس نے بیانیہ احادیث (Narrative Ahadith) کے زمرہ میں ڈال دیا، اسلامی اسناد کے پورے سلسلہ کو چیلنج کرنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ یہ مصادر ثقاہت کی ضمانت نہیں دے سکتے، یعنی ہدم و

اسلام کی آخری کڑی تھی، نامی مستشرق ہنری لامینس (Henri Lammens) نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا، اور یہ ثابت کرنے کی پیہم کوشش کی کہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلامی روایات کا سارا ڈھانچہ جس پر آنحضرتؐ کی سوانح لکھی گئی ہے، بے بنیاد اور غیر ثقہ ہے، اور محمدؐ کی مدنی زندگی، کی ساری روایات داستان و افسانہ سے زیادہ درجہ نہیں رکھتیں، اسلام اس کی نظر میں ایک تاریخی المیہ تھا، سب سے دلچسپ تحقیق مؤلف نے یہ پیش کی کہ آنحضرتؐ کثیر خوری کے مریض تھے، اور یہی ان کی موت کا سبب بنا۔ کثیر خوری کی وجہ سے ان پر لقوہ مرگی کے دورے پڑے، ان ہی حملوں میں وہ جاں بحق ہو گئے، ہنری ابتدا بیسویں صدی میں شام اور لبنان کا مشنری مبلغ تھا، اسلام اور آنحضرتؐ کے خلاف شدت نفرت کے اظہار میں اس نے کوئی کمی نہیں کی، البتہ اس پر ریسرچ، تحقیق اور اسکالرشپ کا غلاف ڈال دیا، اور اس کا نام سائنسی نہج تنقید رکھدیا۔ اس نے آنحضرتؐ پر وحشیانہ حملے کئے، اور آپکے اخلاص کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

یورپ میں اچانک معاشی تحریکات کا طوفان اٹھا جس کے نتیجہ میں کمیونسٹ یا سوشلسٹ تحریک نے سر اٹھایا، اور یورپ کی پوری سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، چونکہ سامعین، قارئین اور زمانہ کا مزاج بدل گیا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر نقد و نظر کا اسلوب بھی بدل گیا، کارلائل کا نظریہ یعنی دنیا کی تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح حیات کا نام ہے، بدل گیا، اس کی جگہ کارل مارکس کے نظریہ نے لے لی، جس میں انسان معاشیات کا خلیہ ہے، یعنی تاریخ معاشی اور سماجی حرکات کا نام ہے، چونکہ یورپ کا سارا تنقیدی نظام کمیونزم کے پنجۂ استبداد میں آگیا تھا، اس لئے اسلامی اسکالرشپ اور مستشرقین دونوں اس کی گرفت میں جکڑ گئے۔

جرمنی کے یہودی اور عیسائی مستشرقین دراسات اسلامیہ میں پیش پیش رہے، ہیوبرٹ گریمی (Hubert G...) نامی جرمن مستشرق نے جو عربی کا اسکالر تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر دو کتابیں لکھیں جو ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۵ء طبع ہوئیں، اس نے مذہبی حیثیت کو بالکل ہی ختم کر ڈالا، اور پہلی بار واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے عربیہ کا جو اسلام ظاہر ہوا، سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ اسلام اور محمدؐ کو کماحقہ سمجھنے کیلئے لازمی ہے۔ اشتراکی تحریک کے ظہور سے پہلے ہی اس مکتب فکر کی بنیاد ڈالدی اور اعلان کر دیا کہ اسلام کا ظہور و عروج محض ایک سوشلسٹ (Socialistic phenomenon) کا ایسا مظہر تھا جس پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، یعنی اسلام کی پوری تاریخ مکہ کی طبقاتی جنگ کے اندر پوشیدہ ہے ایک طرف سرمایہ اور محنت کی کشمکش تھی، مالدار تجار کا ظالمانہ رویہ، ملکی معیشت اور بینک پر اس کا تسلط، قبائلی قانون

کا جابرانہ سلوک تھا، دوسری طرف محنت کشوں، مزدوروں اور حرفت پیشہ لوگوں کی روز افزوں عدم قناعت، نامرادی، مایوسی تھی، انہی دونوں کے تصادم کا عکس یا مظہر اسلام ہے، یعنی اسلام امراء کے خلاف غرباء کی بغاوت تھی، اسطرح اسلام ایک دینی و مذہبی تحریک نہیں بلکہ ایک سوشل سسٹم تھا، اور محمدؐ نبی کے بجائے ایک سماجی مصلح تھے۔

معاشی، سماجی تحریک میں مارگولیتھ (۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء) نے سیاسی مصالحہ لگا کر ایک نیا مثلث تیار کیا، مارکسی تحریکات کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور آزادی کی تحریک بھی یورپ میں چل رہی تھی، لہٰذا اس نے اسمیں سیاسی پہلو کا اضافہ بھی کر دیا، یعنی محمدؐ کی دینی و مذہبی شخصیت کو ختم کر کے اس نے آپؐ کو محض ایک سیاسی مبصر اور قائد کی حیثیت دیدی، مارگولیتھ کے خیال میں محمدؐ نے نبوت کا دعویٰ محض اس لئے کیا کہ وہ عرب پر بآسانی حکومت کر سکیں، اسی لئے وہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، آپؐ ہیرو بن گئے اور ایک مملکت کے بانی مبانی بھی، اس کی تالیف محمدؐ اور عروج اسلام ان ہی خیالات کا مجموعہ ہے، مقدمہ میں وہ رقمطراز ہے کہ دین محمدؐ کی عظیم شخصیت کو تسلیم کرتا ہوں، باہم متصادم قبائلی عربیہ کو ایک متحدہ ریاست میں منتقل کر دینا تھا، مشکلات کا حل، ۲۳ سالہ کی جد و جہد کے بعد ایک سلطنت کا قائم کرنا، پھر تخت و تاج کا مالک بن جانا، اور ایسی وسیع سلطنت کی داغ بیل ڈالنا جس کی لپیٹ میں سارا عالم آجائے وغیرہ وغیرہ صفات غیر معمولی صلاحیت کی متقاضی تھیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں مارگولیتھ کا مقالہ بھی انہی خطوط کا عکس ہے، مگر مولف کی دریدہ دہنی حسب معمول قائم رہی۔ اپنے تحسینی کلمات کو اس نے کافور بنا دیا۔ جب آنحضرتؐ کو قذاق اور ڈاکو قرار دیا۔ مؤلف نے لکھا کہ مدینہ میں آنحضرتؐ کا کردار محض لٹیرے قذاق کا تھا، مدینہ کی معیشت کا مدار ہی تجارتی قافلوں کی لوٹ مار پر تھا، مالِ غنیمت کی تقسیم میں بھی ناانصافی عام تھی، مؤلف آنحضرتؐ کی صداقت و اخلاص دونوں کا منکر ہے، وہ آپ کو محض ایک قانون داں، جج یا ڈپلومیٹ سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہے۔

اٹلی کا معروف مستشرق پرنس لیون کیتانی (۱۸۶۹ء سے ۱۹۳۵ء) (Princeleone Caetani) بھی اسی مکتب فکر سے منسلک تھا، اس نے بھی آنحضرتؐ کی دینی شخصیت کو ختم کرنے کی سعی کی اور عربیہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کے مطالعہ پر زور دیا جس کا مظہر اسلام تھا، اس نے اپنی تالیف اسلام میں ۶۳۲ء کے بعد سے واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بحث کی ہے۔

اپنی تالیف دراسات شرقیہ (Studi Distorig Orrientale) کی تیسری جلد میں اس نے آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی قائد (Statesman) کی حیثیت دی ہے، اور ظہور اسلام کو عرب کے سیاسی معاشی اور سماجی انحطاط کا مظہر ثابت کیا ہے، اس کے خیال میں آنحضرتؐ کو محض معاشی بدحالی کی بنا پر ہجرت پر مجبور ہوئے اور تحریک ہجرت کے قائد بن گئے، بطور خلاصہ مؤلف آنحضرتؐ کو عظیم موقع پرست سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں، اس لئے اس امر کا خاص اہتمام کیا ہے کہ محمدؐ کی دینی شخصیت کسی طرح ابھرنے نہ پائے، بلکہ اس سے ہر ممکن صرف نظر کیا جائے۔

مصادر اسلامیہ اور استشراق کی تنقید کے پہلو بہ پہلو ایک نئی تحریک نے جنم لیا، یعنی مذہبیات یا دینیات کے مطالعہ میں علم النفس کے اصول کا استعمال اور مذہبی شخصیات کا خالص نفسیاتی مطالعہ، اس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ محض ایک اعصابی ڈھانچہ بنکر رہ گئے، دینی شخصیت کی کشش جاتی رہی، دینی تحریکات کے عوامل و محرکات کا امتحان نفسیاتی اصول کے مطابق لیا جانے لگا، دراسات اسلامیہ میں جب علم النفس (سائکالوجی) اور اسکے اصول و مبادی کا نفاذ کیا گیا تو اسلام کی سیاسی و معاشی تعبیرات بھی کمزور پڑنے لگیں، چونکہ اسکالرشپ چونکہ اسکالر اور قاری دونوں کے منہ کا مزہ پھیکا پڑنے لگا، اس لئے کسی نئے اچار یا مصالحہ کی ضرورت پڑی، وہ مصالحہ علم النفس کا مصالحہ تھا، اسی نظریہ کو پورے اہتمام کے ساتھ آگے بڑھایا گیا، اور ظہور اسلام کے نفسیاتی عوامل و محرکات کے مطالعہ پر زور دیا گیا، اس تحریک کے سرخیل ڈین فرانز بھل (Dane frantz Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) تھے، ان دونوں نے مذہب اور علم النفس یا مذہبی نفسیات (Religious psychology) کی تازہ ترین معلومات کو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ پر منطبق کر دیا، آنحضرتؐ کی نفسیاتی تکوینیات (psycho mechanism) کا گہرا مطالعہ کیا گیا، بہل نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں متعدد مقالات لکھے۔

آنحضرتؐ کے اعصابی نظام (نروس سسٹم) کے گہرے مطالعہ کے بعد بھل اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر معمولی اعصابی (Abnormal Nervous System) سسٹم کی وجہ سے محمدؐ اپنے آپ کو دھوکہ دینے یا مغالطہ میں پڑ جانے کے عادی ہو گئے تھے، اسی دھوکہ کا نتیجہ تھا کہ محمدؐ نے یقین کر لیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمدؐ ایک نہایت مشکوک اور مبہم (Ambiguous) کردار کے فرد تھے جس کا سمجھنا مشکل ہے، وہ (Epileptic) نہیں بلکہ (Hysterical) تھے، وہ حقیقی مفکر تو ہر گز نہیں تھے،

ٹور اینڈرے نے اسلام اور محمدؐ پر متعدد کتب لکھیں، اور سیرت و سوانح محمدؐ کے مطالعہ میں اس نے ا[illegible]
گہرے علم النفس کے تجارب کا استعمال کیا، بلکہ آنحضرتؐ کی شخصیت کی نفسیاتی تحلیل و تفرید میں اس نے تحلیلی نفسیات کی
تکنیک (The Technique of Analytical psychology [illegible]) استعمال کی، مؤلف کی نظر میں آنحضرتؐ
کی عظمت کی صرف ایک دلیل ہے [illegible] کہ انھوں نے قدیم ادیان اور سابقہ مذاہب یعنی یہود و نصاریٰ کے مذاہب کا
خلاصہ یا معجون مرکب ([illegible]) پیش کیا، چونکہ عرب کا سماجی اور معاشی نظام فرسودہ ہو چکا تھا، اس لئے
روایت سے بغاوت ایک فطری ردعمل تھا، محمدؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا، مؤلف اس بات پر مصر ہے کہ آنحضرتؐ اپنے
اس عقیدہ میں بالکل راسخ تھے کہ واقعی ان پر وحی نازل ہوتی ہے، عروج اسلام کا راز مؤلف کی رائے میں، محمدؐ کی ذہنی
قوت اور صلاحیت میں مضمر تھا، مؤلف موصوف اس [illegible] پہنچے جو ان کے پیش رو کا محبوب موقف تھا، یعنی محمدؐ نے اسلام
کی بنیاد عیسائیوں کے زیر اثر ڈالی، بیسویں صدی کے متقدمین تو یہی لوگ اساطین مستشرقین تصور کئے جاتے ہیں،
ان کی پوری فہرست میں دو ایک ہی اسکالر ایسے ہیں جنھوں نے خواہ مصلحتاً ہی سہی اسلام یا محمدؐ کا دفاع کیا ہو یا نرم
الفاظ استعمال کئے ہوں، ان میں چند اسماء مثلاً کارلائل اور باسورتھ اسمتھ قابل ذکر ہیں، آخر الذکر نے اپنی کتاب
محمد اور محمڈنزم میں آنحضرتؐ کے خلاف یورپ کے وحشیانہ حملوں کی [illegible] کرتے ہوئے آپؐ کو ایک عظیم فرد تسلیم کیا ہے
الفونسی (Alphonse Etienne Dinet) نے ۱۹۲۰ء میں پیرس سے اپنی کتاب اللہ کے نبی محمدؐ کی حیات
(The Life of Muhammad: The prophet of Allah) شائع کی اور رواداری کا ثبوت دیا
لاطینی خرافاتی مصادر کے بجائے ابن ہشام کی سیرت رسول اللہؐ اور ابن سعد کی طبقات وغیرہ کا مطالعہ کیا، اسی طرح
جے سی ارچر (J.C. Archer) نے [illegible] مکتب فکر کے اسباب الامراض (pathological school
کی مذمت) کی اور [illegible] آپ کو ایک صوفی (Mystic) کی حیثیت سے تسلیم کیا، غرض مدافعت میں اسی قسم کی دو
چار مثالیں مشکل سے ملتی ہیں، مگر ان میں سے کسی نے آنحضرتؐ کو دل سے نبی تسلیم نہیں کیا۔

جوں جوں ہم بیسویں صدی کے اختتام یا آخری ربع کی طرف بڑھتے ہیں مستشرقین کے رویہ میں نرمی کے بجائے
شدت محسوس کرتے جاتے ہیں، بالتفصیل مستشرقین کا ذکر ممکن نہیں، البتہ ممتاز اساطین مستشرقین کا طائرانہ جائزہ یورپ
کے اسی ذہن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے، جو اسلام کے خلاف صدیوں سے برسر پیکار رہے، اور ان [illegible]

الیھود ولا النصاری کی نوع بہ نوع اور گوناگوں تفسیر کے مواد فراہم کرتا جارہا ہے۔

ارنلڈ جے ٹوائن بی (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۵ء) (Arnold J. Toynbee) کا نام علمی حلقوں کیلئے محتاج تعارف نہیں ہے، معروف مورخ نے دنیا کے ۲۶ سے زیادہ مذاہب اور کلچر کا مطالعہ کرنے اور چالیس سالہ دیدہ ریزی کے بعد مطالعہ تاریخ کی بارہ جلدیں تحریر کیں جن میں تین ملین حروف استعمال کئے گئے ہیں مولف کے خیال میں تہذیب نوی خاتمہ کے موڑ پر پہنچ چکی ہے، اب صرف وقت کا انتظار ہے، (شاید تیسری عالمی جنگ، وقت محدود ہو) اشتراکی نقطہ نظر کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہوئے مؤلف رقمطراز ہے کہ انسان صرف معاش یا سماج کا خلیہ نہیں اس کی روحانی زندگی بھی ہے۔ اخلاقی اقدار بھی ہیں، جس کے بغیر انسان اور کیڑے میں فرق نہیں، اشتراکی مکتب فکر میں انسان محض سماج کا خلیہ (Cell) تصور کیا جاتا ہے، اور اخلاقی اقدار کو روحانیات نہیں معاشیات متعین کرتی ہیں، مؤلف نے ثابت کیا کہ اخلاقی اقدار کا خاتمہ خدا کے ساتھ رابطہ کے اختتام کے مترادف ہے، مورخ موصوف نے اپنا نظریہ چیلنج اور ریسپانس (Challenge and Response) پیش کیا یعنی جس درجہ کا چیلنج ہو اسی درجہ کا ریسپانس ہونا چاہئے، اس تناسب کی برہمی ہی زوال امت کا سبب بن جاتی ہے،

یورپ میں تاریخ کا جدلیاتی نظریہ پیش کیا گیا یعنی ارتقا اور نمو کے لئے باہمی کشمکش ضروری ہے، اس نظریہ نے توافق للبقاء کے بجائے تنازع للبقاء کی روح پھونک ڈالی اور رقابت وحسد اور بین الاقوامی جنگوں کی بنیاد ڈال دی اور بے رحمی اور سنگ دلی کا جذبہ پیدا کیا جس کی زندہ مثالیں دو عالمی جنگیں ہیں، ٹوائن بی دراسات اسلامیہ اور سیرت کے مطالعہ میں فلسفیانہ اصول و قواعد کو کام میں لایا، مولف کے تجزیہ کے مطابق آنحضرت ؐ کا رول مکہ میں روحانی رہا، مگر مدینہ میں انھوں نے روح کے ساتھ مادہ کی ایسی آمیزش کی کہ خود سکولر حاکم بن بیٹھے، اور ریاست اور مذہب کو مدغم کردیا۔ مورخ نے آنحضرت ؐ کی سیاسی شخصیت کو ابھارنے کی سعی کی ہے، جو اس کی نظر میں اعلیٰ درجہ (First Rate) کی تھی محمد ؐ کے بارے میں مولف نے مڈیول دور کے نظریہ دغاباز یا ٹھگ اور کذاب و مکّار (Impostor) کا انکار کیا ہے، مگر بطور تلخیص جو بات آنحضرت ؐ کے بارے میں مولف مذکور نے پیش کی، اس سے اپنے تمام تحسینی کلمات پر پانی پھیر دیا، مولف رقمطراز ہے کہ محمد ؐ کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا، کہ وہ ملک عرب کے سیزر بن گئے، (جلد سوم آکسفورڈ ۱۹۳۵ء ص ۴۶۶) کہاں مکار سیزر اور کہاں پیغمبر اسلام؟ دونوں میں کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ اس عظیم ذہن کی تلخیص ہے جس نے عالمی مذاہب و

ثقافت کا مطالعہ کیا، اور جس کی شخصیت میں بیسویں صدی کے ۳ ربع حصے ڈوب گئے، اور جو عالمی حواںجات کا مسند بن گیا۔

دوسرا عظیم نامی گرامی مستشرق بلاشیر ہے اسنے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا، یعنی آنحضرت کی سوانح پر بحث کرنے کے بجائے، مصادر سیرت پر بحث شروع کی اور اعلان کردیا کہ ان مصادر کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے جب تک جدید تنقید کے تکنیکی اصول ان پر منطبق نہ کر دیئے جائیں، یہ سازش واضح طور پر اس بات کی دعوت تھی کہ مصادر اسلامیہ جدید تنقیدی اصولوں پر نہ پورے اتریں گے، نہ ان کی ثقاہت ثابت ہوسکے گی! یہ وہی پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی گئی۔

نصف آخر بیسویں صدی کی اہم خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہمہ وقت وہمہ دم —— (whole time) اسلامی اسکالر وجود میں آگئے، یعنی ان مستشرقین نے دراسات اسلامیہ ہی کو اپنا پیشہ (career) بنالیا، اس لئے کہ مغربی جامعات، انسٹی ٹیوٹ اور مراکز بحث وتحقیق میں اسلام کے مختلف سیاسی معاشی دینی و ثقافتی پہلوؤں پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور بڑے بڑے مطابع اور اشاعتی ادارے ـ (publishers) ہر چھ ماہ کے وقفہ پر مستشرقین کے دروازوں پر دستک دینے لگے کہ آیا اسلام کے متعلق (یعنی اسلام کے خلاف) کوئی تازہ ترین تالیف برائے اشاعت تیار ہے؟

(یہ بات راقم الحروف سے ایک عالمی شہرت کے نامی گرامی مستشرق نے امریکہ میں بتائی، اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس روش سے نالاں ہیں، آخر ہر چھ ماہ پر کوئی مؤلف کیسے کتاب لکھ سکتا ہے،) یعنی تجارتی اور کمرشیل مفادات نے بھی اسلام کے خلاف لٹریچر کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا، عالمی مواصلات بڑھتے گئے، دنیا سمٹتی گئی، اور سارا عالم جام جمشید کی طرح کوزہ میں بند ہوگیا، دوسری عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام استعمار کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوا، آزادی کی نئی لہر پھیلی، ایک طرف اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لئے مفکرین اسلام مثلاً سید قطب، مولانا مودودی، اور مولانا سید ابوالحسن ندوی وغیرہ کے قلم کے تیر برسنے لگے، دوسری طرف مستشرقین کو اپنی بساط کے الٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔

مغربی جامعات میں یہود و نصاریٰ کا بڑا گروہ جو درحقیقت مشنری اسکولوں کا پروردہ اور تربیت یافتہ تھا، قلم لیکر اسکالرشپ کے میدان میں کود پڑا، فرداً فرداً سب کا ذکر محال ہے، البتہ ممتاز نمایندوں کا سرسری جائزہ

نفسیات غرب اور استشراق کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہے تاکہ لن ترضیٰ کی تفسیر مزید واضح ہو سکے

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ہملٹن گب کو سمجھا جاتا ہے، جن کا نام مسلمان اور مستشرق دونوں بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ان کی لیاقت، وسعت نظر مطالعہ اور طرز نگارش میں کوئی دوسرا سبقت نہیں لے جا سکا، موصوف امریکی جامعہ میں راقم الحروف کے شعبہ کے صدر الصدور بھی تھے، وہ حالت سے پہلے آکسفورڈ میں سنہ ۱۹ء کی آخری ملاقات میں راقم سطور نے کافی وقت مرحوم کے ساتھ صرف کیا، علالت کے باوجود جس محبت اور جوش و خروش کے ساتھ وہ پیش آئے، لائق تحسین و ستائش ہے، خاصکر بیگم قدسیہ کے ساتھ حسن سلوک کا نادر نمونہ پیش کیا اس مرض کی حالت میں اپنے علمی کارناموں، تحریری نسخوں اور خاصکر عربی خوشخطی کے جو نمونے دکھائے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران لکھے ہوئے عربی مقالات و مضامین کا جو مجموعہ دکھایا وہ لائق حیرت ضرور تھا، ان تمام اخلاقی محاسن کا ہر فرد معترف ہوگا خواہ وہ کسی مذہب اور مسلک کا ہو، مگر اسلام کے بارے میں ایک ایسے روشن خیال عالم اور مستشرق کا رویہ کیا تھا، اس کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے، صرف دو ایک مثالیں کافی ہیں، موصوف کی کتاب محمڈنزم (۱۹۶۲ء) خود بد مذاقی کا عظیم ثبوت ہے، گرچہ اب اس کا نام اسلام رکھدیا گیا ہے، مگر مؤلف کے مضامین اظہر من الشمس ہیں، اپنی معروف تالیف "اسلام میں جدید رجحانات" ۱۹۴۷ء (Modern trends in Islam) میں اسلام کے بارے میں بے حد دلسوز باتیں تحریر کی ہیں، چھٹے باب میں اسلام اور اس کے عالمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں کہ اسلام درحقیقت محمدؐ کے جذباتی مغلوبیت کا ایک ہیجانی دین (Emotional cult) تھا، جدید رجحانات کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے مؤلف نے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ جدید معقول دینیات (Rational Theology) اب محمدؐ کے ہیجانی دین (Emotional Cult) پر غالب آگئی ہے یعنی جدت قدامت پر اور بغاوت روایت پر غالب آگئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں اور روشن خیال مغربی تعلیم یافتہ افسران کے ہاتھوں جو اسلام کشی کی تحریک ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمدؐ کا جذباتی مذہب اب عقلیت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے، مؤلف یورپ کی بدقسمتی پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یورپ کی روحانی تحریک اسی جذباتی مذہب کے زیر اثر عربی ادبیات کے ذریعہ میڈیول دور میں یورپ پہنچی پھر اٹھارویں صدی میں الف لیلہ وغیرہ کے ذریعہ جذباتیت کا آسیب یورپ کے سر پر سوار ہو گیا برصغیر ہند و پاک کی اسلامی تحریکات اور تحریک جدید سے بحث کرتے ہوئے مؤلف علی گڑھ اسکول اور سرسید کی تعریف

کرتے ہیں، ساتھ ہی غلام احمد کی قادیانیت اور قادیانی تحریک کی زور دار حمایت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اسلام میں احمدیہ تحریک نے ہی تجدید کو آگے بڑھایا، ایک نئے مذہب کو وجود میں لایا اور رواداری کے ساتھ تحریک اصلاحات پر زور دیا، جو لوگ قدیم اسلام میں عقیدہ کھو چکے تھے، ان میں تازہ ایمان پیدا ہوا، علامہ اقبال کسی بھی مسلم قاری کے لئے محتاج تعارف نہیں، نہ ہی کوئی تعلیم یافتہ علامہ کی اسلام دوستی یا فکر و نظر اور مغربی تہذیب پر نقد و جراحت سے ناواقف،

پروفیسر گب علامہ اقبال کو مجموعہ اضداد قرار دیتے ہوئے ان کی معروف تصنیف کی دھجی اڑاتے ہیں اور اقبال کو مجموعہ تضاد (Mass of contradiction) قرار دیتے ہیں، معروف فرانسیسی مستشرق رینان (Rennan) نے اسلام کو معقولیت یا عقلیت کا ناقابل علاج دشمن (Incumble enemy of Islam) بتلایا تھا

پروفیسر گب نے اسلام کو تاریخی افسانہ یا جھوٹ (Historical Romance) سے تعبیر کیا جس میں معقولیت کا عنصر کم ہے اور تخیل کا عنصر زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ تخیل کی زندگی عقلیت کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہے، اسلام جلد زوال پذیر ہوا

حتی الامکان معروف مستشرق مانٹگمری واٹ کی رواداری اور انصاف پسندی کا چرچا خاصہ ہے، ان کی تین معروف تالیفات مغرب اور مشرق دونوں جگہ مقبول ہیں، محمد در مکہ (۱۹۵۳ء) محمد در مدینہ (۱۹۵۶ء) اور محمد حیث نبی اور اسٹیٹسمین (۱۹۶۱ء) کی دھوم مچی، اور اگر بغور دیکھا جائے تو مولف کے موقف میں روایتی موقف سے زیادہ نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے، یہ تصور موجود ہے کہ محمد مکہ میں کچھ اور تھے اور مدینہ میں کچھ اور ہو گئے، یہ قدیم موضوع بحث ہے، اس میں نیا پن نہیں، خود ٹوائن بی نے یہی موقف اختیار کیا ہے، پروفیسر واٹ نے ان کتب میں آنحضرتؐ اور اسلام کے منظر و پس منظر کا تحلیلی مطالعہ کیا ہے، جس کے ذریعہ وہ اسلام کی اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں، اول الذکر دو کتابیں سیرت محمدؐ سے متعلق ہیں، آنحضرتؐ کے تاریخی اور سوشل پس منظر میں آپ کے کارناموں اور زندگی کا تجزیہ ہے، مکہ کے سوشل اور معاشی حالات کی تحلیل ہے، یہ موضوع بھی اچھوتا یا جدید نہ تھا، مولف یورپ کے وحشیانہ حملوں کے خلاف آنحضرتؐ کا دفاع کرتا ہے، اس خیال میں محمدؐ کے عظیم کارناموں کی روشنی میں وحشیانہ حملے غیر موزوں ہیں۔

محمد در مدینہ ص ۳۲۵ تیسری کتاب جو اول الذکر دو جلدوں کی تلخیص بھی ہے، اس لئے قابل توجہ ہے

کہ اس میں مولف نے آنحضرتؐ کی نبوت اور اخلاص کو تسلیم کیا ہے، یہ بات بھی نیا نہ تھا، اس سے پہلے بھی یہ موضوعات بھی زیر بحث آچکے تھے، ان کتابوں میں وہ کلام پاک پر حملے برابر کرتے ہیں، وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا نزول وحی کے ذریعہ سے ہوا۔

برنارڈ لوئس امریکی مستشرق حی القائم ہے، اور اسلام دشمنی کے لئے معروف بھی ہے جس کی تازہ ترین مثال اس کا وہ مقالہ ہے، جو امریکن اسکالر نامی مجلہ شمارہ دسمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے، اس کے صفحہ ۴۷۱ پر مولف قرآن کریم کا موازنہ جرمنی کے ایک وحشیانہ رزمیہ کے ساتھ کرتے ہیں، وہ رزمیہ جس سے معروف جرمن موسیقار واگنر نے اپنے بعض اوپرا اخذ کئے تھے، اس سے زیادہ مضحکہ خیز اسکالر شپ اور کیا ہو سکتی ہے، یہی اساتذہ امریکی جامعات میں دراسات اسلامیہ کے سربراہ ہیں، دوسری مثال ریڈرز ڈائجسٹ کے اڈیٹر اعلیٰ [illegible] کی ہے جنہوں نے اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی کی ریگستانی اور وحشیانہ بدویانہ سوسائٹی کے لئے آج سے دس صدی قبل وضع کیا گیا تھا (ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۸۱ء ص ۱۰۱) ایک عالمی اور شہرۂ آفاق پرچے کے اڈیٹر کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہو چکی ہیں، اور اسلام اب پندرہویں صدی کے دور میں داخل ہو چکا ہے، یہ واضح رہے کہ ریڈرز ڈائجسٹ کی پندرہ زبانوں میں ۳۰ ملین کاپیاں اور ۳۹ اڈیشن شائع ہوتے ہیں اور عام طور پر ہر تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

یہ ہے چودہ سو سالوں کا ایک تاریخی زائچہ جو سرسری طور پر پیش کیا گیا ہے، مستشرقین کی اسکالر شپ اور مغربی مجلات و رسائل اور چھاپہ خانوں اور مطابع کی واضح اسلام دشمن پالیسی اور تفصیل ان توضیحی عنوانات کے ساتھ ناظرین کے سامنے ہے، ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۱ء تک موقف میں فرق نہیں آیا۔

مغربی جامعات میں دراسات اسلامیہ کی مشکلات عملی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں

مغربی یا امریکی جامعات میں علوم اسلامیہ مثلاً تاریخ اسلام، عقائد و علم کلام یا فلسفہ کا مطالعہ نہ صرف مشکل ہے، بلکہ ناممکن بھی ہے، یہاں مسلم طلبہ اور اساتذہ کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہیں، جو اپنے دین حنیف سے محبت کی بنا پر تمسیخ دین کے لئے تیار نہیں، ان کے لئے دو ہی راہیں کھلی ہوئی ہیں، یا تو اسلامی مضامین چھوڑ کر دوسرے مضامین کا انتخاب کریں یا پھر جامعہ کو ہی خیرآباد کہیں، بہت سے طلبہ جنھوں نے اپنے دین کی حفاظت کے ڈگری کی پرواہ نہیں کی وہ جامعہ ترک کرنے پر

مجبور ہوئے، اس لئے اساتذہ یا مشیران تعلیم اور ایڈوائزر سے ذہنی تصادم کے بعد وہاں رہنا مشکل تھا، بعض حالات میں اسکالرشپ سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے، ایسے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، طلبہ و اساتذہ کی دوسری قسم افسوسناک حد تک مایوس کن ہے، اس گروہ کو سفیران میں ایسے مسلم اساتذہ اور طلبہ موجود ہیں، جو ذاتی منفعت، یہود و نصاریٰ اساتذہ کی خوشنودی، ملازمت میں استحکام اور ترقی کی آرزو میں نہ صرف اسلام پر حملوں کو برداشت کرتے ہیں، بلکہ خود بھی ایسے مقالات تحریر کرتے ہیں جن میں اسلام پر صریحاً حملے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک طالب علم نے اساتذہ کو خوش کرنے کے لئے خلفائے راشدین میں سے ایک خلیفہ پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ خود عیسائی استاذ نے تبصرہ میں لکھ دیا کہ زیر بحث خلیفہ کے ساتھ طالب علم نے ناانصافی کی ہے اور ظلم بھی،

امریکی اورینٹل کانفرنس کا ایک سالانہ اجلاس نیویارک میں منعقد ہوا، راقم سطور بھی مدعو تھا، ایک مستشرق نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ نے قرآن کی تالیف میں ام المومنین ماریہ قبطیہؓ سے کیا کیا استفادہ کیے، مقالہ کے اختتام پر لوگوں نے مبارکباد پیش کی، مقالہ نگار کو داد تحسین پیش کرتے ہیں ایک مسلمان پروفیسر نے کہا "سبحان اللہ کیا ریسرچ اور تحقیق تھی، ہم ان معلومات سے محروم تھے، جزاک اللہ وغیرہ۔

راقم الحروف پروفیسر مذکور کی پشت پر ہی کھڑا ہوا تھا، جس کا علم پروفیسر صاحب کو نہ تھا، جب وہ پلٹے اور دیکھا کہ راقم سطور نے انھیں اس قسم کی داد تحسین دیتے ہوئے سن لیا تو وہ پانی پانی ہو گئے، اور پھر کبھی آنکھیں دوچار نہ کر سکے یہ خوشامدانہ کلمات تحسین محض اس لئے پیش کئے گئے کہ ان کی ملازمت کے دوام و استحکام میں ان کی اعانت ہو سکے مگر استاذ مذکور کچھ دنوں بعد بڑی رسوائی کے ساتھ جامعہ سے نکالے گئے، ایک طالب علم نے جو اسلامی عقائد کو اپنی زیست کی علامت اور اپنے وجود کا تعارفی نشان تصور کرتا تھا، ایک مقالہ قرآن اور ابتدائی اسلامی کلچر یعنی ابتدائی اسلامی کلچر کے ارتقاء میں قرآن کا کیا کردار (رول) رہا ہے، کے عنوان سے ایک جامعہ میں پیش کیا، نگراں پروفیسر نے مقالات کو اس کے سامنے اس تبصرہ کے ساتھ پھینک دیا کہ بھلا یہ بھی کوئی علمی مقالہ ہوا، جس میں نہ تو محمدؐ پر تنقید کی گئی ہے، نہ ہی قرآن پاک پر نقد و جرح ہے، محمدؐ نے (نعوذ باللہ) مکہ اور مدینہ میں کیا کیا چولے بدلے، اس کا کوئی ذکر بھی نہیں، ان نظریات کے ساتھ تو مغربی یا امریکی جامعات میں سے کسی جامعہ میں گذر بسر ممکن نہیں، متعلم مذکور نے یہ کہہ کر کہ وہ ڈگری کے لئے اپنے ایمان اور عقائد کا سودا کرنے کو تیار نہیں، استاذ مذکور کا کورس چھوڑ کر دوسرا کورس لے لیا، ایک مسلم منتہی طالب علم ایک معروف اور نامی

گرامی مستشرق کے زیر تربیت تھا، اور ساتھ ہی ایک معروف مسلم استاذ یا اسکالر جو مستشرقین سے بھی بازی لے جانے کو تیار تھے، کا پروردہ تھا، اس نے اسلام پر ایک تقریر کے دوران اسلامی عقائد اور ایمان بالغیب پر ایسی باتیں عرض کیں، لگتا جیسے کوئی معتزلی قبر سے اٹھ کر آگیا ہو، وحی پر حملے کرتے ہوئے عرض کیا کہ اسلام عام طور پر تقلید پر زور دیتا ہے، اور آزادیٔ فکر یا عقل اور معقولیت سے دور لے جاتا ہے، اس قسم کے جملے عام طور پر مستشرقین کے محبوب مضامین ہیں، ایسے ذہنی جوان جب تربیت پاکر مسلم ممالک میں واپس آتے ہیں، اور اعلیٰ عہدوں اور مناصب اقتدار پر فائز ہوتے ہیں تو مظلوم اسلام کے لئے مقتل سجاتے ہیں، آج عالم اسلام اسی المیہ سے دوچار ہے، یہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے، یہ امر فوری طور پر محتاج توجہ ہے۔

<u>تجاویز</u> | مباحث بالا کی روشنی میں حسب ذیل تجاویز پر غور کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے، ورنہ سیمینار اور کانفرنس محض نشستند وگفتند وبرخاستند کے مترادف ہوں گی، چونکہ دار المصنفین اعظم گڈھ کی یہ عظیم تاریخی کانفرنس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء سنگ میل اور مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے ٹھوس تجاویز پر غور و فکر کی فوری ضرورت ہے، ان تجاویز میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن کریم کی ہدایات کی روشنی میں آیت کریمہ لَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰارٰی کو رہنما اصول تسلیم کرلیا جائے۔ تاکہ اسلامی دانش گاہ اور دانشوران ریسرچ ادارے اور محققین سب واضح ذہن کے ساتھ مستشرقین کی تالیفات کا مطالعہ کریں، اور نقد سے صرف نظر نہ کریں، مسلم حکمرانوں نے آیات قرآنی سے سرتابی کے بعد جو سزا پائی ہے اور جس کی مثالیں آج سب سے نمایاں ہیں، اس کا اثر سارے عالم اسلام پر ظاہر ہے، اسلامی ریسرچ کو اس انحطاط اور زوال سے محفوظ کرنے کے لئے ان آیات کی روشنی میں واضح پالیسی مرتب کرنے کی ضرورت ہے، ہماری جامعات میں عربی و فارسی مدارس سے ناواقف مسلم اساتذہ ہی مستشرقین کی تالیفات پر بھروسہ کرکے اعتماد کے ساتھ اپنے طلبہ کو زہریلا مواد دیتے ہیں، عربی سے ناواقفیت کی بنا پر وہ مجبور و معذور ہو چکے ہیں، ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے، وہ خود عربی، فارسی یا اردو کتب کا مطالعہ کرسکیں، ہند و پاک کے اساتذہ کا بھی یہی رویہ ہوگیا ہے،

یورپ کی زبانوں میں جو کثرت سے مستعمل ہیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ میں علوم اسلامیہ پر بکثرت لٹریچر فراہم کیا جائے، اردو، فارسی اور عربی کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ اسلامی ادب و افکار کا ذخیرہ فراہم کیا جائے، مستشرقین کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے، کہ انھوں نے اسلام دشمن لٹریچر کا دروازہ کھول دیا جس نے ہر مسلم گھر اور جامعات

بازار اور دکانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، اور خام غیر تربیت یافتہ مسلم ذہنوں کی تشکیل کا بہترین آلہ کار بن گیا.

۳ - خالص اسلامی [illegible] کی ترویج کے لئے تین اہم مراحل درپیش ہیں :

الف : ایک ایسا اشاعتی پریس قائم کیا جائے جہاں عالم اسلام کے اسکالر اپنی کاوشات اور ریسرچ پروجکٹ کی اشاعت کرا سکیں، مغرب کے پریس نے یہی کام انجام دیا ہے، عالم اسلام کے بہترین مفکر اور اسکالرز اپنی فکری کاوشات کی اشاعت سے اسی لئے محروم ہیں کہ اس کا کوئی نظم نہیں ہے، اسی لئے عالم اسلام میں نہ تو زرخیز ذہنوں کے تحفظ کا احساس ہے نہ تھا اس کا کوئی نظم کیا گیا ہے، یورپ میں احتفاظ، لیاقت و ذہن ایک مستقل علمی تحریک بن چکی،

ب : ایک دار الترجمہ قائم کیا ہے جہاں عربی فارسی وغیرہ زبانوں کے تراجم ممتاز مغربی زبانوں میں کئے جا سکیں اور طباعت کے بعد انھیں عالمی مارکٹ میں فراہم کیا جائے مستشرقین کے علمی سیلاب کی روک تھام کے لئے ضروری ہے کہ اسی قوت و طاقت کے ساتھ انشائی اسلامی ادب فراہم کیا جائے،

ج : عالمی مسلم اسکالرز کا ایک انڈکس تیار کیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ دنیا میں مسلم اسکالرز کن موضوعات پر اور کہاں کہاں ریسرچ میں منہمک ہیں، اس انڈکس کے ذریعہ تکرار موضوعات اور تضییع اوقات دونوں سے بچا جا سکتا ہے، اور بین الاقوامی تعاون اور اشتراک فکر و نظر کی تحریک پیدا کی جا سکتی ہے، اس تعاون اور موالات کی آج بے حد کمی ہے بلکہ عالمی اسکالرز کا تعارف تو کجا ان کے کارناموں سے بھی واقفیت نہیں ہے یہ تعارفی انڈکس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہوگا

۴ - یورپ میں تیار کردہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کا ترجمہ کرانے کے بجائے ایک نیا اسلامی انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جائے جس میں لکھنے والے سرتاسر مسلم اسکالرز ہوں، اسمیں دیر لگ سکتی ہے یہ تاخیر باعث تشویش نہیں یورپ میں جو اسلامی انسائیکلو پیڈیا تیار کیا گیا ہے اسے قطعی مسترد کر دیا جائے، اور ان پر اعتماد کرنے کے بجائے خالص مسلم اسکالرز کی تحقیقات اور کاوشوں کو مراجع اور مصادر اصلیہ کے طور پر استعمال کیا جائے،

۵ - مذکورۂ بالا پروجکٹ کے لئے مالیاتی فنڈ کی ضرورت ہوگی، اس فنڈ کو اسلامی لٹریچر تیار کرنے سیمینار اور کانفرنس کے انعقاد اور دیگر اشاعتی کاموں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، بہت کم لوگ کو معلوم ہے کہ مستشرقین کی اسلام دشمن تالیفات کی اشاعت میں چرچ کا فنڈ کس طرح استعمال کیا جاتا ہے، اور عالمی مشنری کونسل کو جو ملین در ملین ڈالر کی رقمیں ملتی ہیں وہ عیسائی حکومتوں اور عوام دونوں کا عطیہ ہوتی ہیں، تاکہ ایک طرف جہاں مسیحی مذہب کی اشاعت و ترویج کا اہتمام کیا

جائے وہاں اسلام کے خلاف (جو ان کے خیال میں عیسائیت کا دشمن ہے) لٹریچر کا انبار لگا دیا جائے۔

۶. ضرورت ہے کہ مسلم ممالک کی جامعات میں خالص ریسرچ اسکالر اساتذہ کا تقرر عمل میں آئے، تدریسی اساتذہ کا تقرر تو عام ہے، یہ اساتذہ سال بھر تعلیم و تدریس، لیکچرز اور امتحانات میں مصروف ہونے کی وجہ سے ریسرچ کا کام کرنے سے معذور و مجبور ہوتے ہیں، غیر معمولی تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تحقیقی مشاغل مشکل ہیں، یورپ کے اکثر ممالک میں خاکر ذرائس جو نادر افکار کے نام سے معروف ہے، تدریسی اساتذہ کے ساتھ خالص ریسرچ پروفیسر کا تقرر ہوتا ہے، جو سال بھر صرف ریسرچ کرتے رہتے ہیں، تدریس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس طرح گوناگوں افکار و خیالات کے ذریعہ وہ اپنی ملت کو فکری طور پر زرخیز رکھتے ہیں، اور ذہنی خشک سالی اور قحط الرجال سے قوم و ملک کو بچاتے رہتے ہیں، یہاں تدریسی و تحقیقی اساتذہ کی تنخواہیں برابر ہوتی ہیں، اور بعض اساتذہ حکومت یا ریسرچ اداروں کے متعین کردہ پروجیکٹ پہ کام کرتے ہیں، اور بعض خود اپنا پروجیکٹ حکومت یا ریسرچ اداروں سے منظور کروا لیتے ہیں اور پھر ان پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں، افکار نو کی اپج اور ذہن کی یہ زرخیزی ہی یورپ کی زیست کا سامان فراہم کرتی ہے، ضرورت ہے کہ اسلامی حکومتیں اور انکی ریسرچ اکیڈمیاں وغیرہ فوری طور پر اس طرف توجہ کریں، اور تعلیم و ریسرچ کو قومی منصوبوں میں اولیت دیں

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَ	اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور
الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ)	جن کو علم دیا گیا درجے بلند کرے گا.

علم و ایمان ترقی کے لئے جزو لاینفک ہیں.

۷. مستشرقین کے ساتھ الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ایک طرف اسلامی ادب کا ذخیرہ فراہم کیا جائے اور دوسری طرف مستشرقین کی تالیفات کا تحلیلی مطالعہ کیا جائے، مستشرقین کی ایک اہم پالیسی یہ بھی رہی ہے کہ نت نئے مسائل اور اعتراضات اٹھائے جائیں اور اسلام کے خلاف پے در پے حملے کئے جائیں تاکہ مسلم محققین اپنی تمام تر ذہنی و فکری توانائیاں بجائے مفید کاموں کے، ان حملوں کے جوابات میں صرف کرتے رہیں، اور اس طرح انہیں کبھی اس کا موقع نہ مل سکے کہ وہ اپنا فکر خیز اسلامی ادب منظر عام پر لا سکیں، اس پالیسی کو ابتک کما حقہ نہیں سمجھا گیا ہے، مسلم اسکالرز کا ایک طبقہ اساطین مستشرقین کی ایک ایک کتاب کا تقابلی مطالعہ ضرور کر سکتا ہے، اس کی اشد ضرورت ہے، کہ ترجمہ یا اڈیٹنگ کے نسخوں کا اصل عربی متن سے مقابلہ کیا جائے، لغوی، اور معنوی تسامحات کا جائزہ لیا جائے، اس طرح ایک خالص علمی اور

تنقیدی ادب کو منظر عام پر لایا جائے تاکہ عوام کی نظر ان تسامحات پر بھی رہے، جن پر محض علم و تحقیق کا غلاف پڑا ہوا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان تالیفات میں تمسیخ علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام کی دانستہ نفی کی گئی ہے، اور یہ لون توضیحی کی علمی تفسیر بھی ہیں، کسی ایک مستشرق کا احاطہ ایک مسلم اسکالر کے بس کی بات نہیں ہے، فرداً فرداً ہر تالیف کی تحلیل و تفرید کے لئے ایک نہیں متعدد مسلم دانشوروں کی ضرورت پڑے گی، تاکہ وہ دیانت و امانت کے ساتھ بلا تعصب مستشرقین کا علمی جواب کر سکیں اور ان عوامل و محرکات کا تجزیہ کر سکیں جو ان تالیفات کا سبب بنیں، کوئی ایسا مستشرق نہیں ملے گا جس کا دامن تعصب کی آلائشوں سے پاک ہو یا صادق الامین ہو یا خالص علمی و تحقیقی جذبہ کے ساتھ دراسات اسلامیہ کی طرف مائل ہوا ہو۔

جن مستشرقین نے بڑے زور و شور کے ساتھ بر ملا اسلام کی تعریف کی ہے، ان کے جادو سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے اصل منشا اور مقصد پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے، بعض اوقات قاری مستشرقین کی پانچ اور چھ سات سو صفحات پر مشتمل کتاب پڑھ جاتا ہے، اس میں اسلام کی تعریف ہی تعریف نظر آتی ہے، لیکن آخر میں مولف کے تلخیصی کلمات کو پڑھ کر وہ ششدر رہ جاتا ہے، ضخیم کتاب کا مولف اپنی تعریفات کے بعد لکھتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد کاذب تھے اور اسلام یہودی و عیسائی مذاہب کا چربہ ہے، ہمارے اعتذاری مسلم نوجوان جو مستشرقین کی اسکالرشپ سے بے حد متاثر ہیں، اور ان کی تعریفات میں رطب اللسان بھی ہیں، ان سے تعارض کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انھوں نے نہ تو کسی ایک مولف کی پوری فکری شخصیت کا تجزیہ کیا ہے، نہ ہی اس کی تمام تالیفات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، ادھر ادھر سے مطالعہ کے بعد اپنی رائے قائم کر لی یا دیگر اصحاب کے تبصروں پر اپنی رائے کی اساس ڈالی، یہ بے حد خطرناک علامت ہے، یہ کہنا کہ کارلائل نے اسلام کے بارے میں خوب لکھا ہے، گبن یہ کہتا ہے، ٹوائن بی یہ کہتا ہے، اور ولیم میور نے اس کا اعتراف کیا ہے وغیرہ وغیرہ کلمات بے حد خطرناک ہیں، کیونکہ کم علم طالب علم ان کلمات سے متاثر ہو کر مغالطہ میں آجاتا ہے، اور اس پورے زہر کو پی جاتا ہے، جو ان مولفین نے شکر میں لپیٹ کر شوگر پل کی طرح اپنے صفحات میں پیش کیا ہے، اور جب وہ کتاب کے اختتام پر پہونچ کر تلخیصی کلمات پڑھتا ہے تو اس کے دماغ میں اسلام کے بارہ میں بعینہ وہی سوالات، شکوک اور شبہات پیدا ہو جاتے ہیں، جو مستشرق مولف پیدا کرنا چاہتا ہے، بچے کو تلخ دوا یا تو شکر ملا کر یا شربت کا رنگ دے کر دھوکے سے پلا دیا جاتا ہے، اور بچہ اسے پی بھی لیتا ہے، لیکن ایک دانا و فرزانہ کے لئے اس تلخی کو گھونٹنا مشکل ہے

مندرجہ بالا مباحث سے مستشرقین کی تلبیسات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ زہر کو کس طرح نئے جام میں گھول کر پلا

دیتے ہیں، یہاں پر ایک اور مثال، بے حد ضروری ہے، اور مفید بھی، یہ ایک کلاسیکی مثال ہے جس پر دوسروں کا قیاس بھی کیا جاتا ہے۔

اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد پروفیسر پلاسیوس نے ۱۹۱۹ء میں اپنی کتاب میڈرڈ سے شائع کرائی، تحقیق کا موضوع دانتے کے اصل مصادر کی سراغ رسانی تھا، پچیس[۲۵] سالہ تحقیق و جستجو کے بعد مولف اس نتیجہ پر پہونچا کہ دانتے کی شہرۂ آفاق کامیڈی، بنیادی خیالات میں نہ صرف واقعۂ معراج رسولؐ کے مشابہ ہے، بلکہ معراج سے متعلق دیگر ادبی و دینی مواد، مثلاً ابن عربی کی فتوحات اور معری کی رسالہ الغفران کے مضامین کا چربہ بھی ہے، اور ساخت اور نمونہ میں ہوبہو ان کی نقل بھی، معمولی تبدیلیوں مثلاً ناموں کے فرق کے ساتھ وہی خیالات اور نمونے پیش کئے گئے ہیں، جو احادیث معراج میں موجود ہیں۔

تحقیق کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ سنسنی خیز تھا، مولف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود عیسائی مذہب نے بے شمار اسلامی تصورات کو اپنایا ہے، ان میں حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا واضح عقیدہ خاص اسلامی ہے جسے عیسائیت نے اپنالیا، عیسائیت کے اندر حیات بعد موت کا تصور ہی نہیں تھا، غرض اسلامی عقیدہ بعد میں چرچ کا اور چرچ کے پادریوں کا ممتاز عقیدہ بن گیا، مولف نے یہ بھی ثابت کیا کہ پادریوں کے روحانی سفر کے مختلف واقعات اور داستانیں واقعۂ معراج کی نقالی ہیں، یہاں پر یہ امر واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ مولف کی یہ تحقیقات اسلام دوستی پر مبنی نہیں جب اسپین اور اٹلی کے درمیان قومیت اور عصبیت کی آگ بھڑکی اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ کی مہم چلی تو اسکالر بھی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالنے لگے، میڈرڈ کے پروفیسر نے اٹلی کو کمتر ثابت کرنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا، اطالوی ادب کے بائبل یعنی دانتے کی کامیڈی کو سرقہ قرار دیا، یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ دانتے نے اتنا سارا مواد واقعۂ معراج اور احادیث معراج سے اخذ کیا ہے، لیکن پلاسیوس کے اندر اٹلی کے خلاف نفرت کا جذبہ تھا، مولف خود ایک کیتھولک پادری تھا، اور اسی عام مسیحی نظریہ کا حامی بھی تھا جس پر عیسائی روز اول سے عقیدہ رکھتے ہیں، اصل ہسپانوی کتاب کا انگریزی ترجمہ و تلخیص ۱۹۱۶ء میں لندن سے اسلام اور ڈوائن کمیڈی کے زیر عنوان ہیرالڈ سنڈر لینڈ نے پیش کیا، اصل ہسپانوی کتاب کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۴۳ء اور انگریزی ترجمہ کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء راقم الحروف کے مطالعہ میں ہے، مترجم نے اصل سے بعض اسناد وغیرہ حذف کر دی ہیں لیکن اصل متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ کتاب کا دوسرا

"تازہ ترین انگریزی ایڈیشن بھی جو ۱۹۶۸ء میں ۲۹۵ صفحات پر مشتمل ہے شائع ہو چکا ہے) شروع سے آخر تک اس کتاب کا مطالعہ نہایت صبر آزما ہے، دانتے بلکہ دینیات پر من حیث المجموعی، اسلامی لٹریچر کی فہرست دیکھ کر قاری خوشی محسوس کرتا ہے، مولف کو فراخ دل، غیر متعصب، منصف، روادار قرار دیتا ہے، مگر کتاب کے آخر میں مولف نے اس ترضیٰ کی تفسیر پیش کر دی اور اسی عام مسیحی عقیدہ کا اظہار کر دیا یعنی اسلام، یہودی اور عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہے"

(ملاحظہ ہو مولف کی کتاب کا انگریزی ترجمہ ایڈیشن ۱۹۲۶ء آخری صفحہ ۲۷۵ کا آخری پیراگراف)

ان حقائق سے یہ بات قطعی آشکار ہے کہ مستشرقین کا خانوادہ، خواہ مشرقی چرچ کا پروردہ ہو خواہ مغربی چرچ کا، عقائد میں مختلف نہیں، اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں بھی مختلف نہیں، شعر و ادب کے مطالعہ میں پاسیوز نے ۲۵ سال صرف کئے اور آخر میں ثابت کر دیا کہ دانتے کی شاعری مجموعۂ سرقات ہے، اور معراج محمدؐ سے ماخوذ ہے (اگرچہ محمدؐ نبی کاذب تھے، اور اسلام دھوکہ کی ٹٹی ہے) آج ہمارے بعض دانشوران مستشرقین کے بڑے مداح ہیں جو مسلم شعراء اور ادبی سرمایہ کو مغربی زبانوں میں منتقل کر کے اہل مغرب کو اسلامی کلچر اور ثقافت سے متعارف کرا رہے ہیں، ہم نہ تو اس کے مخالف ہیں نہ ہی اس کے خلاف تعصب کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، البتہ چند گوشوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں،

پہلے مسیحی مشنری اسلام کے خلاف محاذ آرا تھی، صدیوں کی انتھک جنگ کے بعد مشنری والوں کو یقین آ گیا کہ تبلیغی پلیٹ فارم سے قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ پر حملہ ناکام رہا، انھوں نے اسٹریجی بدل ڈالی، مشنری مبلغین کو تعلیمی چغا عبا پہنا کر جامعات میں علوم اسلامیہ کے اسکالر کی حیثیت سے گھسا دیا، اور سارے عالم میں دھوم مچا دی کہ فلاں شخص دنیا میں اسلامی قانون کا ماہر ہے، اور فلاں فلسفہ و کلام کا ماہر ہے، اور فلاں اسلامی ادب اور شعر و سخن کا ماہر ہے وغیرہ وغیرہ، مغربی جامعات میں سامی شعبوں سے آزاد اور مستقل بالذات ادارے کھولے جانے لگے، کہیں ان کا نام شعبہ جات دراسات اسلامیہ رکھا گیا، اور کہیں ادارۂ دراسات شرق اوسط کا نام دیا گیا وغیرہ وغیرہ، جامعات کے ان اداروں سے اسلام دشمن ادب کا انبار لگا دیا، میدان جنگ صلیب میں تلوار سے قتل کرنے کے بجائے جامعات میں ہی مقتل سجائے گئے، بقول عارف اکبر،

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی ؎

جب مستشرقین نے محسوس کیا کہ اسلام دشمن ادب کی جب انشہ ہو رہا ہے، اس کی قوت ٹوٹتی جا رہی ہے تو انھوں نے

نیا مدخل تلاش کیا، وہ مدخل دینیات کے بجائے قدیم کلچر اور تاریخ کا مدخل تھا، جس طرح اشتراکی نے پیٹ کے راستہ سے گھس کر دنیا میں ہل چل مچادی، اسی طرح بعض مستشرقین نے کلچر کے نام پر عالم اسلام میں ہلچل مچادی، فراعنۂ مصر کا مطالعہ کیا اور اسلام کو کلچر دشمن مذہب قرار دے کر خود اہل مصر میں فراعنۂ مصر کے ساتھ ہمدردی پیدا کردی اور اسلام کو غاصب قرار دینے کی تحریک چلادی، ایران میں سائرس سے ایسی محبت پیدا کی کہ اسلام کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، پاکستان میں موہنجوڈارو اور ہڑپہ کی تجدید اور انڈس ویلی تہذیب کی حمد و ثنا میں تحریری تحریک چلائی، ایک طبقہ نے اسلام کو حملہ آور اور غاصب قرار دے کر اسے کلچر و ثقافت کا دشمن قرار دیدیا، شعراء نے اس پر نظمیں کہیں اور اپنا رشتہ محمد بن قاسم کے بجائے راجہ داہر سے قائم کرنا شروع کردیا "کلچرل مسلم" کی نئی تحریک چل پڑی تو کہا گیا کہ ہم بطور ثقافت مسلم کلچرل حلقہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلم ہیں، مذہبی مسلم کہنے کے بجائے کلچرل مسلم کہنا زیادہ مفید ہوگا، ان موضوعات پر مستشرقین کی تصنیفات موجود ہیں، جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں، یہ ایک مستقل موضوع کا حصہ ہوگا۔

بعض مستشرقین شعر و ادب کے راستہ سے گھسے اور اقبال و غالب و حالی کے نام پر دراسات کا سلسلہ شروع کیا جو بلاشبہ خوش آیند اور محمود اقدام تھا، اقبال بعض کی نظر میں مجموعۂ تضاد قرار پائے، اور محمدؐ کے عصباتی دین کے مبلغ بھی، یہاں پر اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ شعر و ادب کے مطالعہ میں کبھی عقائد کا ٹکراؤ لازمی ہے، فن میں عقیدہ کی آمیزش فطری امر ہے، رومی ہوں یا اقبال، ابن عربی ہوں یا بوصیری، ان کے کلام و پیام میں اسلامی عقیدہ، تصوف، روحانیت، غیر مرئیات و ماورائیات کا سارا کا سارا نظام رچا بسا ہوا ہے، ان کے فن سے اگر ان کا پیام نکال دیا جائے تو وہ صرف ردیف و قافیہ اور الفاظ کا ڈھانچہ ہی رہ جائے گا، فن کار میں ازلی ربط ہے، فنکار کے عقائد اس کی انسانی ذات کا نہ صرف حصہ ہیں بلکہ اس کے فن کی فعال روح بھی ہر فن کے اندر فنکار کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے، دنیا کا کوئی عظیم شاعر یا اس کا فن اس کے عقیدہ سے جدا نہیں ہوسکتا، بلکہ شعری و ادبی مواد و ہیئت تک میں فن کار کی ذات تحلیل ہو جاتی ہے، فن کار یا اس کا شعور دینی و سیاسی، سماجی بلکہ معاشی عقائد تک اس کے فن کا حصہ ہیں، واردات قلب اور کوائف نفس کے ساتھ یہ عقائد بھی اس کی انسانی ذات کا جزو لاینفک ہیں، یہی مختلف خیالات و نظریات یا عقائد اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی ہیں، کسی دور کا ادب محض ہم عصر فنی محاسن، صنائع و بدائع کی بنا پر تشکیل نہیں ہوتا بلکہ اس کی عوامی مقبولیت میں ہم عصر روایات اور عقائد کی آمیزش اور گھلاوٹ اور ملاوٹ کا بھی دخل ہوتا ہے، خود یورپ کے ادب سے دو تین عالمی فن پاروں کی مثالیں کافی

ہیں، آٹھ صدی قبل مسیح کا مقبول فنکار ہومر (جس کی ذات ہنوز محل نزاع ہے) اور اس کی رزمیہ نظمیں ایلیڈ اور اوڈیسے میں نہ صرف قدیم یونانی وثنی عقائد کی آمیزش ہے، بلکہ انسانی معاملات میں اولمپیا کے خداؤں، دیوی دیوتاؤں کا واضح عمل دخل بھی ہے، اسی طرح روما کے معروف وثنی شاعر ورجل کی شہرۂ آفاق رزمیہ نظم "اینائڈ" دیومالائی قصوں اور وثنی عقائد سے مرصع ہے دو عالمی شہرت کے مسیحی شعراء کا ذکر بھی یہاں ضروری ہے، ملٹن اور دانتے دونوں عالمی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں، ان کی شاعری محض ان کے عقائد کی ترجمان ہے، اول الذکر نے خالص پیورٹن عقائد کا اظہار کیا، اور آخر الذکر نے متقشف کیتھولک عقائد کا اظہار کیا ملٹن کی تین مذہبی نظمیں شہرۂ آفاق ہیں، چرچ کی بے جان مذہبی روایات سے عاجز آکر ملٹن نے تحریک اصلاحات میں شرکت کی اور خالص بائبل کی روشنی میں دین مسیح کا احیاء کرنا چاہا، اس کے لئے وہ تاج برطانیہ تک سے ٹکر لینے کے لئے تیار تھا، برطانیہ میں شہنشاہیت ختم ہوگئی، مگر قائدین اصلاحات کی باہمی کشمکش اور افتراق کی وجہ سے عود شاہی کا عمل سنہ ۱۶۶۰ء میں پیش آیا، ملٹن کی شاعری پیورٹن تحریک کی کامیابی کا ترانہ تھی، اور دین مسیحی کے احیاء کا منشور بھی، اس کی فردوس گم گشتہ (سنہ ۱۶۶۷ء) سقوط آدم کی داستان حزیں کا ایک رزمیہ ہے، خطاکار آدم کو اس کے ازلی گناہ سے ابن اللہ عیسیٰ نے نجات دی اور کفارہ ادا کر کے بنی آدم کو بچا لیا۔ لہذا بنی آدم کی نجات اسی میں ہے کہ وہ عیسیٰ کو ابن اللہ تسلیم کر لیں، اس عقیدہ کے منکرین جہنمی ہیں، ان کی نجات ممکن نہیں، ملٹن کی دوسری مذہبی نظم فردوس بازیافتہ ہے جو سنہ ۱۶۶۵ء سے سنہ ۱۶۶۷ء کے درمیان منظر عام پر آئی، اس میں ملٹن عیسائی عقیدہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، حاصل رزم یہ ہے کہ فردوس جو آدم کے ہاتھوں ضائع ہوئی تھی، عیسیٰ ابن اللہ کے ہاتھوں واپس ملی، آدم شیطان کے مطیع ہو گئے، لیکن عیسیٰ اپنے باپ کے وفادار ثابت ہوئے اور شیطانی ترغیبات کو ٹھکرا کر باپ کی وفاداری کا ثبوت پیش کیا، ملٹن کی تیسری معروف نظم سیمسن ہے، جس کا مرکزی مضمون اولڈ ٹسٹامنٹ سے ماخوذ ہے، بالفاظ دیگر ملٹن کی کہانی سیمسن کی زبانی ہے، کیا ملٹن کی شاعری کے عمودی مضامین مذہبی عقائد کی ترجمانی نہیں کرتے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ملٹن کی شاعری عالمی فن پارہ کا عروج قرار پائے اور اقبال کی شاعری محمدؐ کے عصباتی دین کی عکاسی یا مجموعۂ تضاد بن جائے۔

ملٹن سے زیادہ دلچسپ مثال خود دانتے کی ہے، دانتے (۱۲۶۵ - ۱۳۲۱) نے من حیث خالص کیتھولک، احیائے دین مسیح کی آرزو میں اپنی ڈیوائن کمیڈی لکھ ڈالی، اس نے نہ صرف شعری مواد میں عقائد کی آمیزش کی، بلکہ ہیئت کے سانچے میں بھی عقیدہ کو گھول کر پلا دیا، نظم کی پوری ترتیب عقیدۂ تثلیث پر قائم ہے، ۳ اور ۹ کا لحاظ ساری نظم میں،

موجود ہے، حد تو یہ ہے کہ قوالی میں بھی اس نے عقیدۂ تثلیث کے احیار کے لئے، مثلث قوالی کی ایجاد کی، پوری نظم مثلث بند میں لکھی گئی ہے، خلاصۂ نظم یہ ہے کہ انسانیت کی نجات محض کیتھولک عقیدہ کو تسلیم کرنے میں ہے، چرچ کی زبوں حالی اور چرچ و ریاست کے تصادم پر وہ اشکبار ہے، اس کے خیال میں حضرت عیسیٰؑ پر ایمان نہ لانے والے جہنمی ہیں، کیا کوئی قاری یا ناقدان عالمی شہ پاروں کو مواد و ہیئت میں عقائد کی آمیزش سے مبرا ثابت کرسکتا ہے۔

جو مستشرقین اسلامی شعراء و ادباء کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس مطالعہ کا حق ہے، مگر مسلمانوں کو بھی اس کا حق حاصل ہے، کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اس مطالعہ میں اقبال کے فلسفۂ توحید خودی و بے خودی، مرد مومن، عشق رسول کی نازک آبگینوں پر مستشرقین کے نشتر سے بال تو نہیں پڑے ہیں؟ یا حالی کی غزل گوئی کی تعریف کے ساتھ ساتھ مسدس حالی کی تنقیص تو نہیں کی گئی ہے، ملٹن اور دانتے عصباتی و ہیجانی قرار نہیں پائے مگر ہمارے شعراء انفعالی قرار پائے، یہاں پر دو ایک مزید شواہد کی ضرورت ہے، ٹیگور کے مجموعہ مکاتیب میں راقم کی نظروں سے ایک خط گزرا جو شاعر انقلاب نذر الاسلام کے خط کا جواب تھا، آخر الذکر نے اول الذکر کو نوبل پرائز حاصل کرنے پر مبارکباد کا خط لکھا، اس خط کے جواب میں آخر الذکر یعنی ٹیگور نے لکھا کہ تمھاری (نذر الاسلام) شاعری کے مقابلہ میں ہماری شاعری فروتر ہے، نوبل پرائز کے اصل مستحق تم تھے، ہم نہیں'' مگر مستشرقین کی ٹولی نے اپنے خود ساختہ فیصلوں میں مسلم شاعر کو من حیث ہیجانی شاعر مستحق نوبل پرائز نہیں سمجھا، ٹیگور کی دھوم سارے عالم میں مچ گئی، مگر نذر الاسلام مجہول الحال رہا، وہ شاعر انقلاب جو حریت و آزادی کے گیت گاتا تھا، ظالم برطانیہ نے جب اس جرم میں اس کو گرفتار کرکے رانچی کے جیل میں قید کیا تو قلم، سیاہی اور کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی اس کے کمرہ میں رہنے نہ دیا، اس نے بلیڈ سے رگِ جاں کھول کر خون کے فوارے جاری کر دیئے، دو انگلیوں سے کمرہ کی پوری دیوار پر حریت و آزادی کے ترانے لکھ ڈالے،[۹]

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ ہمیں ان خطرات سے باخبر رہنا چاہئے، اور محض اس لئے کہ مغربی اسکالر ہمارے شعراء و ادباء کو مغرب میں متعارف کر رہے ہیں، ہمیں سرور کے نشہ میں خطرہ کے نشانات سے بے تعلق نہ ہونا چاہئے، مغربی جامعات میں اسلامی تحریکات مثلاً اخوان، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھے جارہے ہیں، ساتھ ہی تحریکی شخصیات مثلاً حسن بنا، مولانا مودودی، مولانا الیاسؒ پر تحقیقات جاری ہیں، ان کے شر و خیر محاسن و معائب سے بھی باخبر رہنا ضروری ہے، یہ دراسات اس لئے بھی کی جاتی ہیں کہ اسلام کی سربستہ قوت کا راز معلوم کرکے

اس کی کاٹ کا سامان پیدا کیا جائے، اور اتحاد اسلامی اور وحدت امت کے تمام عوامل و دواعی و محرکات کو کچل کر افتراق وانتشار کی صورت پر پارکھی جائے تاکہ استعماری قوتیں عالم اسلام میں کچھ نہ کچھ شر انگیزی کرتی رہیں، اور مشنری مبلغین کی بھی پالیسی اسی کے مطابق بناتے رہیں۔

بطور تلخیص یہاں پر عرض کیا جا سکتا ہے، کہ اسلام فروغِ اسلام کا داعی ہے اور خذ ماصفا ودع ماکدر کا اعلان آفاقی ہے، مستشرق ہو یا غیر مستشرق، ہر ایک کی تالیف جو طاہر و مطہر ہوگی، قابل قبول ہوگی اور ہونی چاہیئے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جس طرح کوئی مسلم مؤلف حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ تسلیم کرنے یا آیت لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کے خلاف جانے کے لئے تیار نہ ہوگا، عقیدۂ تثلیث یا حلول کو قبول کرنے سے انکار کرے گا، اسی طرح ہر مستشرق قرآن کو کلام الٰہی، محمدؐ کو آخرالزماں اور اسلام کو دین الٰہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوگا، اور یہ تصادم ازلی ہے۔

وہ دن امت مسلمہ کے لئے دس محرم سے زیادہ تاریک ہوگا، اور سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) پر سعدیؔ کے مرثیہ سے زیادہ دل دوز اور دل سوز ہوگا جس دن مسلمان علوم اسلامیہ کی تفسیر وتعبیر کے لئے قرآن وحدیث کی تدوین وتحلیل کے لئے تاریخ وفلسفۂ اسلام کی توضیح کے لئے مستشرقین پر انحصار کریں گے اور مدد کے لئے ان کے دروازہ پر دستک دیں گے۔

شاید ہی کوئی ایسا اسلامی مصدر بچا ہو جو مستشرقین کی تحریف سے ماورا رہو، اور علامہ محمد بن سعد کی الطبقات الکبریٰ کو لیجئے، مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ اس کا جو نسخہ شائع ہوا ہے اس کی غلطیوں کا احاطہ مشکل ہے، جس قدر تصحیف وتحریف ابن سعد کے مطبوعہ نسخوں میں ہوئی ہے حیرت ناک ہے، ان اغلاط کو دامن عفو میں جگہ دینا، انکی محنت اور دیدہ ریزی وجانکاہ کاوشات کی تحسین نہیں بلکہ ان کی اسلام دشمنی پر غلاف ڈالنے کے مترادف ہے۔

فان كنت لا تدري فتلك مصيبة وان كنت تدري فالمصيبة اعظم

ہم مستشرقین کے کارناموں کے منکر نہیں، اور نہ ان کے پاکیزہ کارناموں کو منفی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، البتہ ہم تمسیخ کو تمجید نہیں کہہ سکتے، عالم اسلام کی انسانی قوت مفلوج نہیں ہوئی ہے، سقوط بغداد کے بعد بھی انسانی عمل جاری رہا، سترہویں صدی سے استعمار نے عالم اسلام پر تسلط قائم کیا جو دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا، اس عرصہ میں تمام اسلامی نوادرات کی لوٹ جاری رہی، مسلمان سائنسدانوں کی کتابوں کا مطالعہ ہوا، ان کے اڈیشن طبع ہوئے، اس لئے نہیں کہ انھیں اسلام سے محبت تھی، یا ان کے اندر اسلامی کلچر کے فروغ کا جذبہ تھا، بلکہ محض ان اسلامی

لوں سے استفادہ مقصود تھا، اور یہ بات عام ہو چکی ہے کہ زوال عالم اسلام کے بعد ہی یورپ کا عروج وارتقا ہوا، علمی ذخائر پر تسلط کے بعد اور ان کے مطالعۂ تدریس کے شاعت کے بعد اچانک یورپ میں بہار آئی۔

استعماری نظام تعلیم میں ریسرچ اور تحقیق کا حق صرف سفید فام اہل یورپ کو تھا، مقامی آبادی کو خواہ وہ برصغیر ہند وپاک میں ہو یا شرق اوسط میں، وسط ایشیا میں ہو یا ایشیائے بعید میں، صرف اتنا حق تھا کہ وہ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ دفاتر میں کلرک کی حیثیت سے زندگی گزارے، تفکر وتدبر اس کا حق نہ تھا۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ایک طرف استعمار کی کمر ٹوٹی، دوسری طرف عالم اسلام باوجود باہمی اختلافات کشمکش اور تصادم کے مستحکم ہونے لگا اور ربع صدی کے اندر اسلام دنیا کی تیسری قوت کی حیثیت سے ابھر کر نمودار ہوگیا، وہی اسلام جس کی تجہیز وتکفین کا سامان استعماری قوتیں اور ان کے اعوان وانصار مستشرقین کر چکے تھے، یہ محض خیال نہیں اس کے لئے تحریری شہادتیں پیش کی جاسکتی ہیں، مستشرقین کی تحریروں سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام کی جانکنی کے منتظر تھے، مگر اچانک اس کی روح، قوت واثر پذیری، حوصلہ اور امنگ کو دیکھکر وہ ششدر اور حیران رہ گئے، بلکہ علوم اسلامیہ کے میدان سے ہارے ہوئے سپاہی کی طرح اب بھاگ رہے ہیں، یا چولی بدل رہے ہیں، دوسری طرف عالم اسلام کے حساس مفکرین نیا اسلامی ادب تیار کر رہے ہیں، اور مغرب پرست مسلم حکمرانوں کی پیہم سازشوں اور جوڑ توڑ کے باوجود ان کی مرضی کے خلاف عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں کروٹ بدل رہی ہیں، نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا ہو رہی ہے، خالص اسلامی ادب استشراق کا پردہ چاک کر دے گا، دارالمصنفین اعظم گڈھ کا یہ بین الاقوامی سینار جو اسلام اور مستشرقین کے زیر عنوان منعقد کیا گیا ہے، اس نئی شاہراہ کی سمت ایک "رفتار سفر ہے، اور آیت "لَنْ تَرْضٰی" کی عملی تفسیر بھی ہے۔

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از

(جناب ڈاکٹر نثار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی)

تمہید | ہمارے یہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور و متعارف ہو چکا ہے، اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علما، کی کمی نہیں ہے، جو مستشرقین کی علمی مساعی، ان کے تحقیقی کارناموں اور ان کے مالۂ وما علیہ سے واقف نہ ہوں، تاہم اسلامی علوم کے حوالہ سے بالعموم اور مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے بالخصوص، مستشرقین کے کام کی نوعیت، ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت و کمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے، اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ کے سامنے خاص طور پر، پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کر دیا جائے،

تعارف | واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارہ میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہو چکی ہے، ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کے لیے مستشرقین کا تعصب و تنظّم اپنی انتہا پر تھا، اور ان کی تحریروں میں یا بیہودگی و گستاخی، فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی جس سے بعضوں کو خود شرم آئی، لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی، مختلف عوامل کے نتیجہ میں شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے، اور انکشاف حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہو گیے، یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق اور مستشرقین مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، کہ انھوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے، نتیجۃً یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کیے گیے تھے، ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو تو ان پر نظر ثانی بہر حال کی جانی چاہیے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعۃً تبدیل کر لیے ہیں اور بعض حلقۂ بگوش اسلام بھی ہو گیے ہیں،

آغازِ کار | دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت وحقیقت [illegible] سب پر کھلتی جا رہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں، علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں، اور بڑھتے ہوئے تقاضوں میں نوجوان نسل، فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جا رہی ہے، انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالہ سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں، مثلاً (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف مصر ١٩٦٤ء ج (تا ۳) (۲) احمد ابراہیم خلیل، المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ ١٩٦٤ء (۳) زکریا ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر ١٩٦٥ء (۴) الہراوی، حسین، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ للشؤون الاسلامیہ ١٣٨٥ھ (۵) البہی، محمد، المستشرقون فی موقفہم عن الاسلام الازہر، طبع جدید، (۶) الدسوقی، محمد، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ١٤٠٤ھ (۷) شلبی، عبدالجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ ١٤٠٦ھ (۸) صبرہ، دکتورہ عفاف، المستشرقون ومشکلات الحضارۃ، دار النہضۃ العربیۃ قاہرہ ١٤٠٥ھ، ان میں سے اول الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے، یہ سرمایہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، (تقریباً ١٢٠٠ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، سویڈن، روس، امریکہ وغیرہ) کے تمام قابل ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے،

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سرسید احمد خان م ١٨٩٨ء اور ان کے رفقاء سے ہوا، اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعۂ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسید احمد خان نے ہی کھولا، اور اس حقیقت [illegible] کہ سرسید کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا، اور راسخ العقیدہ علماء کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا، اور رہا، سرسید نے

جذبۂ ایمانی اور خالص جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اپنے ہمعصر مستشرق سر ولیم میور کی دل آزار تصنیف دی لائف آف محمدؐ (حیاتِ محمدؐ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور ذرائع کی کمی کے باوجود اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لیے اپنا تن من دھن سب لگا دیا، اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک، تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی ایک جوابی کتاب "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" لکھی، اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہو گیا، یہ بڑا اہم دور تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقین یورپ فی الواقع سیرت رسولؐ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے، اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت مآخذ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہونچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابل اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرت رسولؐ کا اعتبار اٹھ جائے۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں آپؐ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے،

ابتدائی جائزہ سرسید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا، اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلی (م ۱۹۱۴ء) کو حاصل ہوئی، وہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی، علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انھوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانۂ تنقید نہیں بنایا، بلکہ انھوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا، جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسولؐ پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا، کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے، تو سیرۃ النبیؐ، مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہر حال مطبوعۂ سیرۃ النبیؐ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے "یورپین تصنیفات" کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات، ان کے اسباب محرکات، ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا، اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل

کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے کے باوجود نہایت وقیع ہیں،

علاوہ ازیں علامہ شبلیؒ چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ کو دراصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعۂ سیرت کو معیارِ تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیرِ بحث لاتے، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالے سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقّب تو گویا ان کا مقصود تھا، اور ان کی زندگی کی آخری خواہش تھی، غالباً اسی لیے انھوں نے سیرۃ النبیؐ کے مجوزہ خاکہ میں "پانچواں حصہ "خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا، جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا، تاہم آنے والوں کے لیے روشنی چھوڑ گیا، اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلیؒ مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بہ تمام و کمال ادراک رکھتے تھے،

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالے سے سیرتِ رسولؐ کے [illegible] تحقیق کا کوئی بڑا اور منظم کام سامنے نہیں آیا، اور ہمارے یہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا، انفرادی و اجتماعی کوششیں کی جا رہی ہیں، اور اب بھی مقالات و مضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہر حال ہو رہی ہے، مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیات محمد" کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا، جو اگرچہ عربی زبان میں ہے لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے، ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ "جامدین عن المسلمین" کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا، بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لیے بھی کتاب لکھی، ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں "المستشرقون والحضارۃ الاسلامیۃ" کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے، اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے، اور جرأت و قوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی ہے،

نوعیت مسئلہ | یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریکِ استشراق کا قرار واقعی جواب، اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ

سرسید احمد خان نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا، اور جسے مولانا شبلی نے منظم و موثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب سرگرمی نہ ہونے کے برابر ہے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں قالب و لہجہ کے فرق کے ساتھ تا حال جاری و ساری ہیں، اور ان کے عزائم و مقاصد آج بھی سرمو فرق نہیں آیا ہے، لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام و اہتمام صفر ہے، مولانا شبلی وغیرہ نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور ان کے معیار کی جو نشان دہی کی تھی، اور ان کی حقیقت کو جس طرح کذب و افترا کا دفتر قرار دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا، اور تمام علوم اسلامیہ میں بالعموم اور سیرت رسول ﷺ کے باب میں بالخصوص واقفیت حاصل کر کے ان کی غلطیوں، بددیانتی اور تلبیس و تحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا، اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا، مگر ایسا نہیں ہو سکا، بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت و شدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا، نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلیٰ سطح پر علم و تحقیق کی سرپرستی کر سکیں، اور ان کوششوں کو متحد و منظم کر سکیں، جو انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں، ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں اس معیار کی علمی و فنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز ہے، مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے اسی تیاری کی ضرورت ہے، جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم و تحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس و تفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب و ثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم و فنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت و ریاضت وغیرہ)

مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود ان مسلمان محققین و علماء کے رویہ سے مل رہی ہے، جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم و تحقیق کے لیے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال و مناظر سے اس درجہ متاثر و مرعوب ہو جاتے ہیں، کہ انہی کے ہم آواز ہو جاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلۂ اول میں مسئلہ مستشرقین کی نوعیت و حقیقت کو سمجھ لیا جائے، اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق و مستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب و محرکات، عہد بہ عہد ارتقا، اور اعلام و مشاہیر کی عام فہرست کیا ہے، زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے،

استشراق، مستشرق | استشراق اور صاحبانِ استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ تحریکِ استشراق اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہی، اور ہر دور کے غیر مسلم مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود چونکہ اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کے حوالہ سے بہر حال معاندانہ رہی ہیں، اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ و فکر کی نمو ہو گئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریکِ استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں، شاید یہی وجہ ہے کہ :-

(ا) استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں، بلکہ انگریزی زبان و ادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا، چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورۂ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں شرق یا مشرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، پھر اسی سے اورینٹل ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (Occidental) کا ضد ہے، مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم روی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں، جبکہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز و ادا، اقدار، علوم و آداب اور فنون و ثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ، نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا، مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو، یا بقول مولوی عبد الحق ماہر مشرقیات ہو،

(ب) عربی، فارسی اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق تو موجود ہے، لیکن زیر بحث الفاظ یعنی بابِ استفعال میں اس کے معنی و مفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے جس کا

مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص و لوازم یعنی اتخاذ و طلب، وجدان و حسبان اور تحول و تکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبان استشراق کے احوال و شخصیات سے اور ان کی تحقیقات و تخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام علم اکتسابی ہے، جسے انھوں نے بڑی محنت و ریاضت سے طلب و جستجو کر کے حاصل کیا، اس کی خاطر سفر و حضر، تمکن و توطن اختیار کیا، اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین و ظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے، مختصر یہ کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہو گئے بہ تکلف مشرقی بننا، اور مستشرق کا مطلب ہو گا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی، یا مشرقی بنا ہو، اردو ولغت و ادب میں بھی کم و بیش یہی مفہوم ہے، یعنی مستشرق کا مطلب ہو گا" وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو، یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو،

زبان و لغت کی مندرجۂ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہو جاتا ہے، اور مستشرق کی نوعیت و ماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جا سکتی ہے تاہم استشراق کی حقیقت اس وقت سامنے آئی، جب کہ استشراق، السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم و آداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض و عناد، اس کا جز و لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض و عناد پہلے پہل تو مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک، ایک مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کر لی، اور اسی رویہ و سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام ضروری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقا کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں، قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں، اسلامی تہذیب و تمدن کے لیے چیلنج بن سکیں، عربی زبان کے لیے کہا گیا کہ قرآنی عربی عہد جدید کی ضروریات و حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی، اس لیے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہیے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کر دینا چاہیے، پیغمبر اسلام کی سیرت و کردار کے بارہ میں ان نکات کو

کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا تاثر نہ لے سکیں، اور ان کے لائے ہوئے متن کو ناقابل التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و ترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تاکہ اسلامی ثقافت مجموعۂ خرافات ٹھہرے وغیرہ وغیرہ، ان تمام معاملات کا ہدف بہر حال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمت عملی تبدیل ہوتی رہی، اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے رویہ پر خود انھوں نے نظر ثانی کی، اور بدنیتی کے باوجود مخالفت و مخاصمت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا، اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب و تنظلم کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا،

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا، اسی لیے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں، اور اسی لحاظ سے ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے،

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لیے اس اجمال کی کچھ تفصیل آیندہ صفحات میں عرض کی جائے گی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبۂ فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا، اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا،

تحریک استشراق کا آغاز

تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز در اصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا، اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام کے خلاف بالخصوص بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفور جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں، اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف، اور وقایع و اشعار کے قالب میں ڈھلتی رہیں، اور ان کی اپنی آیندہ نسلوں سرمایۂ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانی اسلام کے حوالہ سے انکی مخالفت

ومخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے، اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے، اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب ان کے دلی جذبات کے علاوہ یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لیے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سُنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انہیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گیے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں صلیبی محاربات کا سلسلہ جس سے دشمنی و عداوت کا ایسا نشہ ان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا، صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی، بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی، کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لیے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم و معلومات رکھتے تھے، وہ کتنی ہی ناکارہ و خام سہی، ان کے لیے بہرحال مفید مطلب تھیں، جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی، اور سیرت ختم الرسل کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی پیغمبر اسلام کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی مبہم اور ناقص تھیں، اور اس خلاء کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات سیرت کو پیکر خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی، بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افترا سے عبارت تھا، اس عہد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کیے گیے، مثلاً (نقل کفر، کفر نباشد) آپ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو، اور بہروپیا کہا گیا، اور بہر عداوت اس حد تک کر گیے کہ آپؐ کیلئے لفظ محمدؐ استعمال کرنے کے بجائے (Mahomd) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں "شہزادۂ ظلمات" پھر جب

صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتشِ عداوت اور بھڑکا دی، تو وہ حضورؐ کے لیے (*Baphomet*) اور (*Bapuum*) اور (*Maphomet*) کے الفاظ استعمال کرنے لگے، اور آپؐ کی سیرت و سوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں، ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے، اور ان کا مرکزِ پرستش، محمدؐ کا بت تھا، پھر ایک سے زیادہ تین بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا، اور یہ انکشاف کیا گیا کہ "آنحضرتؐ تو دراصل خود پیروِ دینِ عیسوی تھے لیکن پوپ منتخب نہ ہوسکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کرکے اسلام ایجاد کیا"، وحی و تنزیل کے حوالہ سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر فاختہ یا قمری کو سدھار رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا، جب سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے، اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے،

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء و مستشرقین، صدیوں کیسی شدید ناواقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء نے سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے، اور اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے،

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصّہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں، لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں البتہ ان میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعوی یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کر دی، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا، اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرونِ وسطی کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویرِ رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات و اتہامات عائد کیے، اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان سب کا ماخذ کم و بیش یکساں تھے، اسی لیے جب بھی انہوں نے تیر

پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسلؐ افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی، اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار اور شیطان کا چیلا قرار دیتے رہے، کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلے نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی، اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا، اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکے، تو پھر انہوں نے کمال عیاری سے اسباب و سائل اور تدبیر و حکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا، اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لیے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کیے جائیں، اور "گرم جنگ" نہ سہی "سرد جنگ" میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں، علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لیے رائمنڈ لل (Raymondlull) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک پُر امن صلیبی جنگ جاری کی جائے، جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں،

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات و اتہامات و تشکیک و تذبذب کے بیج بوکر خرافات کا ایسا جنگل اگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے مقابلہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انہیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء و اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا، علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لیے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع

عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لیے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں بالآخر وہ مرحلہ آگیا، جبکہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا، سب نے مل کر اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا، اور ایک متحدہ رومی کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی، اور دوسری طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب، پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ عقلاء و فضلاء لیں گے، جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے، اور درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر داد تحقیق دیں گے، تاکہ ادھر ان کے ان دبے جذبات نفرت و عداوت کی بھی تسکین پائیں، اور ادھر علم و تحقیق کے حوالے سے ان کا رعب و دبدبہ قائم ہو جائے، چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل (G. Postel) کو سامنے لائیں، جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا بابا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا، اور بطور خاص لغت و لسانیات کے حوالہ سے اہم خدمات انجام دیں، پوسٹل ہی کے لیے ۱۵۳۹ء میں کلیہ فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر فائز ہوا، گیام پوسٹل کے کام کو لغت و لسانیات کے ہی حوالہ سے اس کے لائق و فائق شاگرد جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا، پھر بالآخر دبیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۶ء میں عربی مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا، جس کا سہرا بڑی حد تک ڈیوک آف تسکانی (Tuscany) کے سر ہے،

اوپر کی تفصیل سے دو ۲ باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں، یعنی :-

(۱) یہ کہ سولہویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا سر آغاز قرار دے سکتے ہیں یہی وہ دور ہے جبکہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط و منظم نقشہ مرتب کیا،

(۲) اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی، جس کا اثر تاریخ مابعد پر جاری و ساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا،

<u>تحریک کا ارتقاء</u> | تحریک استشراق کے حوالے سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ

یہ زمانہ تحریک کے ارتقا، اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا، جہاں تک سترہویں صدی عیسوی کا تعلق ہے بقول مولانا شبلی یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، اور یورپ کی جد و جہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے، جس کے نتیجۂ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام آتا چلا گیا، یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارہ میں معلومات جمع کی جانے لگیں، عربی زبان کی ماہیت و خصوصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ ارپی نیس (Erpenius, 1584-1626) نے پہلی عربی زبان کی قواعد شایع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی، پھر اس کے اتباع میں اسکے شاگرد جیکب جولیس (Jacob Golius, 1595-1667) نے گرانقدر خدمات انجام دیں، اور پھر ۱۶۳۶ء میں ایڈورڈ پوکاک (E. Pococke, 1604-1691) پہلا انگریز مستشرق تھا جسے آکسفورڈ میں شعبۂ عربی کا صدر نشین بنایا گیا، مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے مینسکی (L.E. Meninski) نے بھی سنہ ۱۶۸۰ء میں انجام دیا، اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ادارہ ڈی ہربیلوٹ (D. Herbelot) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا، اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پر کتابیں شایع ہوئی تھیں، انکی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شایع کر دی جو پر از معلومات تھی، اسی ادارہ کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتابچہ بھی شایع کیا گیا،

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ پہلے سنائے معاندانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبرؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مسالے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس صدی میں مستشرقین کے رویہ اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنۂ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی، اور انھوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا، اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں، البتہ جو مستشرقین مطالعۂ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے

سے سامنے آئے، ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں،

(۱) ولیم بیڈول (W. Bedwell) انگریز مستشرق تھا، جس کا زمانہ ۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس کے آثار وقیامت میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں، ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے، اور ۱۶۱۱ء سے پہلے شایع ہوئی، اور دوسرے سیرت رسولؐ پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ء میں شایع ہوئی، سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے، اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی "محمد کاذب" رکھا گیا ہے (نعوذباللہ) (۲) واٹیر (P. Valliez) فرانسیسی مستشرق تھا، اس کا زمانہ ۱۶۱۲ء تا ۱۶۶۷ء ہے، اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا

(۳) ہانتجر (J. H. Hollinger) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق، (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء) اس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸ء) قابل ذکر ہے،

(۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubbe) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق، زمانہ (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء) اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی) کا نام ہے۔ (An Account of The Rise and progress of Mohametanism) کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظرانداز کردی جائیں، تو اسے سیرت رسولؐ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے، اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسولؐ کے بارہ میں اولین اعتذار ہے، اس کتاب میں اسٹب نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے، جو پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا، جبکہ ان مصنفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے، جو انہوں نے اخلاق وکردار نبویؐ کی کھینچی تھی، اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ "اس آسمان کے نیچے سوائے محمدؐ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے، جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا، (ص ۲۱۱)

دوسرے مستشرقین میں سے جین برڈ (Gene Brand) کا زمانہ گرچہ ۱۵۳۶ء تا ۱۵۹۱ء
تھا لیکن اس کا موقف تقریباً ستر ہویں صدی میں عام ہوا، وہ ایک مشہور کیتھولک مناظر باز تھا، جین برڈ
کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضورؐ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا
ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خوب ہی جواب
دیتا ہے کہ اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خود ایک حیوان (جانور چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ)
زبان (عربی) جانتے تھے، جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس لیے اس کے نقطہ نظر
کے مطابق قرآن عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا، (حمادے ص ۴۷-۴۶)

۱۶۵۳ء میں الیگزنڈر روس (Alexander Ross) نے اپنی کتاب
(Pandebeia) شایع کی، وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالے سے سامنے آئی، لیکن اس کے ایک حصہ
میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے بارہ میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے، حالانکہ اس کی پہلی کتاب "حیات محمد کا مختصر جائزہ"
قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی، لینلوٹ ایڈیسن
(Lancelot Addison) نے ۱۶۷۸ء میں سیرت پر ایک کتاب شایع کی، اگلے
سال یہی کتاب نئے عنوان (حیات و ممات محمدؐ) کے نام سے سامنے آئی، مگر اس کے مصادر حسب معمول
لاطینی خرافات تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اسے سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب "قرآن"
اپنی زندگی میں شایع نہیں کیا تھا، ایک اور مستشرق ہمفرے پرائی ڈیکس (Humphrey
Prideaux) نے حضورؐ کی سوانح لکھی، لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا، اور دوسروں
کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعی کاذب، مکار، فریبی قرار دیا، اس پر تماشہ یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک
صدی تک دوسروں کے لیے "معیاری کتب حوالہ" بنی رہی، ایک ہی سال (۱۶۹۷ء) میں دو اشاعتیں
عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ء میں ہو گیا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کے
حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے بڑے علماء استعمال کرتے تھے،

اٹھارہویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق منازل ارتقاء طے کرتی رہی، البتہ سفر جیسے

جیسے آگے بڑھتا رہا، رخت سفر کم و بیش ہوتا رہا، اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہو گئی، اس نرمی اور لچک کا مطلب یہ ہے کہ انہیں سے چند کا رویہ، رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح اسلام و پیغمبر اسلام میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کیے ہوئے نظریات بھی گرم سفر رہے، اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ تنگ نظرانہ و متعصبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت و انصاف پسندی کا رجحان بھی جاری و ساری ہو گیا، اور اس رجحان نو کا ساز غالباً اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان (H. Reland) نے ۱۷۰۵ء میں (De Religione Mohamedica) لکھ کر چھیڑا، اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ "ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل ماخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں"، اور برملا کہا کہ "تاریخی انصاف" کے ترازو میں تو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے، پھر اس "نے نوازی" میں پیری، بائل اور لوپین اور والیئر وغیرہ بھی شامل ہو گئے،

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی طرف بنظر شفقت دیکھا اور افہام و تفہیم کی جانب پیش قدمی کی،

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی و انفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں، خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا، بقول مولانا شبلی "یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی، جس نے اور ینٹلیسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی، جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا، اور آخر کار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں، تمام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسر اور

اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا، السنۂ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک اور ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارہ میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں،

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالہ سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا، چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی، اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پالیا، اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصوّر اور مخصوص سلوک اور رویّہ نے بھی جنم لیا، اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں (۱) سائمن اوکلے (S. Ockley) انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۸ء تا ۱۷۲۰ء تھا، اس کی کتاب مسلمانوں کی تاریخ پر ۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۸ء شایع ہوئی، یہ تین جلدوں میں تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مستشرقین کے نتائج تحقیق کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا، (۲) ایڈورڈ پوکاک، انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۴۸ء تا ۱۷۲۷ء تھا، اس کا ہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گزر چکا ہے، (۳) جارج سیل، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء تھا، اس نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا ترجمہ شایع کیا، اور بعض مستشرقین کے کلمات خیر کے ردّعمل میں آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا، (۴) جین گجینر (J. Gagnier) انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۰ء تا ۱۷۴۰ء تک کا تھا، اس نے دو کتابیں شایع کیں، ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویلر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ ولین ویلر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو ۱۷۴۸ء میں امسٹرڈم سے نمودار ہوئی (۵) رسک (J. J. Reiske) جرمن مستشرق، جس کا زمانہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۴ء تک تھا، وہ جرمنی کا کلاسکی لغوی اور عربی اسکالر تھا، اور یونانی زبان و ادب پر سند مانا جاتا تھا، (۶) ایڈورڈ گبن، انگریز مورخ، زمانہ (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لیے خاصی شہرت کا حامل، اس نے ۱۷۸۵ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرتؐ کے بارہ میں نہایت دل آزار رائے کا

اظہار کیا اور رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہو گیے تھے۔ (نعوذ باللہ) (۷)، والیٹر (Voltaire, FR.) فرانسیسی مصنف زمانہ ۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء اس نے پیغمبر اسلام کے بارہ میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا، یہ ڈرامہ اگرچہ تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے، یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آیا، اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا، بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی، جنہوں نے اسلام اور آنحضرتؐ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا، اس نے ڈرامہ کو پوپ پانزدہم کے نام منسوب کیا، اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والیٹر نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا، والیٹر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا، چنانچہ ڈیڈی روٹ (Diderot) اس فحش نگاری پر بھی اتر آیا، کہ "محمدؐ دنیا میں سب سے بڑھکر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی و معقولیت کے دشمن تھے، (نعوذ باللہ)

تحریک استشراق کا عروج | انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لیے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط و انحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف "مغرب" کو زمانہ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق و بالادستی حاصل ہوتی چلی جا رہی تھی، اور اس کی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ اور زار ہوا، اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے کیسی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو، اقوام مغرب کے لیے یہ حال [illegible] برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا، چنانچہ

زیرِ نظر دور (۱۸۰۰ تا ۱۹۲۵ء) تحریکِ استشراق کے عروج و کمال سے عبارت ہے، اس عہد میں تحریکِ استشراق بھرپور فروغ حاصل ہوا، مستشرقین کے انداز و اطوار اگرچہ بدل گئے تاہم کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے ان کے خلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے، مثلاً :-

(الف) کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی، اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے جو خاموش صلیبی جنگ کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام علاقوں کی نمائندگی کرنے والے تھے، مثلاً فرانس، اٹلی، انگلستان، اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیم، چیکوسلواکیہ، فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے،

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیئے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا، بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبرِ اسلام کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا، اس دور میں مستشرقین کا معیارِ تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا، اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا، جو آج بھی باعثِ حیرت ہے، قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافاتِ قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں، بلکہ یہ انکا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک طبع ہو کر پہونچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں،

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسبِ سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا، ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے، تو دوسری طرف حقیقت بیں، انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے، مثلاً ناڈرے، گنیز، کاسن دی پرسیوال، ویل،

رینان، گوئٹے، شولتس، دلائل اور دزمنگم وغیرہ،

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ اور معقول ہوتا چلا گیا، اس کی بظاہر وجہ ایک تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی، کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین و ظن کے بجائے وہ عقل و استدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات و اسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کر دی، اور بیان و واقعہ کا تضاد سامنے آ گیا، دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، نیز حریت پسندی، سائنسی ایجادات و اختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک، کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئے۔ ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں، نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت و نفرت پر محبت و مودت غالب آ گئی تھی، بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انہیں نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعہ یہ ہے کہ تبدیلی آ گئی۔

(ز) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہو گئیں اور الزامات و اتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہو گیا، نیز (۲) صورت حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیے جنہوں نے جرأت سے کام لیکر اپنے پیشرو مصنفین کی تنقید کی، اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا،

(ح) اپنی سرگرمیوں کو منظم و مرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کیے، مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ ۱۸۲۳ء، اور امریکن اورینٹل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ، ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیے، جس سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی، لوگوں کے اذہان و قلوب کو متاثر کرنے میں رسائل و جرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لیے متذکرہ بالا مجلات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد رسائل و جرائد کی اشاعت

کا بھی اہتمام کیا، چنانچہ ہندوستان سے (The Muslem world) کا اجراء پیرس سے ۱۸۹۵ء میں (Revae-de-Islam) کا اجراء، روس سے ۱۹۱۲ء میں (Mir Islam) کا اجراء وغیرہ رسائل وجرائد اور مجلات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کرا سکیں، لیکن یہ باطنی مدعا، اپنے پرانے استشراقی مقاصد کی تکمیل ہی تھا، رہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی، اقوام یورپ کی بالادستی کا اور استعماری تسلط کا، بہرحال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، اور ۱۸۷۳ء میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنایا گیا، عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کے لیے بڑا مفید مطلب تھا، مختلف اداروں کی سرگرمیاں، کارکردگی، تازہ ترین اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء وفضلاء کی شرکت، مقالات خطبات، صلاح مشورے، قرارداد پیش کرنا، یہ سب باتیں تحریک استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لیے بہرحال ضروری تھیں، اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کردیا،

بہرحال یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ تحریک استشراق کا دور عروج و کمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا، اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام سرگرمیاں بہت منظم طریقے سے ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں، اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی، اور معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ بدل ڈالا، تاہم یہ جائزہ ہم آئندہ صفحات میں عہد جدید کے تحت لیں گے،

یہاں زیر بحث دور کے کچھ مشاہیر مستشرقین کا مختصر تعارف کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے،

(۱) جان جاک سیدیلو (Sedillot, J. J) مشہور فرانسیسی مستشرق جس کا زمانہ (۱۷۷۷ تا ۱۸۳۲) تھا، متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، جن میں ایک تاریخ عرب بھی ہے، (۲) ڈیورجے (Deevergers, A.N) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۷ء) اس کے آثار میں متعدد تصانیف شامل ہیں، تاریخ ابوالفداء سے سیرۃ النبی کا خلاصہ، متن و ترجمہ کے ساتھ ۱۸۴۷ء میں شائع کیا، بلاد عرب پر کئی مجلدات بشمول تاریخ خلافت

عہد مغلیہ تک، مطبوعہ ۱۸۴۷ء (۳) ڈاکٹر پیرون (Perron, A) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۰۵ء تا ۱۸۷۶ء) مصنف کتاب نساء العرب قبل الاسلام وبعدہ مطبوعہ ۱۸۵۸ء، نیز ترجمہ کتاب الطب النبوی، از جلال الدین ابی سلیمان داؤد، مطبوعہ ۱۸۶۰ء (۴) گارسن دی تاسی (Tassy garcin de) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۷۹۴ء تا ۱۸۷۸ء) صاحب تصانیف دین اسلام، قرآن، مذہبی تعلیمات و فرائض وغیرہ (۵) جوزف وائٹ (White . J) انگریز مستشرق، زمانہ (۱۷۴۶ء تا ۱۸۱۴ء) اسلام اور نصرانیت کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل مقالات و محاضرات، اسلام اور پیغمبر اسلام پر خطبات (۶) ولیم رائٹ (Wright, W) برطانوی مستشرق اور مصنف، زمانہ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء) ایڈورڈ ہنری پامر (Palmer, E. H) برطانوی مستشرق اور مشہور مترجم قرآن، ترجمہ قرآن مطبوعہ آکسفورڈ ۱۸۸۰ء، زمانہ (۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۲ء) (۸) ڈی جونگ (de, Jong) ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ ۱۸۳۲ء تا ۱۸۹۰ء، دوسرے ہم وطن مستشرق ڈی جوجے (Goeje, M. J. DE) کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام پر کام کیا، متن اور لاطینی ترجمہ لیڈن سے ۱۸۵۸ء میں شایع کرایا (۹) ڈی جوجے، ہالینڈ کا مستشرق، زمانہ (۱۸۳۶ء تا ۱۹۰۹ء) کثیر التصانیف، وفیات الاعیان از ابن خلکان پر کام کیا، اور اپنے ہم وطن مستشرق ڈی جونگ کے ساتھ مل کر سیرت ابن ہشام کے متن و ترجمہ کی اشاعت کی، (۱۰) فلائشر (Fleischer, H. L.) جرمن مستشرق تھا، زمانہ (۱۸۰۱ء تا ۱۸۸۸ء) متعدد کتابیں لکھیں، تاریخ ابی الفداء کو متن و ترجمہ کے ساتھ اور تعلیقات و حواشی سے آراستہ کرکے لیپزگ سے ۱۸۳۱ء میں شایع کرایا، ایک اور کتاب تاریخ عرب قبل اسلام پر لکھی جو لیپزگ سے اسی سنہ میں چھپی، (۱۱) وسٹنفیلڈ (Wusten Feld, F) جرمن مستشرق، زمانہ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۹۹ء) زود قلم مصنف، تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات و حواشی (تین جلدیں) آراضی مدینہ منورہ اور تاریخ اشراف مکہ وغیرہ کتابیں اس کی یادگار ہیں، (۱۲) بیریزین (Berezine, N) مشہور روسی مستشرق (۱۸۱۸ء تا ۱۸۹۶ء) گویا روسی مستشرقین کے زمرۂ اساتذہ میں شامل متعدد تصانیف مصادر اسلامی، تہذیب و تمدن اور اسلام کے درمیان تعلق پر کتابیں، روسی دائرۃ المعارف میں مشرق اور مشرقی علوم و آداب پر متعدد مقالات اسی مستشرق کے قلم سے ہیں (۱۳) بلانکو (While Jozeaph Blanco) مشہور مستشرق

برطانوی مذہبی مصنف ([illegible] – ۱۸۴۱ء) متعصب پادری، [illegible] کا میدان، اندلس کی تاریخ لکھتا۔ (۱۴) ایڈورڈ سخاؤ، مشہور و معروف جرمن مستشرق، برلن میں مشرقی زبانوں کے کلیہ کا سربراہ، خود بڑا اسکالر اور زبان داں تھا، بقول مولانا شبلیؒ، پروفیسر سخاؤ کی ہی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبویؐ میں کوئی تالیف نہیں شائع ہوئی، (۱۵) سلیم نوفل، روسی استشراق کی تاریخ میں اہم نام، استادوں کا استاد، سرخیل مستشرقین روس میں سے ایک تھا، زمانہ (۱۸۲۸ء – ۱۹۰۲ء) وطن لبنان، کام فرانسیسی میں کیا، سیرت نبویؐ اور اسلامی تعلیمات پر تصانیف (۱۶) فان کریمر (Von Kremer) آسٹریا کا مشہور مستشرق، ولادت ویانا میں ہوئی، تعلیم بھی وہیں پائی، ترقی کر کے وزارت کے درجہ تک پہونچا، اور وفات تک وزارت خارجہ اور دوسری وزارتوں میں خدمات انجام دیتا رہا، اسلامی مصادر کی تقریباً بیس عربی کتابوں کو تلاش کر کے شائع کیا، ان میں سے واقدی کی المغازی، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ، نشوان کا قصیدہ الحمیریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، اس نے اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے بارہ میں کثرت سے کتابیں لکھیں، جو جرمن زبان میں ہیں (۱۷) سر ولیم میور، مشہور انگریز مستشرق، اس کا تفصیلی تعارف مقالہ کے ابتدائی صفحات میں آچکا ہے، (۱۸) مینارڈ (Meynard, B. DE) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۲۷ء – ۱۹۰۸ء) اس نے استشراق پر پہلا رسالہ لکھا اور شائع کرایا، جغرافی، تاریخی، ادبی لغت مرتب کی، مسعودی کی مروج الذہب کا متن و ترجمہ شائع کیا، (۱۹) رینی باسے (Basset, Rene) فرانسیسی مستشرق، زمانہ (۱۸۵۵ء – ۱۹۲۴ء) بے شمار کتابوں کا مصنف مثلاً الشعر العربی قبل الاسلام مطبوعہ ۱۸۸۰ء، بوصیری کا قصیدہ بردہ، نقد شرح مع ترجمہ مصنف وغیرہ وغیرہ (۲۰) ڈاکٹر لیبان (Lebon, D. G.) فرانسیسی مستشرق مشہور عالم، طبیب اور تمدن و حضارت مشرق کا جاننے والا مورخ تھا، ۱۸۴۱ء میں پیدا ہوا، متعدد ضخیم کتابیں لکھیں، تمدن مصر، تمدن عرب اور اندلس میں عربی تمدن پر کام قابل ذکر ہیں، اس کا شمار ان مغربی مستشرقین میں ہوتا ہے، جو انصاف پسند تھے، اور اسلامی خوبیوں کے قائل تھے، (۲۱) گولڈزیہر، ہنگری کا مشہور و معروف مستشرق (۱۸۵۰ء – ۱۹۲۱ء) کثیر التصانیف محقق تھا،

قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت پر بیشمار دراسات قائم کیے، گولڈزیہر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ نولڈیکی کے نقد حدیث سے آگے بڑھ کر انکار حدیث میں اس کا ہم نوا بن گیا، انکار حدیث کے بعد گولڈزیہر نے سیرت کے دوسرے مصادر کو بھی نشانہ بنایا، (۲۲) ولہاوزن، جرمن مستشرق (۱۸۴۴ء – ۱۹۱۸ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، مختلف موضوعات پر لکھا، تاریخ یہود، محمد مدینہ میں، دین اسلام کے مطالعات، عہد نبوی میں دستور مدینہ، مکاتیب نبوی اور وفود، منقول از ابن سعد مع متن و ترجمہ، وہ پروٹسٹنٹ نقطۂ نظر اور بائبل پہ عبور رکھتا تھا، (۲۳) واشنگٹن ارونگ، معروف امریکی اسکالر اور مستشرق (۱۷۸۳ء – ۱۸۵۹ء) بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، خصوصاً سیرت محمدؐ اور خلفاء پر دو جلدیں جو ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئیں، انکی کتاب حیات محمدؐ کا ترجمہ عربی میں شائع ہوا، (۲۴) یوجین ینگ (Eugen-younge) فرانسیسی مستشرق، متعدد کتابوں کا مصنف، ایک ضخیم رسالہ نور اسلام کی تاریخ، دوسرا مستشرق جس طرح اسے مغرب نے دیکھا، سیرت نبوی بزبان فرانسیسی وغیرہ وغیرہ، انتقال ۱۹۲۲ء میں ہوا،

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ، قرون وسطیٰ ختم ہوئی دماغ بھی بدلتا چلا گیا، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے عزائم اور مقاصد میں فرق نہیں آیا، تاہم دین اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ اور سلوک یکساں نہیں رہا، اور جیسے جیسے عہد جدید کی منزل قریب آتی گئی، مجموعی طور پر ان کے ظاہری رویہ میں معقولیت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا گیا، اور وہ خود یہ محسوس کرنے لگے کہ تعصب اور تشدد کی انتہا پسندی خود ان کے لیے اور ان کی تحریک کے لیے ضرر رساں ہوگی، بہرحال اب ہم اگلے دور میں قدم رکھتے ہیں،

عہد جدید پچھلا دور جو بیسویں صدی کے ربع اول میں اختتام کو پہنچا، جیسا کہ ظاہر ہوا، تحریک استشراق کا نقطۂ کمال ثابت ہوا، اور ہر اعتبار سے استشراقی سرگرمیوں نے فروغ پایا، اب وہ دور جسے ہم عہد جدید سے تعبیر کر سکتے ہیں، بیسویں صدی کے ربع اول سے شروع ہوا، اور تا حال جاری و ساری ہے،

عہد جدید آیا تو اپنے جلو میں نت نئے رجحانات لے کر آیا، اور سیاسی و عسکری اور معاشی و

سماجی سطح پر پچھلی بہت سی باتوں کو زیر وزبر کر گیا، چنانچہ عالمی جنگیں اور اس کے نتیجہ میں مشرقی ومغربی معاشرہ پر ہمہ گیر اثرات، نو آبادیاتی علاقوں کی بیداری، ظلم و استحصال کی تاریکیوں کے خلاف حریت وآزادی کی روشنی، استعماری قوتوں کی شکست و ریخت، ایجادات واختراعات کا ظہور، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظریات کی نمو اور تہذیب و تمدن کے تنوع نے حالات ومسائل کی نوعیت کو بہت کچھ بدل ڈالا، ادھر استشراق کے حوالے سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ تحریک استشراق پچھلے دور میں جس نقطۂ کمال تک پہنچ چکی تھی، ہر کمالے را زوال کے مصداق، غالباً مزید پیش قدمی ممکن نہ رہی، اس لیے یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوا کہ کیا تحریک استشراق رو بہ زوال ہو گئی ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کی کوششوں کا ایک رخ تو یہ ٹھہرا کہ جو کچھ حاصل کر لیا گیا تھا، اسے بہر طور باقی رکھا جائے، دوسری طرف اسلام، پیغمبر اسلام اور عالم اسلام کے اعمال واحوال میں زیادہ انہماک، توجہ اور امعان نظر برتا جانے لگا، جز وقتی اسکالرز کے بجائے کل وقتی علماء نے جگہ حاصل کی اور آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور مغرب کی دوسری جامعات میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور دوسرے اسلامی ومشرقی مباحث کے لیے باقاعدہ نشستیں مخصوص کی جانے لگیں، یہ مطالعہ لازماً خلوص پر مبنی نہیں تھا مگر ان کے اشتغال وانہماک پر ضرور دلالت کرتا ہے، کہ اس سے خال خال مفید نتائج بھی پیدا ہوئے، اور کعبہ کو صنم خانے سے بعض پاسبان بھی مل گئے،

مطالعۂ سیرت کے حوالے سے کسی حد تک اعتدال اور انصاف پسندی کی روایت، جسے ڈیل، گوئٹے اور کارلائل وغیرہ نے آگے بڑھایا تھا، اس عہد میں بھی جاری وساری رہی اور الفانسو، آرچر، ٹائن بی، بلاشیر اور واٹ وغیرہ کے یہاں روایتی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ معقولیت و معدلت کے نمونے بھی نظر آ جاتے ہیں، اسلامی مصادر کی تحقیق و دریافت، ان کی تبویب اور اشاریہ سازی کا کام نہ صرف آگے بڑھا، بلکہ ایک طرف تو مستشرقین نے اس معاملہ میں اپنی محنت و ریاضت سے ایک طرح کی اجارہ داری حاصل کر لی، اور دوسری طرف اسلامی ومشرقی مصادر پر نقد وجرح کے کام کو بھی وسیع پیمانہ پر انجام دیا جانے لگا، یہ غالباً تحریک استشراق کے مزاج سے بھی ہم آہنگ تھا، کہ مصادر وماخذ کا اعتبار اسی طریقے سے اٹھ سکتا تھا، اور مشرقی اذہان وقلوب میں تشکک وتذبذب کے بیج بوئے جا سکتے تھے، اس ضمن میں قرآن وسنت اور دوسرے مصادر

سیرت کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا، اور مآل کار یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس کچھ مفاد پرست سیاسی رہنما تھے، اور مذہبی خلوص و سچائی ان میں بہت کم تھی،

اس عہد میں جو نئے رجحانات پروان چڑھے، ان میں سے چند قابل ذکر ہیں،

بعض مستشرقین نے سیرت نبوی کا مطالعہ طبی اور معالجاتی (Pathological) نقطۂ نظر سے کیا، کچھ نے اس عہد کے معاشی اور سماجی عوامل سے متاثر ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو محض معاشی اور معاشرتی مصلح کی حیثیت سے اہمیت دی، اور کچھ نے ان سب سے مرکب و مرتب نظریہ قائم کیا، یہ تمام نقطہ ہائے نظر در اصل مخصوص ذہنی و فکری پس منظر کی پیداوار تھے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر سے سیرت کے مطالعہ میں یہ موقف قائم کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (فاکم بدہن) نفسیاتی و دماغی امراض کا شکار تھے، انھیں مرگی کے دورے پڑتے تھے، اور ہیری لامنس کی دریافت یہ ہے کہ یہ دورے حد درجہ شہوت کے نتیجہ میں پیدا ہوئے، اس سے پہلے اس نقطۂ نظر کی ترجمانی مشہور برطانوی مستشرق اسپرنگر بھی کر چکا تھا، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر چکا تھا کہ خدانخواستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام اعصاب چونکہ مختل تھا، اور آپ نعوذ باللہ ہذیان و اضطراب اعصابی کے مریض تھے، اس لیے ان کے لائے ہوئے دین اور ان کی سیرت میں اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے، طبی اور معالجاتی نقطۂ نظر کو مزید تقویت ہم عصر مطالعۂ سیرت میں علم النفس کے اصول کے اطلاق سے ملی، اس کے تحت اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرت کی نفسیاتی تحلیل کی کوشش کی گئی اور اس معاملہ میں فرانز بہل (Franls Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) نے سبقت دکھائی، اور حق ترجمانی ادا کیا،

زیر بحث دور میں جن نئے رجحانات اور نئی تحریکوں نے جنم لیا، ان میں اشتراکی نقطۂ نظر کو خاص اہمیت حاصل ہے، مارکس اور اینجلز کے خیالات اور تاریخ کی مادی تعبیر نے اپنا حلقۂ اثر پیدا کیا، اور ایسے مستشرقین آگے آئے جن کی نظر میں اسلام کی اشاعت و فروغ اور پیغمبر اسلام کی کامیابیاں در اصل سیاسی سماجی اور معاشرتی عوامل کی کارفرمائیوں کا نتیجہ تھیں، چنانچہ اس ضمن میں جرمن مستشرق ہیوبرٹ گرائم (Hubert Grime) کا نام معاشی نظریہ کے ارتقاء کی علامت بنا، اسلام اور پیغمبر اسلام پر اس کی دو کتابیں شائع ہوئیں، اس کی تحقیقات

کا خلاصہ [illegible] کہ اسلام کو ایک مذہبی و دینی نظام کی بہ نسبت ایک سماجی اشتراکی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر کے بجائے صرف ایک سیاسی، سماجی اور معاشی مصلح سمجھنا چاہیے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی نقطہ ہائے نظر کا رنگ مارگولیوتھ نے اور گہرا کیا۔ [illegible] اس نے اپنے مطالعہ سیرت میں آنحضرت کو محض ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا، اور اپنی کتابوں اور مقالات میں یہاں تک لکھا کہ مکہ میں ابتدا سے لیکر مدینہ میں ایک [illegible] تک تیئیس[23] سال کا عرصہ لگایا، پھر دریدہ دہنی کی انتہا کرتے ہوئے آنحضور کو نعوذ باللہ ڈاکوؤں کا سردار اور مدینہ کا ظالم اور مستبد حکمران [illegible] کہنے میں تکلف نہیں کیا، اطالوی مستشرق پرنس لیون کتانی نے اپنے دلچسپ کام کا حاصل یہ قرار دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک چالاک سیاستدان تھے، اور انھوں نے معاشی وسیاسی مفادات کی خاطر مذہبی داعیات کو قربان کر دیا تھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے، کہ (نعوذ باللہ) محمد پکے مسلمان پرست تھے، اور اپنی سیاست میں انھوں نے اپنی مذہبیت کو پس پشت ڈال دیا تھا، مطالعہ سیرت میں انتہا پسندی خلاف حقیقت بھی تھی، اور خود دیگر مستشرقین میں سے بھی بعض نے اسے پسند نہیں کیا، تاہم مستشرقین نے بین بین رویہ اختیار کیا، مثلاً عہد جدید کا مشہور مورخ ٹائن بی اپنی عظیم الشان تصنیف مطالعہ تاریخ میں دنیا جہان کی تہذیبوں کا مطالعہ کرتا ہے، اور واقعات سے اصولوں کو اخذ کرتا ہے، پھر اسلام کے بارہ میں بھی عمومی طور پر معتدل رویہ کا اظہار کرتا ہے، لیکن جب سیرت رسول پر قلم اٹھاتا ہے تو آپ کی حیات طیبہ کو دو[2] مراحل میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک پہلا مرحلہ تو وہ ہے، جب کہ آنحضور کا قیام مکہ میں رہا، اس دوران میں بقول ٹائن بی آپ کلیتہً مذہبی مشنری سرگرمیوں میں منہمک رہے، لیکن دوسرے مرحلہ میں پہونچ کر انہوں نے بقول ٹائن بی مذہبی مقاصد سے الگ ہو کر سیاسی سرگرمیوں کو جاری کیا، وہ بہرحال اس خیال کی پرزور تردید کرتا ہے کہ آنحضرت ایک ہردیا تھے، ٹائن بی کے افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک حضرت مسیح ایک مثالی پیغمبر تھے، بلاشبہ حضور کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کے مصادر سے بحث کرتا ہے، اور غلو سے بچتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ احادیث وسیر کے ذخیرے میں بہرحال ایک حصہ ایسا ہے جسے جدید تکنیکی طریقوں سے جانچ پرکھ کر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے، اسی قسم کا نقطہ نظر منٹگمری واٹ کا بھی ہے، مطالعہ سیرت کے ضمن میں واٹ نے متعدد کتابیں

تحریکیں، واٹ کی تصنیفات کو بہر حال آخری جدید ترین کوششوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ان کے نزدیک مصادر نے جہاں تک اجازت دی، اپنی دانست میں ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی، واٹ کے کام کی خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں "علمیت" نے جو ترقی کی ہے، اس کا مظاہرہ ان کی تصانیف میں نظر آتا ہے، اور اس کی تصانیف اسلامی مآخذ کی جدید ترین دریافت اور جرح و تنقید کے جدید اصولوں کی عکاسی کرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واٹ کا موقف ٹائن بی کے موقف سے زیادہ مختلف نہیں ہے کہ وہ بھی آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو مکہ و مدینہ میں مختلف سمجھتا ہے،

بہر حال عہد جدید کا یہ مجموعی جائزہ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے، کہ عہد جدید کے مستشرقین اگرچہ اپنے انداز تحریر، اپنی علمیت اور طرز ہائے تحقیق میں اپنے اسلاف سے بہت مختلف ہو گئے ہیں، اور بہت سے معاملات میں انھوں نے بالکلیہ رجوع کر لیا ہے، تاہم یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تمام تر جدیدیت کے علی الرغم تحریک استشراق کا اصل محرک جذبہ اب بھی کار فرما حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ عہد جدید کا ایک مصنف فرانسسکو جبریلی اپنی زبان قلم سے یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ "پرانی دشمنی عہد جدید میں بھی جاری رہی"، علاوہ ازیں اس صورت حال میں ایک اور جدید ترین مصنف ایڈورڈ، ڈبلیو، سعید کا یہ تجزیہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے، کہ استشراق اور اس کی تحریک کا اہتمام و انضباط بنیادی طور پر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ایک سیاسی ضرورت کے تحت ہوا (اورینٹلزم ص ۲۰۴ و ۲۰۱) اور استشراق کو جہاں مشرق پر اس وقت مسلط کیا گیا، جب کہ مشرق، مغرب کے مقابلہ میں مغلوب و منفعل تھا، اور پھر "قوت و ضعف" کے اسی تفاوت نے بعض لازمی نتائج پیدا کر دیئے (ایضاً ص۲۰۴) استشراق کے درحقیقت دو چہرے، دو رخ ہیں، ایک اس کا داخلی اور پوشیدہ پہلو ([illegible]) اور دوسرا ظاہری، خارجی رخ ([illegible]) پہلا داخلی رخ تو ہمیشہ ایک ہی جیسا کبھی کسی زمانہ میں نہیں چھوا گیا، جب کہ دوسرا ظاہری پہلو متغیر ہوتا رہا، یعنی مشرقی معاشرہ و تہذیب، زبان، ادب، تاریخ، معاشرت وغیرہ کے بارے میں خیالات و افکار بدلتے رہے، مختصر یہ کہ مستشرقین کے خیالات میں تبدیلی اسی ظاہری استشراق کی وجہ سے آتی رہی، لیکن داخلی جذبۂ استشراق ہمیشہ آج تک یکساں محکم و مستحکم رہا، اور کسی واضح تبدیلی سے آشنا نہیں ہوا (ص ۲۰۶) بہر حال دور جدید کا استشراق

کسی مثبت اور تعمیری ہدیہ اور سلوک و دستور کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مغرب کی جاری کردہ مؤثر علمی روایت ہے (ایضاً ص ۲۰۳)

عہد حاضر کے اس مختصر علمی جائزہ کے بعد مناسب ہے کہ اس دور کے چند مشاہیر مستشرقین کا تعارف پیش کر دیا جائے۔

(۱) مونٹے (Montet, ed) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۷ء) اس کی علمی یادگاروں میں اسلام حال و مستقبل (مطبوعہ پیرس ۱۹۱۰ء) الاسلام (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) تاریخ اسلام (مطبوعہ ۱۹۱۳ء) اور فرانسیسی میں ترجمۂ قرآن (مطبوعہ ۱۹۲۹ء) شامل ہیں، (۲) گاڈ فرے ڈی ممبائن (Gaudefroy-Demombynes, m. Frey de Mombynes) فرانسیسی مستشرق زمانہ (۱۸۶۲ء، ۱۹۵۷ء) پیرس میں مشرقی علوم والسنہ کے شعبہ میں عربی کا استاذ، متعدد کتابوں کا مصنف مثلاً اسلام میں نظم (۱۹۲۱ء) کہ و حجم (۱۹۱۸ء) عالم اسلامی اور بازنطینی صلیبیوں تک (۱۹۳۱ء) وغیرہ (۳) کارلو الفانسو نل لینو، اطالوی مستشرق زمانہ (۱۸۷۲ء، ۱۹۳۹ء) بے شمار مصنفات و مطبوعات اس سے منسوب ہیں، مثلاً منتخبات القرآن (لیپزگ ۱۸۹۳ء) اسلام سے پہلے قبائل عرب کی تکوین و ترتیب (۱۸۹۳ء) تاریخ یمن، قبل اسلام (۱۹۲۷ء) ممالک عرب کی اسلام کے بعد عصر حاضر تک تاریخ، جغرافیہ، ثقافت، عادات، اسماء قبائل، و تراجم رجال، فہرست مخطوطات اور شخصیات کی تحقیق، رواۃ، روایت اور مصادر کی تحلیل وغیرہ، اور حیات محمدؐ جو ان کے انتقال کے بعد روم سے ۱۹۴۹ء میں شایع ہوئی، (۴) سر تھامس آرنلڈ، انگریز مستشرق زمانہ (۱۸۶۴ء، ۱۹۳۰ء) اُنکی مشہور ترین کتاب دعوت اسلام ہے (مطبوعہ لندن ۱۸۹۶ء) (۵) رابرٹ بریفالٹ (Briffault, Robert) برطانوی مستشرق، انگریز سرجن اور ناول نگار، مشہور ترین کتاب "دی میکنگ آف ہیومینیٹی" تھی (۶) اسٹینلے لین پول، مشہور برطانوی مستشرق، (زمانہ ۱۸۵۴ء، ۱۹۳۱ء) مورخ، ماہر اثریات، برٹش میوزیم میں پرانے سکوں کا محافظ (۱۸۷۴ء، ۱۸۹۲ء) تاریخ مسلمانان اندلس پر خاص کام ہے، (۷) نکلسن، مشہور برطانوی مستشرق، متعدد تصانیف کا مصنف لیکن خاص کتاب عرب کی ادبی تاریخ (مطبوعہ لندن و نیویارک ۱۹۰۷ء) اور اس کا مضمون محمدؐ اور قرآن، نیز محمدؐ کی ایک نامعلوم سوانح،

مکلس کا زمانہ (۱۸۷۶ء ۔ ۱۹۳۵ء) ہے (۸) نولڈیکی، مشہور جرمن مستشرق (زمانہ: ۱۸۳۶ء ۔ ۱۹۳۰ء) تصنیفات زیادہ تر سامی زبانوں پر اور تاریخ اسلام پر، نیز قرآن کی اصل اور ترکیب پر بحث، نقد حدیث کے اصول کا [illegible] سیرت پر ایک کتاب کا مصنف (مطبوعہ ۱۸۷۳ء) (۹) ہرگرونجے (Hargronje, S.H.) ہالینڈ کا مستشرق (زمانہ ۱۸۵۷ء ۔ ۱۹۳۶ء) اس کے آثار میں، مکہ کا حج، فقہ اسلامی اور سیاست نبوی شامل ہیں، مذہباً عیسائی، زیادہ تر کام ولندیزی زبان میں، ماہر اسلامیات کہا جاتا تھا، اس نے لکھا ہے کہ اسلام اپنی ابتدا سے ہی سیاسی مذہب تھا، بہرحال اسے اسلام کے بارہ میں بہت سی غلط فہمیاں تھیں، اور اس نے سچا اسلام اور سرکاری اسلام کے درمیان فرق مشہور کیا، (۱۰) ونسنک، ولندیزی مستشرق (۱۸۸۱ء ۔ ۱۹۳۹ء) اس کی علمی یادگاروں میں یہود مدینہ کے بارہ میں رسول اللہ صلعم کا موقف، جو اس کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کا موضوع بھی تھا، اور لندن سے ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا، نیز محمد اور یہود، الاسلام (مطبوعہ ۱۹۱۱ء) وغیرہ خاص کتابیں ہیں (۱۱) زاخاؤ، جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۴۵ء ۔ ۱۹۳۰ء) جیسا کہ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ ابن سعد کی طبقات اسی کی کوششوں سے زیور طبع سے آراستہ ہوئی (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۹۲) (۱۲) جوزف ہوروز (J. Horovitz) جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۷۴ء ۔ ۱۹۳۱ء) اپنے ڈاکٹری کے مقالہ میں مغازی واقدی پر قلم اٹھایا (مطبوعہ ۱۸۹۸ء) (۱۳) جوزف ہیل، جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۷۵ء ۔ ۱۹۵۰ء) آثار میں عربی تہذیب پر اس کی کتاب مشہور ہے (۱۴) کارل بروکلمان، جرمن مستشرق (زمانہ ۱۸۶۸ء ۔ ۱۹۵۶ء) بے شمار کتابوں کا مصنف، لیکن مشہور ترین تصنیف تاریخ اقوام اسلامیہ ہے، اس میں آنحضرت پر تحریر قابل ذکر ہے، (۱۵) بارتھولڈ، روسی مستشرق (زمانہ ۱۸۶۹ء ۔ ۱۹۳۰ء) تصانیف کثرت سے ہیں، مثلاً اسلامی تہذیب، تاریخ ترکستان، عالم اسلام، خلفائے راشدین اور [illegible] وغیرہ (۱۶) سموئیل زویمر (S. Zwemer) امریکی نژاد، [illegible] سے ہیں، خاص طور پر مسیحیت اور اسلام کے تعلقات پر، اس کی دیگر کتابوں میں اسلام [illegible] دنیا میں اسلام، حیات محمد، اسلام صحرائے عرب میں، اور وراثت نبوی وغیرہ ہیں، (۱۷) ایچ، جی، ویلز، انگریز مستشرق (زمانہ: ۱۸۶۶ء ۔ ۱۹۴۶ء) افسانہ نگار، ماہر عمرانیات اور مورخ، متعدد تصانیف یادگار ہیں،

خصوصاً دی لیگیسی آف ہسٹری، میں محمد اور اسلام (۱۸) گب، اس عہد کے مشہور ترین برطانوی مستشرق ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا، اور چند سال پہلے وفات ہوئی ہے۔ اس کی تصانیف اگرچہ بہت سی ہیں، مگر اصل شہرت کتاب محمڈنزم سے ہوئی جو ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کے نام کے سلسلہ میں گب نے توجیہات پیش کی ہیں، لیکن یہ توجیہات خود اس کے شاگرد اسمتھ کو پسند نہیں آئیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ گب کے یہاں مختلف نظریات، تصورات اور خیالات میں ارتقاء واقع ہوا، اور وقت و حالات کے تحت بہت سے انداز سے ذہنی انقلابات ہوتے رہے، جس کا ثبوت اس کی مختلف تحریروں سے ملتا ہے، اپنی عمر کے آخری ایام میں بہرحال اس نے اسلام کے بارہ میں ترد... کا اظہار کیا۔ (۱۹) ڈاکٹر ولفرڈ کینٹویل اسمتھ، گب کا شاگرد، جولائی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوا، پی، ایچ، ڈی کی سند ۱۹۴۹ء میں ایک اور مستشرق فلپ ہٹی کی زیرنگرانی تحقیقی مقالہ "تحفۃ الازہر" تجزیہ و تنقید پر حاصل کی، مذہباً عیسائی، متعدد کتابوں کا مصنف، حال پروفیسر میکگل یونیورسٹی کناڈا، (۲۰) جوزف شاخت، جرمن مستشرق، پیدائش ۱۹۰۲ء میں ہوئی، خالص یہودی، اسلام اور علوم اسلامی پر متعدد تصانیف ہیں، لیکن اصل کام قانون اور اصول فقہ اسلامی پر ہے، (۲۱) برنارڈ لوئس عہد جدید کا مشہور انگریز مستشرق ۱۹۱۶ء میں لندن میں پیدا ہوا، تصانیف کثرت سے ہیں، لیکن مشہور کتابیں عربس ان ہسٹری، اسلام ان ہسٹری، کیمبرج ہسٹری آف اسلام اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا مقالہ نگار ہے، اسلام دشمنی کے لیے مشہور و معروف ہے، اور آجکل یہودیت اور اسلام دشمنی میں سرفہرست ہے۔

عہد جدید کے مشاہیر مستشرقین کا مندرجہ بالا تعارف اگرچہ مختصر ہے، لیکن تحریک استشراق کے کیف وکم کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے، اور بطور خلاصہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تحریک استشراق اپنے آغاز، عروج وارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد آج کے عہد میں انتشار سے دوچار ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مصنفین اپنی اصل تحریک کو اب بھی سینہ سے لگائے ہوئے ہیں، لیکن رویہ اور سلوک کی وہ یکسانیت بہرحال نظر نہیں آتی جو پہلے ان کا خاصہ تھا، مستشرقین کی نوجوان نسل، زمانہ کے حالات و مسائل کے پیش نظر ذہن و فکر کی نئی تبدیلیوں سے دوچار ہو رہی ہے، ادھر اسلامی دنیا میں سوچ کی نئی لہریں پیدا ہو رہی ہیں، اور بعض جدید مفکرین و مصنفین مشرق کے طریقہ استدلال نے خود مغربی دنیا میں مدوجزر پیدا کر دیا ہے، پھر یہ بات بھی صاف ہے کہ

طاقت وقوت کے سارے اوزان وپیمانے بدل گئے ہیں، استعمار اور استحصال کی رفتار بدل گئی ہے، ان کی ذہنی مرعوبیت پہلے جیسی نہیں رہی، اور اب مشرق بھی آنکھیں کھول کر فلک وفضا اور زمین دیکھ رہا ہے، اس لیے کیا عجب کہ آنے والا زمانہ تحریک استشراق کے کوچ کا بگل بجادے۔ اس لیے بقول ایک مصنف "وقت آگیا ہے کہ اسلامی مفکرین وعلماء اپنے حریفوں کے مدمقابل آئیں اور معاندین ومخالفین اسلام کے خلاف علمی محاذ پر حقیقی معرکہ کے لیے صف آرا ہوں، البتہ معروضیت کا خواہ مخواہ دعویٰ نہ کریں، کہ علمی معروضیت تو درحقیقت فریب نظر (Myth) ہے" (جانس، ٹی ٹینٹ اسلام ص ۸۵ لندن ۱۹۷۹ء)

اسباب ومحرکات | تحریک استشراق نے اپنے آغاز سے لیکر عہد حاضر تک کا سفر جس انداز سے طے کیا ہے، اس کا ایک عمومی جائزہ اگرچہ گزشتہ صفحات میں پیش کیا جاچکا ہے، اور بین السطور تحریک کے اغراض ومقاصد اور محرکات کی بڑی حد تک نشاندہی بھی ہوچکی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے پس پردہ محرکات واسباب کو صاف صاف بیان کردیا جائے۔ چنانچہ بطور خلاصہ ان کو مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے:-

(۱) اسلام اور ادیان غیر میں بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اسلام کا نظریۂ حیات، اس کا نظام فکروعمل، اس کے تہذیب وتمدن کا اظہار، یہودیت، عیسائیت اور دوسرے مشرکانہ مذاہب سے یکسر مختلف ہے پیغمبر دانائے سبل، ختم الرسل نے اسلام کی جو دعوت پیش کی اس نے روز اول سے ہی ادیان باطلہ کی نفی کردی تھی، اس لحاظ سے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دوسرے مذاہب کے علمبردار، اسلام، اہل اسلام اور عالم اسلام کے بارہ میں سخت معاندانہ جذبات رکھتے ہیں، اور اپنے بغض وعناد کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کرتے ہیں، ان کا یہ رویہ اور ان کی شقاوت وقساوت دراصل نظریاتی وفکری بنیادوں پر استوار ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ایک جگہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ "تم دیکھو گے کہ اہل ایمان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہود اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، اس لیے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے (المائدہ ۸۲)"

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے، ان کے پورے گروہ میں نمایاں یہود، نصاریٰ اور مشرکین ہیں، ان کو اسلام

اہل اسلام اور عالم اسلام کی سرفرازی کسی طور پر پسند نہیں، بلکہ وہ ہر آن زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں، اس لحاظ سے تحریک استشراق کی اٹھان، اسلام دشمنی کے زیر سایہ ہوئی اور مستشرقین کی مساعی کا مقصد یہ ٹھہرا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو دنیا کے سامنے کریہہ المنظر بنا کر پیش کیا جائے،

(۲) نظریاتی سبب کے علاوہ ایک سبب تاریخی بھی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب آن کی آن میں پھیلتا گیا، اور اس کے علمبرداروں نے انتہائی مختصر مدت میں اسلام کا پرچم دنیا کے دور دراز علاقوں میں جا کر لہرا دیا، اس پر مستزاد یہ کہ اپنی پیش قدمی میں اسلام نے اپنی راہ کی تمام مزاحمتوں کو اس آسانی کے ساتھ ختم کر دیا کہ دنیائے مغرب آج تک انگشت بدنداں ہے، خاص طور پر اس وقت کی معلوم دنیا کی دو بڑی طاقتوں روم اور فارس کا سر غرور جس طرح سرنگوں کیا، کہ وہ صدیوں خمیدہ رہا، بہرحال اسلام کی تیز رفتاری کے ساتھ وسعت و اشاعت نے جہاں ایک طرف دنیائے مغرب کی مذہبی و نظریاتی دنیا کو پارہ پارہ کر دیا، بازنطینی سلطنت کے زرخیز خطوں (شام، فلسطین، مصر وغیرہ) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، اور چرچ کے مضبوط قلعے فتح ہو گئے، شمالی افریقہ کی فتوحات، اندلس اور سسلی کی عرب فتوحات نے دنیائے مغرب کو زیر و زبر کر دیا، اور یوں اسلام اور مغرب کے درمیان عداوت کی مستقل بنیاد پڑ گئی، یہ تاریخی منظر مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور مخاصمانہ کارروائیوں کا بھی نقطۂ آغاز ثابت ہوا،

(۳) حملات صلیبی: اگر ہم تحریک استشراق کا فوری سبب قرار دیں تو غلط نہ ہوگا، صلیبی جنگوں کو تاریخ یورپ بلکہ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے، اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے البتہ اس قدر نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دنیائے اسلام کے خلاف دنیائے یورپ کی متحدہ کوششیں چونکہ ناکام و نامراد ہوئیں، اور ۱۰۹۶ء سے ۱۲۹۲ء تک کے معرکہ ہائے صلیب و ہلال کے نتائج ارباب کلیسا کے حق میں اچھے نہ نکلے، اس لیے انھوں نے عسکری محاذ پر شکست کھانے کے بعد گویا یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو شکست دینے کے لیے علمی و فکری محاذ کو منظم کیا جائے، یہی فیصلہ بالآخر تحریک استشراق کی شکل میں سامنے آیا، اس سلسلہ میں [illegible] کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے، کہ "فوجی اعتبار سے تو اب صلیبی جنگیں ختم ہو چکی ہیں، مگر یورپی لوگ دین اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب کے بارہ میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے، ان میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے،

ایک فرانسیسی (pierremortino) اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "جب عیسائی ترکوں کے خلاف جنگ ہار گئے تو وہ ہرزہ سرائیاں کرنے لگے یہاں تک کہ انھوں نے عیسائیت کی شکست کا بدلہ میدانِ ادب میں لے لیا" چنانچہ تحریک استشراق کی صورت میں اہل یورپ اور ارباب کلیسا کی تمنائیں پوری ہوئیں اور اس طرح تحریک استشراق کے جلو میں دنیائے مغرب کا یہ منظم حملہ واقعۃً عسکری محاذ کے صلیبی حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا، مختصر یہ کہ اسلام دشمنی کی جو چنگاریاں پہلے سے دبی ہوئی تھیں وہ لپکنے لگیں اور رفتہ رفتہ ان کی آتش عداوت و حسد امن مشرق کو جلانے لگی،

(۴) مستشرقین من حیث المجموع چاہے قدیم ہوں یا جدید، مغرب کے ہوں یا مشرق کے، اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے بہر حال یہودی، عیسائی اور مشرک ہی رہے ہیں، گویا اختلاف دین و مذہب کی بنا پر ان کے تنگ و خیالات تو پہلے سے ہی مذہبی بغض و عداوت (Religious Enmity) کے آئینہ دار تھے، اس پر مستزاد یہ امر ہوا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے حقیقی ماخذ سے دور اور ان سے بے خبری اور عدم واقفیت کا شکار رہے، اس کا واضح نتیجہ ایک صورت میں سامنے آیا کہ اسلام اور داعی اسلام کے بارے میں کم و بیش انیسویں صدی کے اواخر تک دانستہ یا نادانستہ پردہ جہالت کے پیچھے رہے اور پھیلاتے رہے، وہ صرف ظن و تخمین اور وہم و گمان کی پیداوار تھا، چنانچہ بے سروپا روایات، من گھڑت باتیں، فرضی افسانے، لغو قصے، کہانیاں اور اسی طرح کا بلا تحقیقی خام مواد مستشرقین، اسلام اور پیغمبر اسلام کی تخریب اور تصویر پیش کرنے کے لیے بڑی دلیری کے ساتھ بے دریغ استعمال کرتے رہے، (جس کا اندازہ تاریخی ماخذ میں بھی سامنے آتا ہے، اور کچھ جھلکیاں آئندہ فصل میں سامنے آئیں گی) پھر دوسری طرف جب جہالت و بے خبری کا پردہ چاک ہوا اور مستشرقین اسلامی ماخذ کی تحقیق و تفتیش میں منہمک ہوئے، تب بھی انہوں نے دانستہ طور پر قرآن و احادیث سے کھیلنے میں کوئی تکلف نہیں کیا، نیز مشرقی مصادر کی ترتیب و تبویب کے سلسلہ میں تمام محنتوں کے باوجود ایسی قسم کی غلطیاں کرتے رہے، (سیرۃ النبیؐ از مولانا شبلیؒ ج اول ص ۱۱۰-۱۱۱) بہر حال ان تمام باتوں کا مقصد ایک تھا، یعنی ملک و مذہب کو نہیں بلکہ اسلام اور سرور عالم کے بارے میں مسلمانوں کے اعتقاد کو ٹھیس پہنچانا اور انھیں آمادۂ بغاوت کرنا، اسی کا ایک پہلو یہ تھا کہ مستشرقین اپنی تحقیقات کے پردہ میں بتوں کے

معتقد "ایسے خیالات کو نہایت موثر طور کے ساتھ اسلام کے نظام فکر میں داخل کر دیں جن کا ادراک راسخ العقیدہ
لوگوں کے سوا دوسرے نہ کر سکیں، انھوں نے یہ خیال کر لیا کہ ان کی تحقیقات سے مرعوب ہو کر ان کی ہر بات
کو بلا چون و چرا درست مان لیا جائے گا، چنانچہ علوم اسلامی کا ہر میدان انھوں نے اپنی جولانگاہ کے لیے
منتخب کیا، اور علوم اسلامیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں انھوں نے خلط مبحث
کا کام نہ لیا ہو۔"

(۵) مسلمانوں کا زوال و انحطاط بحیثیت مجموعی تحریک استشراق کے فروغ کا باعث ہوا، ادھر عالم اسلام سیاسی انتشار کا شکار ہوا، اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا، اور پھر سیاسی انحطاط، معاشرتی و اخلاقی زوال اور تہذیب و ثقافت کے تنزل کا باعث ہوا، تو ادھر مسیحی یورپ کی ہمتیں بلند ہوئیں، بلکہ اندلس کو مسلمانوں کے ہاتھ سے واپس لے کر تو اتنا غرور پیدا ہوا کہ صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا، پھر پندرھویں صدی عیسوی کے بعد سے انھیں سیاسی عروج حاصل ہونے لگا، تو اقوام یورپ نے ایشیا، افریقہ اور دوسرے مشرقی علاقوں پر قبضہ جمانا شروع کر دیا، اور یوں استعماریت کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی، اس کا نتیجہ واضح تھا، مغربی تہذیب کا غلبہ ہوتا چلا گیا، اور مغربی تمدن اپنا اثر جمانے لگا، تو مسلم ثقافت مغلوب ہونے لگی، اور تمدنی چمک دمک ماند پڑ گئی، اور اسی طرح مستشرقین کو موقع ملا کہ وہ اپنے ہتھیار تیز کر لیں، انھوں نے مسلمانوں کی زبانیں سیکھیں، ان کے افکار و علوم سے واقفیت حاصل کی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کے مآخذ کو استعمال کر سکیں اور یوں اپنی تحریک کو آگے بڑھا سکیں،

(۶) پندرھویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے پھر انگڑائی لی، اس کے عہد تاریک کا خاتمہ ہوا، اور ان کے ہاں علم و تحقیق، بیداری، تہذیب و تمدن کی ترقی کا دور شروع ہوا، یہ ان کے سیاسی فروغ سے ہم آہنگ تھا، اور انہیں ضرورت تھی کہ ایشیا اور افریقہ میں انھوں نے اپنی جو کالونیاں قائم کی ہیں، انہیں مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے مادی وسائل اور واسطے سے زیادہ توجہ علمی و ذہنی کاوشوں پر صرف کی جائے، چنانچہ استعمار مغرب کے تحفظ کے لیے بجائے خود تحریک استشراق کی سرگرمی ناگزیر تھی، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے مفتوح ممالک کے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور تحقیقات کے پردہ میں اپنے مقاصد کو پورا

کرنے کے لیے یورپی حکمرانوں کی تحریک استشراق کی مکمل سرپرستی کی، یہ سرپرستی صرف مالی صورت میں نہیں تھی بلکہ مستشرقین کو وہ تمام سہولتیں مہیا کی گئیں، جو ان کی تحقیق و تفتیش کے لیے ضروری تھیں۔

(۷) مذہبی و سیاسی محرکات کے ساتھ تجارتی مفادات بھی تحریک استشراق [illegible] اقوام یورپ اور مشرقی ممالک میں رابطہ کی ابتداء تجارتی تعلقات سے ہوئی تھی، پھر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہی تجارت بالآخر سیاسی و مذہبی [illegible] استشراقی مرکز بنے، کہ نتیجہ میں کتابوں کی اشاعت ہوتی رہی، مورخین کی کتابیں [illegible] اور مستشرقین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوا، یورپ کے تجارتی مفادات [illegible] کا باعث بھی ہوا۔

اسباب و محرکات کا یہ مختصر سا تجزیہ تحریک استشراق [illegible] کو سمجھنے اور ان کے اثرات و مقاصد کو جاننے کے لیے کافی ہے۔ [illegible] مستشرقین کے اعتراضات، الزامات اور مفتریات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کس طرف [illegible] سید الانبیاء والمرسلین ﷺ کو (نعوذ باللہ) مجروح کرنے کی [illegible]

اعتراضات، الزامات، مفتریات و ہفوات

مستشرقین کی جانب سے اسلام کی بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جو [illegible] اب تک سیرت رسول ﷺ کے حوالے سے کیا اعتراضات [illegible] ممکن نہیں کہ اعتراضات و الزامات کی [illegible] جاتے ہیں۔ ان کے ان الزامات و اعتراضات کی حیثیت [illegible] الزامات [illegible] کرکے (خواہ وہ کتنے ہی بے بنیاد کیوں نہ ہوں) سیرت رسول ﷺ کے بارے میں [illegible] کی حکمت عملی کا مستقل [illegible] حصہ رہی ہے، کیونکہ [illegible] وہ افراد جن کا [illegible] ان کے پروپیگنڈے سے آسانی [illegible] مستشرقین کے تمام اعتراضات و الزامات کو مرتب کرکے ان کا مدلل جواب دیا جائے، لیکن اس کی [illegible]

موقع نا ہم ذیل میں ہم مختصراً سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے مستشرقین کے اعتراضات والزامات کا مختصراً کو نقل کر رہے ہیں، تاکہ عام قارئین یہ اندازہ کر سکیں کہ سیرت نبوی کے باب میں مستشرقین نے کیا کیا گل کھلائے ہیں اور کیسے کیسے الزامات و اعتراضات عائد کیے ہیں، ان میں سے بیشتر اعتراضات ایسے ہیں جن کے بودے پن کو عام پڑھا لکھا مسلمان بھی محسوس کر سکتا ہے،

نام، حسب نسب (۱) یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام کا نام نامی اسم گرامی "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) نہیں تھا، بلکہ ماہومٹ (Mahomet) تھا، بعض نے طنز کی انتہائی کر دی اور اس کے ساتھ "ماہومد" (Mahound) یعنی بقول ان کے "شہزادۂ تاریکی" کا نام دے دیا، اور بعض کے نزدیک "بافومٹ" (Baphomet.) اور "بافر" (...) تھا، (۲) لانڈمات (Landmark) کہتے العیاذ باللہ اس الزام کو ... بڑی شدومد کے ساتھ اپنی کتاب "دی اینڈ ہی ... آف اسلام" مطبوعہ لندن ص ۳۷۴ میں پیش کیا ہے ... الزام کو نہ صرف یہ کہ مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم میور نے (لائف آف محمد اینڈ ہسٹری آف اسلام ص CXIV/CXV) میں مسترد کر دیا، بلکہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی شریف النسب تھے، عرب کے شریف ترین گھرانے کے فرزند تھے، آپ کے جد امجد ہاشم تھے جن کے ذمہ شہری حکومت کی کم سے کم اہم ذمہ داری تھی، اور وہ اس پائے کے آدمی تھے کہ رومی امراء اور غسانی شہزادے ان سے معاہدہ کیا کرتے تھے (ملاحظہ ہو: صدیقی، مظہر الدین ص ۱۴۳) (۳) حضور دراصل خود ایک مسیحی پادری (Cardinal) تھے، خواہش تھی کہ پوپ منتخب ہو جائیں، یہ تمنا پوری نہ ہوئی تو انتقاماً رومی کلیسا سے تعلق منقطع کر لیا، اور عیسائیت کے بالمقابل ایک نئے مذہب "اسلام" ایجاد کر لیا اور اپنے آپ کو مخالف پوپ قرار دے لیا، (۴) دنیائے مسیحیت میں نئے فرقے کے بانی تھے، (۵) مخالف مسیح (Anti-Christ) تھے اور دشمن عیسائیت تھے، (۶) ترکوں کے پیغمبر تھے، (۷) بت پرست تھے (نعوذ باللہ) (۸) خود اپنے آپ کو مرکز پرستش قرار دے لیا تھا، (۹) آپ بقول ایک مصنف "عرب منافق و ناپاک تھے"، (۱۰) جین برڈ (Genebrard) کے نزدیک (خدانخواستہ) آپ حیوان تھے (Beast) اور صرف حیوانی زبان یعنی عربی جانتے تھے، جو ان کے حیوانی ماحول کے لیے مناسب تھی۔

(۱۱) آپؐ (حاشا اللہ) شہوت پرست (Lesciroue) تھے، خود بھی لوٹ تھی، اپنے پیروکاؐ ان کو بھی لوٹ کیا، (۱۲) دھوکہ باز، مکّار، کاذب، جھوٹے، خوفناک حد تک بے شرم تھے (استغفراللہ) (۱۳) وہ ایک ہنرمند، مکمل سیاستداں تھے،

نبوت و رسالت | نبوت نتیجہ تھی ان کی طویل خود خیالی (Auto Sug estion) یا خود ایحاذ ہی اور القائے نفس کا، (۱۵) وہ خواب بہت دیکھا کرتے تھے، وحی بھی بطور خواب دیکھا کرتے تھے، (۱۶) وہ بزعم خود اس خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا، بہر حال دوسروں کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ان پر وحی اترتی ہے، محمدؐ نے ایک سفید دودھیا رنگ کے کبوتر یا فاختہ کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا رہتا اور وقفہ وقفہ سے چونچ مار مار کر ان کے کان میں سے دانے چگا کرتا تھا، اور اس طرح وہ دوسروں پر یہ تاثر قائم کرتے تھے، کہ فرشتۂ ربّانی (جبرئیلؑ) ان پر وحی نازل کر رہا ہے، اور انہیں املا کرا رہا ہے، (۱۷) انہیں نعوذ باللہ، اعصابی مرض لاحق تھا، اور وہ توہمات، فریب حسّی میں مبتلا تھے[1]، (۱۸) نزول وحی کے وقت مرگی کا دورہ پڑتا تھا[2]، (۱۹) مرگی زدہ تو نہیں البتہ جنونی ضرور تھے، کیونکہ وہ غیر متوازن ذہنی مزاج والے آدمی تھے[3]، (۲۰) اعصابی دورے پڑتے تھے اور وہم ہوتا تھا کہ تابع الہام ہیں، یہ نولڈیکی کے ذہن کا اختراع اور بوالعجبی ہے، (۲۱) اپنے الہامی اور الہیاتی مشن کے بارے میں خود مشکوک و متذبذب تھے، میور کے نزدیک ابتداءً، انہیں بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے فرستادہ ہیں، البتہ ایک طویل عرصہ تک شک و تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر آمادہ بہ تبلیغ ہوئے، (میور، لائف آف محمد، ۱۹۲۳ء ص ۴۶-۴۷)

یہ الزام سراسر واقعات کے خلاف ہے، اور تاریخی اعتبار سے گمراہ کن ہے، اگر ذرا بھی تذبذب ہوتا تو اپنی زوجۂ محترمہ خدیجہ رضؓ کو، اپنے بھائی علیؓ کو، اپنے جگری دوست ابوبکرؓ کو کیونکر مطمئن کرتے، (۲۲) مذہبیت اور الہیات کی تشکیل میں شام کے مسیحی اثرات کو بڑا دخل تھا، (۲۳) ان کو بائبل کی تعلیمات کا علم تھا، (۲۴) نبوت کا تسلسل

---

[1] حماد کے ص ۶۵ [2] ایضاً، عہد حاضر کا مستشرق، واٹ اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ الزام صریحاً بے بنیاد ہے (محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹس میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۱ء ص ۱۹) تفصیل کے لیے دیکھیے صدیقی مظہر الدین ص ۱۴۴ - [3] حماد کے ص ۷۳،

برقرار نہیں رہا، یہ منٹگمری واٹ کا مفروضہ ہے، اس کی دلیل یہ دی ہے کہ مدنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں کبھی حضور نے یہود مدینہ سے مطالبہ نہیں کیا تھا کہ وہ ان کو نبی و رسول کی حیثیت سے تسلیم کرلیں، (ملاحظہ ہو تفصیل جناب مظہرالدین صدیقی کا مضمون، اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد، جلد ۹ نمبر ۳)

(۲۵) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن کے نعوذ باللہ خیال میں نبی کاذب تھے، (۲۶) وہ نعوذ باللہ مکار و دغا باز کاذب تھے، (۲۷) شیطان کے آلۂ کار، اور اس کے تو ہین آمیز جاسوس تھے، (۲۸) ترویج و اشاعت مذہب کے لیے تلوار کا سہارا لیا، (۲۹) اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا، (۳۰) حتّی (Hitti) کے خیال میں حضور کے ابتدائی حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور لامنس کے نزدیک ان کی زندگی کے حالات محض افسانہ (Fictoon) ہیں (۳۱) اصل استفادہ عیسائیت سے کیا، چنانچہ مسیحی نسطوری راہب بحیرہ سے خاص ملاقات رہی، (۳۲) مستشرقین کے نزدیک ایک مضمون عام و ذہنی الزام یہ ہے کہ آنحضرت کی زندگی مکہ تک پیغمبرانہ رہی لیکن مدینہ جاکر بادشاہی میں بدل گئی، اور قریش کشی انتقام خونریزی کا بازار گرم کردیا،

کارہائے نبوت و رسالت، واقعات سیرت

(۳۳) دنیا داری کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی اختیار کی، (۳۴) میور لکھتا ہے "کارنبوت کی ابتدا میں تو ایمانداری سے یہودی اور عیسائی طور طریقوں اور نظام کو اپنایا گیا اور اپنے مذہب کی انہیں بنیاد بنایا گیا، لیکن جب مطلب حاصل ہو گیا اور اقتدار حاصل ہو گیا، تو ان سے برأت ظاہر کی اور پھر انہیں بالکل مردود قرار دے دیا، (۳۵) اسلام کو یہودیت سے بدلنے کی کوشش کی، واٹ لکھتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ جاکر یہ کوشش کی کہ اسلام کو مذہب قدیم "یہودیت" سے بدل دیا جائے، (۳۶) تحویل قبلہ (ایک خاص وقت کے بعد یہودیت و عیسائیت سے بیزاری کی کوشش) ہے، (۳۷) شاید اسلام یہودیت کا ایک حصہ یا فرقہ بن جائے، (۳۸) محمد نے مسلمانوں کو اپنے آپ کی پرستش کی دعوت دی، (۳۹) منشور مدینہ (Chorter of Medineh) میں حضور کا مقام و مرتبہ غیر معین تھا، (۴۰) حضور کی ہجرت سے قریش مکہ بڑے خوش ہوئے، مارگولیتھ لکھتا ہے کہ "عین ممکن ہے کہ قریشی سردار (محمد کی ہجرت کے بعد) آپس میں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے ہوں، کہ وہ اپنے تکلیف دہ وطن سے بغیر کسی خون خرابے کے نجات پاگئے" (صدیقی مظہرالدین ص ۱۴۸ تا ۱۵۰) مارگولیتھ کی یہ خیال آفرینی بھی تاریخی واقعات کے بالکل خلاف اور لغو ہے، (۴۱) محمد نے قریش مکہ

کو (بلاوجہ) اپنے خلاف بھڑکایا،[۵۱] (۴۲) غزوات محض لوٹ مار کی مہمیں تھیں،[۵۲] اور عربوں کی غربت و تنگ دستی دور کرنے کا ذریعہ (۴۳) بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ کا لایا ہوا انقلاب اور مذہبی اصلاحات اس لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہاں کا ماحول در اصل ان کے موافق اور مناسب تھا، اور اہل عرب مذہبی معاشرتی تبدیلی کے متلاشی اور پیاسے تھے، (۴۴) جنگ موتہ، اس جنگ کا مقصد متعین کرنا مشکل ہے۔

متفرقات | (۴۵) ٹائن بی کے خیال میں آنحضرتؐ محض قیصرِ عرب تھے، ایک سیاسی لیڈر تھے، (۴۶) جے سی آرچر کے نزدیک محمدؐ محض ایک صوفی اور مجذوب تھے، (۴۷) آپؐ (نعوذ باللہ) رہزن، قزاقوں کے سردار (Robber chief) تھے، (۴۸) اسلام ایک بدقسمت تاریخی حادثہ تھا، اور محمدؐ مرگی میں مبتلا ہو کر مر گئے جو شدت بھوک کا نتیجہ تھا، (۴۹) اسلام ایک اشتراکی رجحان تھا اور محمدؐ صرف ایک معاشرتی سماجی مصلح تھے نہ کہ پیغمبر، (۵۰) وہ ایک موقع پرست، مفاد پرست تھے، (۵۱) کثرت ازدواج اور میل الی النساء،[۵۳] عورتوں کے دوست، سنجیدگی اور معقولیت کے دشمن، بہت شادیاں کرنے والے،[۵۴] (۵۲) آنحضرتؐ اور قرآن، تہذیب و تمدن، حریت و آزادی اور سچائی کے بدترین مخالف اور ضدی و سرکش دشمن تھے، کہ ان جیسا دشمن صفحہ ہستی پر نمودار نہیں ہوا،[۵۵] (۵۳) لونڈی غلام بنانے کی اجازت دی اور اس پر عمل بھی کیا،[۵۶] (۵۴) داستان غرانیق، شیطانی آیات، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ایک دفعہ حرم میں نماز ادا کی اور قرآن کی بھی تلاوت کی، اس وقت وہاں کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے سورۂ نجم کی یہ آیت پڑھی، وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى، تو کہا جاتا ہے کہ شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے

---

[۵۲] یہ مستشرقین کا عام الزام ہے، اور وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں، کہ غزوات پاکیزہ جذبات، اعلیٰ وارفع مقاصد اور شوقِ شہادت کا نتیجہ نہ تھے، بلکہ غریب و مفلوک الحال عربوں کی تنگدستی دور کرنے کا ذریعہ اور لوٹ مار کے تحت مال و دولت کے جمع کرنے کا شوق تھا، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو (قریشی، پروفیسر ظفر علی، ماہنامہ اسلامک لٹریچر، ج ۱۷، شمارہ ۵، مئی ۱۹۶۸ء، ص ۷۷، ۸، نیز شمارہ ۹، ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۸۷)، [۵۳] دیکھیے صدیقی مظہر الدین ص ۱۶۳، ۱۶۴، [۵۴] سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۱۴،

[۵۵] صدیقی مظہر الدین ص ۱۶۲ (حضورؐ کی شادیاں) اور تعدد ازدواج کے بارے میں ذاتِ رسالت پر اعتراض مستشرقین کا محبوب ترین موضوع ہے جس کے ذریعہ وہ نعوذ باللہ، آپؐ کی بدمستی اور بوالہوسی ثابت کرنا چاہتے ہیں، انہیں انہیں کوئی خیر یا کوئی عفت اور حکمت نظر نہیں آتی، [۵۶] حماد کے (ص ۴۶) [۵۷] شبلی، ج، ص ۱۱۲،

تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ (یعنی یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے) اس شیطانی آیت کے بارے میں واقعہ کو مستشرقین بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں، اور رائی کا پہاڑ بنا ڈالتے ہیں، (تفصیلات کے لیے دیکھیے سیرۃ النبیؐ ج ا ص ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸،) (۵۵) واقعہ حضرت زیدؓ و زینبؓ، حضورؐ نے اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ کا نکاح کر دیا تھا، لیکن پھر تعلقات قائم نہ رہ سکے اور شکر رنجی بڑھ گئی آخرکار حضرت زیدؓ نے ان کو طلاق دے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رسم جاہلیت مٹانے کے لیے اور حضرت زینبؓ کی دلجوئی کیلئے خود نکاح کر لیا، حضرت زینبؓ کا انتقال ۲۰ھ میں ہوا، مستشرقین کے نزدیک یہ صریحاً بوالہوسی تھی، (۵۶) ان کا آہنی تابوت خانۂ کعبہ میں دو ستونوں کے درمیان معلق رہا، (۵۷) ابتدا میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کیلئے تمام انبیائے بنی اسرائیل کو تسلیم کیا، لیکن جب قوت و اقتدار مل گیا تو سب سے بڑے نبی خود بن بیٹھے اور سلسلۂ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا، (۵۸) بانیٔ اسلام سے معجزات کی نسبت محض انبیائے ماسبق کے ہم پلہ ثابت کرنے کیلئے قائم کی گئی (۵۹) ایک نیا اور جھوٹا مذہب جاری کیا، حالانکہ یہ انکا خود ساختہ تھا،

اعترافات | اگرچہ گزشتہ فصل کی روشنی میں مستشرقین کا انتہائی بے باکانہ، گستاخانہ اور معاندانہ رویہ بڑی حد تک سامنے آجاتا ہے، تاہم یہ اُن کے مطالعۂ سیرت کا صرف ایک رخ ہے، جو اوّل تا آخر کذب و افترا سے عبارت ہے، ایک دوسرا رخ وہ ہے جس میں مستشرقین کے بعض سرکردہ افراد اپنے تعصب و تنگ نظری کا برملا اعتراف کرتے ہیں، اور جب ذرا انصاف و اعتدال سے کام لیتے ہیں، تو اقرار کرتے ہیں کہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہر عیب سے منزہ، ہر الزام سے مبرا، خَلق و خُلق کی تمام خوبیوں سے مرصع دنیائے انسانیت کا حاصل تھی، اور ان کی کامیابیوں، کامرانیوں اور کارناموں کی بنا پر ان کا کوئی مثیل نہیں ہے، اس موضوع پر اگرچہ دفتر کے دفتر نقل کیے جا سکتے ہیں، لیکن ہم یہاں صرف چند نمونوں پر اکتفا کر رہے ہیں،

۱۔ اثر انگیز شخصیت | ۔ جسٹینین کی وفات کے چار سال بعد ۵۶۹ء میں مکہ میں وہ آدمی پیدا ہوا، جس نے انسانیت پر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ (ڈریپر[1])

---

[1] اور ہارٹ کی کتاب: ۔ (The 100 A Ranking of The most heflucut, ofpersons in History.) 1978 (P. 33).

۲۔ ناقابلِ فراموش | ۔ اگر مقصد کی عظمت، وسائل کی قلت اور حیرت انگیز نتائج، ان تین پیمانوں پر انسانی تعقل و تفکر کا معیار بلند مانا جائے، تو کون ہے، جو تاریخ کی کسی قدیم یا جدید شخصیت کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل لانے کی ہمت کر سکے، لوگوں کی شہرت ہوئی کہ انہوں نے فوجیں بنا ڈالیں، قوانین وضع کر دکھائے اور سلطنتیں قائم کر ڈالیں، لیکن غور طلب یہ ہے کہ انہوں نے حاصل کیا کیا؟ صرف مادّی قوتوں کی جمع پونجی؟ وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے لٹ گئی، بس صرف یہی ایک آدمی ایسا ہے جس نے یہی نہیں کہ فوجوں کو مرتب کیا، قوانین وضع کیے اور مملکتیں، سلطنتیں قائم کیں، بلکہ اس کی نظرِ کیمیا اثر نے لاکھوں متنفس ایسے پیدا کر دیے جو اس وقت کی معلوم دنیا کی ایک تہائی آبادی پر مشتمل تھے، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انھوں نے قربانگاہوں کو، خداؤں کو، دین و مذہب کے پیروکاروں کو، خیالات و افکار کو، عقائد و نظریات کو، بلکہ روحوں تک کو بدل ڈالا، صرف ایک کتاب کی بنیاد پر جس کا لکھا ہوا ہر لفظ قانون تھا، ایک ایسی روحانی امت کی تشکیل کر دی گئی جس میں ہر زمانے، وطن، قومیت کا حامل فرد موجود تھا، وہ ہمارے سامنے مسلم قومیت کی ایک ناقابلِ فراموش خصوصیت یہ چھوڑ گئے کہ صرف ایک ان دیکھے خدا سے محبت، اور ہر معبودِ باطل سے نفرت (لامارٹین، Histo-iry (deca Turqui، ج ۲ ص ۷۷-۲۷۶، پیرس ۱۸۵۴ء)

۳۔ جامعیت کبریٰ | ۔ عالم الٰہیات، فصاحت و بلاغت میں یکتائے روزگار، رسول (بانیٔ مذہب) آئین و قانون ساز (شارع)، سپہ سالار، فاتح اصول و نظریات، معقول عقائد کو جلا بخشنے والے، بلا تصویر مذہب کے مبلغ، بیسیوں علاقائی سلطنتوں کے معمار، دینی روحانی حکومت کے موسس، یہ ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جن کے سامنے پوری انسانیت کی عظمتیں ہیچ ہیں) اور انسانی عظمت کے ہر پیمانے کو سامنے رکھ کر ہم پوچھ سکتے ہیں، ہے کوئی جو ان سے زیادہ بڑا، ان سے بڑھ کر عظیم ہو؟ (لامارٹین ایضاً)

۴۔ بے مثال کارنامہ | ۔ کسی انسان نے اتنے قلیل ترین وسائل کے ساتھ اتنا جلیل ترین کارنامہ انجام نہیں دیا، جو انسانی ہمت و طاقت سے اس قدر ماوراء تھا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی فکر کے ہر دائرے اور اپنے عمل کے ہر نقشہ میں جس بڑے منصوبہ کو روبہ عمل لاتے، اس کی صورت گری بجز ان کے کسی کی مرہونِ منت نہ تھی، اور مٹھی بھر صحرائیوں کے سوا ان کا کوئی معاون و مددگار نہ تھا، اور آخرکار ایک اتنے بڑے گردیہ پا

انقلاب کو برپا کر دیا، جو اس دنیا میں کسی انسان سے ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ اپنے ظہور سے لے کر اگلی دو[۲] صدیوں سے بھی کم عرصہ میں اسلام، فکر و عقیدہ اور طاقت و اسلحہ دونوں اعتبار سے سارے عرب پر، اور پھر ایک اللہ کا پرچم بلند کرتے ہوئے فارس، خراسان، ماوراء النہر، مغربی ہند، شام، مصر، حبشہ، شمالی افریقہ کے تمام معلوم علاقوں پر بحر متوسط کے جزیروں پر اور اندلس کے ایک حصّہ پر بھی چھا گیا"۔ (لاما رٹن ایضاً)

۵۔ تاریخ کی پوری روشنی میں ‌‌ ۰۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ کی روشنی میں ہم حیات مسیح کے کچھ واقعات دیکھ سکتے ہیں، لیکن ان تیس[۳۰] برسوں سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے، جو انہوں نے (نبوت سے پہلے) گذارے، جو کچھ ہم جانتے ہیں، اس نے اگرچہ دنیا کی معلومات میں کسی حد تک اضافہ کر دیا ہے، (اور آئندہ مزید انکشافات متوقع ہیں)، تاہم ایک مثالی زندگی، کون جانے کتنی قریب ہے کتنی دور، کتنی ممکن ہے اور کتنی ناممکن؟ ہم ابھی بہت کچھ نہیں جانتے، ہم ان کی ماں کے بارے میں، اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں، ان کے ابتدائی دوست احباب اور ان کے تعلقات باہم کے بارے میں اور اس سلسلہ میں بھلا کیا جانتے ہیں کہ مسند نبوّت پر وہ بتدریج فائز ہوئے یا وحی پا کر یکدم، خدائی مشن کے حامل بن گیے؟ بہر حال کتنے ہی سوال ایسے ہیں جو ہم میں سے اکثر ذہنوں سے ٹکراتے ہیں، مگر وہ بس سوالات ہیں، جواب کے بغیر! البتہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملہ میں صورت یکسر مختلف ہے، یہاں ہمارے پاس اندھیروں کے بجائے تاریخ کی روشنی ہے، ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں جانتے ہیں، جتنا کہ لوتھر اور ملٹن کے بارے میں، یہاں واقعات کا دامن، خیال محض، قیاس تخمین و ظن، ماورائے فطرت روایات اور فسانہ و افسوں سے آلودہ ہونے کے بجائے حقائق سے آراستہ ہے، اور ہم بآسانی معلوم کر سکتے ہیں، کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں کوئی شخص نہ خود اپنے آپ کو دجل و فریب میں مبتلا کر سکتا ہے نہ دوسروں کو، یہاں ہر چیز صداقت کی روشنی میں جگمگا رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ ان کی شخصیت کے بہت سے پرت ہیں اور ان میں سے ہر ایک تک ہماری رسائی ممکن نہیں ہے، تاہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے متعلق ہم ہر چیز جانتے ہیں، ان کی جوانی، ان کی اٹھان، ان کے تعلقات، ان کی عادتیں، ابتدائی حالات، اور پہلی وحی کے نازل ہونے تک کا لمحۂ ذہنی سفر اور ارتقاء وغیرہ، نیز ان کی داخلی اور باطنی زندگی کے متعلق بھی، اور یہ کہ جب اعلان نبوت کر چکے تو پھر ہم ایک ایسی مکمل کتاب پاتے ہیں جو اپنی ابتدا، اپنی حفاظت اور متن وغیرہ کے کئی پہلوؤں کے لحاظ سے بالکل ممتاز

و منفرد ہے، اور اب تک ایسی کوئی معقول و مستند وجہ سامنے نہیں آئی، جس کی بنیاد پر اس کتاب کے خلاف کوئی شدید اعتراض کیا جا سکے۔" (باسورتھ اسمتھ محمد اینڈ محمڈنزم، سندھ ساگر اکاڈمی لاہور، ص ۱۲-۱۱)

۶۔ انقلاب، انقلاب، انقلاب | بہرحال مختصراً عرب کے یہ معاشرتی اور مذہبی حالات تھے، جن میں اگر ہمیں والٹیر کی زبان کے استعمال کی اجازت دی جائے، عرب کا رُخ بدل گیا، انقلاب آ گیا، انقلاب بھی کیسا؟ ایسا انقلاب کہ آج تک کسی سرزمین پر نہیں آیا، مکمل ترین، اچانک ترین اور سرتاسر غیر معمولی انقلاب! (باسورتھ اسمتھ الیضاً ص ۶۲)

۷۔ منفرد مقام | "تاریخ مذاہب و ادیان میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک منفرد مقام حاصل ہے، وہ نہ ولی تھے نہ فرشتہ، اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ بھی کر کے دکھایا، اس میں کوئی مافوق البشریت نہ تھی، اور ان کی عظیم شخصیت میں انسانی عمل کے اعتبار سے کوئی ایسی چیز نہ تھی، جو عام حالات میں ان کو دوسرے مسلمانوں سے ممتاز و ممیز کر سکے۔" (بوڈلے دی مسیج، ۱۹۴۶ء، ص ۳۳۸)

۸۔ سب سے بڑا انسان | "دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے، جس نے دس برس کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت، ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا، اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا۔ وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے، جس کو اس نے قائم کیا، ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیّا کر دیئے۔" (مولانا سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبیؐ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۵۱ء ج ۴ ص ۴۰۰) نیز بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا، کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک مسیحی عالم (داؤد مجاعص) نے یہ تبصرہ لکھا تھا۔

۹۔ عظیم و مخلص | "عظیم۔ محض اس لیے نہیں کہ وہ ایک روحانی پیشوا تھے، انھوں نے ایک عظیم ملت کو جنم دیا، اور ایک عظیم سلطنت قائم فرمائی، بلکہ ان سب سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک عظیم عقیدہ کا پرچار کیا، مزید برآں اس لیے بھی (عظیم تھے) کہ وہ اپنے آپ سے بھی مخلص و وفادار تھے، اپنے امتیوں سے بھی مخلص رہے، اور اپنے اللہ سے بھی

معتقد ... ان باتوں کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے، کہ اسلام ایک کامل، سچا مذہب ہی جو اپنے ماننے والوں کو انسانیت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر نور و صداقت کی رفعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔" (لیونارڈ، اسلام، ہر مورل اینڈ اسپرچوئل ویلیو لندن، ۱۹۲۷ء ص ۲۱،۲۲)

۱۰۔ مقام و مرتبہ | ... محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول تھے نہ کہ صوفی، یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ کوئی کہہ کر بھی شرمندہ ہو جائے ... جو اُن کے گرد جمع ہوئے اور جو ملت اسلامیہ کے اولین ارکان تھے، وہ قانون کی اطاعت پر، توحید الٰہی پر دانی تھے، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور اُن کے اسوہ کی پیروی پر اکتفا کرنے والے تھے، وہ مطمئن تھے کہ وہ ایک سیدھے سادے اور مضبوط دین کے پیرو ہیں، جو مختصر عبادات اور چند مراسم پر مشتمل تھا۔" (گاڈ فرے ڈی ممبائنز مسلم انسٹیٹیوشنس، لندن ۱۹۵۰ء ص ۲۰)

○ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے از خود کبھی معصومیت کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ ایک موقع پر تو ایسی وحی نازل ہوئی، جس میں انہیں تنبیہ کی گئی کہ انھوں نے ایک باعزت شہری سے بات کرنے میں ایک فقیر سے منہ کیوں موڑا؟ پھر انہوں نے اُس وحی کو شائع بھی کیا، یہ وہ آخری دلیل ہے جس کی روشنی میں اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ وہ (نعوذ باللہ) ایک مدعی کاذب (Im poster) تھے، جیسا کہ معصوم مسیحی اُس عظیم عرب کو الزام دیتے ہیں۔" (لیتھم محمدزم، لاہور ۱۸۹۳ء، ص ۴)

○ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا جو مذہبی نظام قائم فرمایا وہ نہ صرف یہ کہ ان کے اپنے ہم مشربوں کے فہم و ادراک کے مطابق تھا، اور اس ملک میں پائے جانے والے رسوم و رواج اور اُن کے ساتھیوں کے جذبات سے ہم آہنگ تھا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ تمام انسانی حالات و نظریات سے بھی ایسی مناسبت و ہم آہنگی رکھتا تھا، کہ جس کے نتیجہ میں تمام انسانوں کی نصف سے زائد آبادی نے اسے قبول کیا، اور یہ سب کچھ چالیس سال سے بھی کم عرصہ میں ہو گیا، (کاونٹ ڈی بولین ولیئر La vie de Mohamet ایمسٹرڈم ۱۷۳۱ء، ص ۴۴-۱۴۳)

۱۱۔ روشنی | "بس وہ روشنی آگئی، عربوں کی تاریک روحوں کو منور کرنے کے لیے ایک ایسی تاریکی میں جو موت کی نقیب تھی، جیسا چاند پیدا کرنے والی روشنی، زندگی اور آسمانوں کا جاہ و جلال لیے ہوئے، اس نے اسے "وحی" کہا، اور لانے والے فرشتہ کو جبرئیل، اور ہم ابھی تک سوچ رہے ہیں کہ اسے کیا نام دیں؟ یہ خدائے ذو الجلال کی طرف سے اشارہ ہے"

ہمارے سمجھنے کے لیے کسی چیز کی سچائی اور حقیقت جاننے کی کوشش دراصل ایک روحانی عمل ہے، جس کے بارے میں ہر منطق اور قیاس ہوا میں تیر چلانے کے مترادف ہے، بقول غزالی ایک خدا پر اعتقاد کا حلال کیا ایک معجزہ سے کم تھا؟ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وجود کامل، جسم و روح، اسی حقیقت اور سچائی کے نور سے مستنیر تھا" (کارلائل دی ہیرو اینڈ سے پر افٹ)

۱۲- نور ہی نور | عرب قوم کو یہی نور ظلمتوں سے نکال کر روشنی میں لایا، عرب کو اسی کے ذریعے پہلے پہل زندگی ملی، بھیڑوں بکریوں کے چرانے والے لوگ جو ازل سے صحراؤں میں بے کھٹکے، بے روک ٹوک گھومتے پھرتے تھے کہ ایک "ہیرو پیغمبر" ان کی طرف بھیجا گیا، ایک پیغام کے ساتھ جس پر وہ ایمان لا سکتے تھے، اور پھر سب نے دیکھا کہ جو کسی کے نزدیک قابل اعتنا نہ تھے، دنیا بھر کیلئے قابل ذکر بن گئے۔" (کارلائل)

۱۳- عظیم فاتح | فتح مکہ کے اس موقع پر یہ بات ان کے حق میں جائے گی اور وہ قابل تعریف ٹھہریں گے، کہ اس وقت جب کہ اہل مکہ کے ماضی کے انتہائی ظالمانہ سلوک پر انہیں جتنا بھی طیش آتا کم تھا، اور ان کے آتش انتقام کو بھڑکانے کے لیے کافی تھا، مگر انھوں نے اپنے لشکر و سپاہ کو ہر قسم کے خون خرابے سے روکا، اور اپنے اللہ کے سامنے انتہائی بندگی و عبدیت کا مظاہرہ کیا اور شکرانہ بجالائے، صرف دس بارہ آدمی ایسے تھے، جنھیں پہلے سے ہی ان کے وحشیانہ رویّہ کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا، اور ان میں سے بھی صرف چار[۴] کو قتل کیا گیا، لیکن دوسرے فاتحوں کے وحشیانہ افعال و حرکات کے مقابلہ میں، اسے بہر حال انتہا درجہ کی شرافت و انسانیت سے تعبیر کیا جائے گا، (مثال کے طور پر صلیبیوں کے مظالم، کہ سنہ ۱۰۹۹ء میں فتح یروشلم کے موقع پر انہوں نے ستر ہزار سے زائد مسلمان مرد، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا، یا وہ انگریز فوج جس نے صلیب کے زیر سایہ لڑتے ہوئے سنہ ۱۸۷۴ء میں افریقہ کے سنہری ساحل پر ایک شہر کو نذر آتش کر ڈالا) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فتح درحقیقت دین کی فتح تھی، سیاست کی فتح تھی، انھوں نے ذاتی مفاد کی ہر علامت کو پس پشت ڈالا، اور کروفر شاہی کے ہر نشان کو مسترد کر دیا، اور جب قریش کے مغرور و متکبر سرداران کے سامنے سرنگوں ہو کے آئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے پوچھا کہ "تمھیں مجھ سے کیا توقع ہے"؟ رحم! اے سخی و

فیاض برادر، رحم! وہ بولے " جاؤ تم سب آزاد ہو"۔ انھوں نے فرمایا۔" (ارتھر گلمین دی سراسینز لندن ۱۸۸۷ء، ص ۸۵-۱۸۴)

۱۴۔ صاحب خلق عظیم | "اخلاق و عادات میں وہ حد درجہ سادہ تھے، البتہ اپنے معمولات میں وہ بہت محتاط تھے، ان کا کھانا، پینا، ان کا لباس اور فرنیچر وغیرہ وہی معمولی درجہ کا تھا، اور ہمیشہ وہی رہا، جب کہ وہ اپنی طاقت و حکومت کی معراج تک پہنچے، انہیں تخیل و تصور کی بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں، ان کا ذہن رسا تھا، اور نازک سے نازک جذبات و احساسات کا پرتو قبول کر لیتا تھا، کہا جاتا ہے کہ وہ پردے کے پیچھے بھی ایک کنواری سے زیادہ باحیا، عفت مآب اور شرمیلے تھے، اپنے چھوٹوں سے انتہائی رعایت کرتے، اور یہ پسند نہ کرتے کہ ان کی کمزوریوں کو تلاش کر کے مذاق اڑایا جائے، ان کے خادم انس رضؓ کہتے ہیں کہ میں دس سال تک ان کی خدمت میں رہا لیکن انہوں نے کبھی اف تک نہ کہا، انہیں بچوں سے بہت محبت تھی، وہ انہیں راستے میں روک لیتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، انھوں نے زندگی میں کسی کو نہیں مارا، اگر کسی کے بارے میں انتہائی برائی بیان کرتے تو بس اتنا کہتے کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو، جب ان سے کسی کے بارے میں بد دعا کرنے کی درخواست کی جاتی تو فرماتے "میں بد دعا کرنے کیلئے نہیں بھیجا گیا ہوں، میں تو انسانیت کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں"، وہ بیماروں کی عیادت کرتے، کوئی جنازہ ملتا تو پیچھے چلتے، غلام کی دعوت بھی قبول کر لیتے، اپنے کپڑوں کی مرمت خود کر لیتے، بکریوں کا دودھ دوہ لیتے، اور دوسروں کا ہمہ تن انتظار کر لیتے، وہ اپنی ازواج کے ساتھ ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے تھے، وہ آگ خود جلا لیتے، فرش پر جھاڑو دے لیتے، تھوڑا بہت کھانا جو کچھ بھی گھر میں موجود ہوتا، اس میں وہ لوگ ہمیشہ شریک ہوتے جو وہاں موجود ہوتے، ان کے گھر کے باہر ایک چبوترہ (صفہ) تھا جہاں ایسے متعدد غریب افراد موجود رہتے جن کی گذر بسر کا تمام تر انحصار انہی کی فیاضی پر منحصر تھا۔" (لین پول دی اسپیچز اینڈ ٹیبل ٹاک آف دی پرافٹ محمدؐ، لندن ۱۸۸۲ء، ص ۲۹-۲۷)

۱۵۔ سنجیدگی، اخلاص، وفاداری | "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کارلائل کے خطبات کے بعد، مغرب

کو یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنجیدگی پر یقین کرنے کی معقول وجوہات موجود ہیں، اپنے ایمان و عقیدہ کی خاطر مظالم سہنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا، ان پر اعتقاد رکھنے والوں کا اعلیٰ اخلاق و کردار، اور ان کی طرف امام و پیشوا کی حیثیت سے دیکھنا، پھر آخر کار ان کی عظمتیں اور کامیابیاں یہ سب دلیل ہیں، ان کے اخلاص کامل کی، اس لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک مدعی کاذب (Impostor) قرار دینے سے مسائل حل نہیں ہوتے، بلکہ اور پیدا ہو جاتے ہیں، مزید برآں تاریخ کی کوئی شخصیت ایسی نہیں ہے جسے مغرب میں اس قدر کم سراہا گیا ہو، جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اس لیے اگر ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کچھ بھی سمجھنے کی نیت کرتے ہیں، تو ضروری ہے کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے مشن میں دیانت دار قرار دیں، اور مقصد سے ان کے خلوص اور وابستگی کے قائل ہو جائیں، اگر ہم ان غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں جو اپنے ماضی سے ہم نے ورثہ میں پائی ہیں تو ہمیں ہر معاملہ میں ان کے خلوص اور دیانت کو بہر حال پیش نظر رکھنا ہوگا، جب تک کہ کوئی الزام ان کے خلاف پوری طرح ثابت نہ ہو جائے۔" (واٹ، محمد ایٹ مکہ، آکسفورڈ ۱۹۵۳ء، ص ۵۲)

۱۵— "یہ بات ان کی زندگی کے ہر واقعہ سے ثابت ہے کہ ان کی زندگی اغراض و مفاد پرستی سے یکسر خالی تھی، مزید یہ کہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اپنی نگاہوں کے سامنے دین کے مکمل قیام و استحکام اور لامحدود اختیارات حاصل ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے اپنی ذات اور اور انا کی تسکین کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچایا، بلکہ آخر وقت تک اس سادہ طرز و انداز کو برقرار رکھا جو اول دن سے ان کے بود و باش سے نمایاں تھا۔" (ڈیون پورٹ اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن، لندن ۱۸۶۹ء جدید لاہور ایڈیشن ص ۴۳ - ۱۳۳)

۱۶— مشن کی سچائی | محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا شک و شبہہ اپنے مشن کی سچائی پر یقین تھا، وہ اس پر مطمئن تھے کہ اللہ کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے انھوں نے ملک کی تعمیر و اصلاح کی ہے، ان کا یہ مشن نہ تو بے بنیاد تھا، اور نہ فریب دہی، جھوٹ و افترا پر مبنی تھا، بلکہ اپنے مشن کی تعلیم و تبلیغ کرنے میں نہ کسی لالچ یا دھمکی کا اثر قبول کیا اور نہ زخموں اور تکالیف کی شدتیں ان کے راہ کی رکاوٹیں بن سکیں، وہ

سچائی کی تبلیغ مسلسل کرتے رہے۔ (ڈیون پورٹ ایضاً)

۱۷- سچے رسولؐ "جہالت جس کا مظاہرہ اکثر و بیشتر مسیحیوں کی طرف سے مسلمانوں کے مذہب کے بارے میں ہوتا رہتا ہے، افسوسناک امر ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس وقت کی اقوام میں ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور دوسرے خداؤں کی نفی کرتے تھے، انھوں نے بہ تاکید راست بازی اور دیانتداری کو کردار کا سرچشمہ قرار دیا، اور بدرجۂ فرض متعدد نمازوں کی، روزوں کی، خدا کے لیے ادائیگی، تمام انسانوں کی عزت و احترام، اور سب کے ساتھ رحم و شفقت برتنے پر زور دیا، ہر قسم کی نشہ آور چیزوں سے پرہیز، ہر معاملہ میں عدل و توازن، اور ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی تلقین ان کے دین و مذہب کا حصہ تھی، لہٰذا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نفس روحانی کے مالک اور ایک سچے رسول تھے، مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے، وہ خدا سے ہمکلام ہوتے تھے اور سرچشمۂ روحانی سے ان پر وحی اترتی تھی۔" (لنڈسے مضمون مطبوعہ ٹو ورلڈ، مانچسٹر ۱۰ اگست ۱۹۱۱ء)

۱۸- امتحانِ سخت سے گزرے "ان سے پہلے کوئی پیغمبر اتنے سخت امتحان سے نہ گزرا تھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیونکہ منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہی انھوں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو انھیں سب سے زیادہ جانتے تھے، اور جو ان کی بشری کمزوریوں سے بھی سب سے زیادہ واقف ہو سکتے تھے، لیکن دوسرے پیغمبروں کا معاملہ برعکس رہا، کہ وہ سب جگہ، سب کے نزدیک معزز و محترم ٹھہرے الّا یہ کہ جو انھیں اچھی طرح جانتے تھے۔" (گبن زوال سلطنت روم ص ۱۰۸)

۱۹- آسمانوں کی بادشاہت زمین پر "اسلام کے ذریعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دس سال کے اندر ہی عربوں کی شدید ترین نفرتوں کو، انتقامی جذبات کو، مزاج و انتشار کو، رقابت و عداوت کو نکال پھینکا، لاقانونیت، عورتوں کی ذلت، سود خواری، شراب خوری، قتل و غارت گری، دختر کشی کی رسوماتِ قبیحہ کا استیصال کیا، اور انسانی قربانیوں، سفیہانہ خیالات و توہمات اور مادیت و اشیاء پرستی سے نجات دلائی، پھر اسی مذہب کے ذریعہ آسمانوں کی اس بادشاہت کو انھوں نے عملاً اس زمین پر قائم کر دیا جس کی بشارت بڑے ذوق و شوق سے جناب مسیح نے دی تھی۔" (گبن ایضاً ص ۶۹-۷۰)

۲۰۔ ہمہ گیر اصلاح | "ممکن ہے یہ سوچا جائے کہ وہ آدمی، جس نے اتنی بہت سی اور تادیر قائم رہنے والی اصلاحات کیں، انواع واقسام کی بت پرستی کے بدلے، جس میں لوگ مدتوں سے مبتلا تھے، ایک خدا کی عبادت کا داعی بنا، جس نے دختر کشی کی رسمِ قبیح کو مٹایا، شراب اور دوسری نشہ آور اشیاء کو حرام ٹھہرایا جوئے کی ممانعت کی، نسبتاً ایک دائرہ میں رہتے ہوئے تعددِ ازدواج کو محدود کیا، وغیرہ وغیرہ، کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کا خدائی مشن اس کے ذہن کی محض اختراع تھی؟ اور کیا وہ جھوٹ کو جانتے بوجھتے نبھاتا رہا؟ نہیں، ہرگز نہیں! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو درحقیقت سچے مذہبی ادراکات اور روحانی احساسات حاصل تھے، جن کے سبب انھوں نے اپنے مشن کو انتہائی مستقل مزاجی، پامردی واستقلال سے آگے بڑھایا اور نہ اس کے جھٹلائے جانے کی پرواہ کی، نہ اس کی راہ میں مصائب ومشکلات کی، یہ سچائی، یہ حق کی معرفت انھیں ابتدا سے انتہا تک حاصل رہی، یعنی حضرت خدیجہؓ کے سامنے پہلی وحی کے نزول سے لے کر حضرت عائشہؓ کی باہوں میں آخری سانس لینے تک"۔ (ڈیون پورٹ)

۲۱۔ عظمتوں کے نشان | "حالات، مواقع اور وقت سب نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیا، اور مختلف عوامل نے مل کر ان کی زندگی میں کامیابیوں کی اور ان کے بعد اسلام کی توسیع وترقی کی راہ ہموار کی، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں صفات وکمالات کا جو حسین امتزاج موجود تھا، اس کی تین جہتیں تھیں، ایک نبوت کا فیضان، دوسرے سیاست وحکمرانی میں ان کی بصیرت، اور تیسرے ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مہارت وحذاقت اور تمام مناصب پر اہل ترین افراد کا انتخاب، جب کوئی اسلام کی ابتدائی تاریخ اور سیرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جس حد تک نظر ڈالتا ہے، وہ اسی حد تک ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر حیران وششدر رہ جاتا ہے، حالات نے انہیں کس درجہ سازگاری عطا کی، اس طرح کے مواقع تو کسی کو شاذ ونادر حاصل ہوتے ہیں، بالکل وقت کی آواز بن کر، ایک پیغمبر اور ایک منتظم کی حیثیتیں انہیں اگر حاصل نہ ہوتیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے پیچھے ایک خدا پر انہیں غیر متزلزل اعتقاد نہ ہوتا، اگر وہ اس یقین محکم سے بہرہ ور نہ ہوتے کہ وہ خدا کے فرستادہ ہیں تو شاید تاریخ انسانیت کا ایک اہم اور قابل ذکر باب رقم ہونے سے رہ جاتا"۔ (واٹ محمد پرافٹ اینڈ اسٹیٹسمین آکسفورڈ پریس ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۴۰)

۲۲۔ صدق و صفا | "یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صدق کی دلیل قاطع ہے کہ ان سے قربت رکھنے والے لوگ ان پر ایمان لائے، حالانکہ وہ ان کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف تھے، اور اگر انہیں ان کی صداقت میں ذرہ برابر بھی شبہ ہوتا تو ان پر وہ ہرگز ایمان نہ لاتے۔" (ایچ، جی ویلز بحوالہ زکریا ہاشم زکریا، ص ۲۷۰)

۲۳۔ اتمام و کمال | "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپؐ ایک سلطنت کی، جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار السلطنت مقرر تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپؐ نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا تھا، اور اُن میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا، جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" (مارگولیتھ بحوالہ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جلد چہارم از مولانا سید سلیمان ندوی ص ۳۹۹)

(۲)

مستشرقین کی زیر نظر فہرست دو حصوں میں منقسم ہے، حصۂ اول میں اکثر و بیشتر وہ مستشرقین شامل ہیں، جنھوں نے سیرت رسولؐ پر مستقل تصنیف یادگار چھوڑی ہے، یا جو مطالعۂ سیرت کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں، اور جن کا مکمل حوالہ بھی مل گیا ہے، دوسرے حصہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جن کی سیرت پر اگرچہ مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن ان کے مضامین، مقالات اور کتابوں میں سیرت کے کسی ایک پہلو یا چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور جن کا پورا حوالہ بھی دستیاب نہیں ہوا، دونوں حصوں میں ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے، زمانی تقدم و تاخر کا لحاظ نہیں رکھا گیا،

اس فہرست کی تیاری میں اگرچہ ان تمام کتابوں سے مدد لی گئی ہے جن کا حوالہ وقتاً فوقتاً تاریخی جائزہ کے سلسلہ میں دیا گیا ہے، تاہم بطور خاص تین کتابوں سے آزادانہ استفادہ کیا گیا ہے، یعنی (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون، (۲) الزرکلی، خیرالدین۔ الاعلام، (۳) حمادے۔ محمدؐ دی پرافٹ، اے سلیکٹیڈ ببلیوگرافی، یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وقت اور وسائل کی کمیابی کے سبب یہ ممکن نہ تھا کہ مستشرقین کے ناموں کے تلفظ اور ہجے، وطن ملک اور زبان کی رعایت سے تحقیق کر کے لکھے جاتے، اس سلسلہ میں تمام انگریزی مفہوم کو سامنے رکھا گیا ہے، تاہم یہ توقع ہے کہ تحقیق مزید کے ضمن میں یہ سرسری فہرست انشاءاللہ نقطۂ آغاز ثابت ہوگی، اور دوسرے کام کرنے والوں کیلئے مدد و معاون ہوگی، وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ،

فہرست مستشرقین حصۂ اول

Mohammad and Mohammednism Adams, Isaac (Chicago 1900)	۱۔ آدم

	The life and Death of Muhammad, the author of the
۲- ایڈیسن	Turkish religion (London 1619 Addison, Lencelat
۳- ایڈلر	Moyammad (Philladelphia 1901) Addler, Felix. H
۴- اہرن	Mohammad al Religious Stifter Ahren, Karl (Leipzig 1935)
۵- ایٹن	The Land of the Messiah, Mahomet, and Aiton, John the Pope (London 1854)
۶- آرنلڈ	The Preaching of Islam (London 1896) Arnold T. W.
۷- آرنلڈ	Islam, its History, Character Arnold, J. M. and relation to Christianity (London 1874)
۸- اروِنگ	Life of Mahomet (Newyork 1911) Irving, Washington
۹- اوکلے	History of the Saracens Oekley Simon (London 1847)
۱۰- اوکس گان	Confutacion del Alooan y Oksegon, L. de Secta Mahometsna (Granada 1555)
۱۱- ایج مین	Mohammadmde Profet der Arabieren. Eigeman, Jakob (Amesterdom 1898)
۱۲- اوسنر	Des effets de tareligion de Mohamed-Oel Isner, C. E.
۱۳- اوسبم	Islam under the Arabs (London 1876) Osbom, R. D
۱۴- اوزرن	Vizlat Muhamad Kuranjanak ethikaja-biz (Budapest 1902) Osztern, S.

۱۵- اسٹبب	Stubb, H.	An Account of the Rise and Progress of Mahometanism (London 1911)
۱۶- اپام	Upham, Edward	History of the ottomon Empire Preeaded by the life of Muhammad (Hurst 1826-35)
۱۷- ارتھبوٹ	Arhutmot, F. F.	(i) تاریخ العرب وآدابہم (لندن ۱۸۹۰ء) (ii) ترجمہ روضۃ الصفا فی حیاۃ محمد المصطفیٰ (لندن ۱۸۹۳ء) معاونہ ریاسٹک
۱۸- اسپرنگر	Sprenger, A.	Life of Mohammad (Allhabad 1851) Das Lesa und die Lehredes Mohammad (1851-1861)
۱۹- اسمتھ	Smith, Bosworth	Muhammad and Muhammadenism London 1874 (Reprint-Lahore)
۲۰- بچیلات	Bachelat, theodore	Mahomet at Les Arabes (Rome 1878)
۲۱- بیکن	Bacon, a. s.	Mohammad and Islam acomparision with orthodox christianity, (Newyork, x 1911)
۲۲- بیکن ڈارف	Beckendorf, H C.	Mohammad and de Seinen (L ipzig 1907)
۲۳- بارٹن	Barton, theoador	Talks on Mohamed and his followers (London 1933)

۲۴- بائیل	Bayle, Pierre	The dictionary historical and critical of Mr. Petere Bayle (Ed) (London 1734-1735)
۲۵- بیڈویل	Bedwell, W.	Mohammedis imposturae, (London 1615)
۲۶- برن فیلڈ	Bernfehd, Simon.	Muhammad, His Biography and the begining of the Religion of Islam [Warsaw, 1914]
۲۷- انی بینٹ	Besant. annie	The Life and Teaching of Muhammed (Adyar 1932)
۲۸- بلاخر	Blachor, Begis	Le Problems de Mahomet [Paris 1952]
۲۹- بلام	Blom, P.	Mohammad of Koranen [Hamar 1904]
۳۰- بلائٹ	Blytt, Eva.	Muhammad Islam Stroe Profet, Kristiannica 1911
۳۱- بوُوین	[Bowch, George]	Life of Mohammed (Bambey 1851)
۳۲- برانڈے	Brandes, C. E, C.	Muhamed Skuespiel the akter [Ohenbava 1895]
۳۳- بوڈلے	Bodley, R.V. C.	The Messenger-the life of Mohammad [London 1946]
۳۴- بولین ولیرز	Boulam Villiers	[i] Histore des Ar abes, Aved, la vie ce Mahomet (Amestercom 1731)

(ii) Vie de Mahomet (1730)

۳۵- بری گنی	Brequigny, H. D.	Véber Muhmemed (Frankfort 1791)
۳۶- بریم	Bryem. O. E.	Budha, Muhammed, Jesus (London 1938)
۳۷- بروکلمان	Brockelmann, C	History of the Islamie People (Newyork 1947) English Tr.
۳۸- بروکس	Brooks, Archibald	Islam : A Short Study
۳۹- براؤن	Brown D. A.	The way of the Prophet An Introduction to Islam (London 1962.
۴۰- براؤن	Brown, G. L.	The Era of Mahomet (London 1856)
۴۱- بکل	Buckly, Henery	The Begger or the Soldier Gautama or Mahomet (London 1903)
۴۲- بوہل	Buhl, F. P. W.	Des leban Muhameds (Leipzig 1930)
۴۳- براؤز	Burrows, Miller	Founders of Great Religion Being personal sketehes of famous leaders (Newyork 1931)

۴۴- بُش	Bush, George	The Life of Mohammad Founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saracens (Newyork 1830)
۴۵- باسے	Bassetmrene	قصیدۃ البردۃ، بوصیری مع سیرت مصنف، نقد و شرح ۱۸۹۴ء
۴۶- برٹن	Burten	Pilgrimage to Meeca and Medina (1856)
۴۷- پوفی	Pohes, Rudi	Mohammad and der Koran (Stuttzart 1951)
۴۸- پائن	Payne, P. S. R.	The Holy Sword of the Story of Islam from Muhammad to the Present (London 1961)
۴۹- پیڈیو	Pedio, Sau Paswal	Contra Los parts listau Mahometanos (Rome 1905-06)
۵۰- پروفش	Prucksch, otto	Uber dic Bluc traehe deideu Vornlamisschen Arubern nnd Mahomeds (Leipzig 1899)
۵۱- ٹیلر	Tayler Vil	History of Mohamet anism and its sects. (London 1834)
۵۲- ٹنسڈال	Tinsdall, W St. C	Sances of the Quran (London 1905)

۵۳۔ ٹاؤن سینڈ	Townsend, Mad W.	Muhammad the Great Arabian (Houston 1912)
۵۴۔ ٹائن بی	Toynbee, A J	A study of History London 1954-51
۵۵۔ ٹریپے	Trampe, E. Von	Muhammed [Leipzig1907)
۵۶۔ ٹروٹر	Trofer, H J.	Studies in Biography [London 1865
۵۷۔ ٹرپن	turpin, F. R.	Historie de la vie de Mahomet Lagisltive de i Arabie [Paris 1776)
۵۸۔ جبریٹلی	Gabrieli, Francesseo	Muhammad and the Conquests of Islam, [newyork 1968)
۵۹۔ جیگنیر	Gagner.	Vie de Mahomet (Amesterdam 1748
۶۰۔ جینوے	Genevay	Mohammed (Paris 1833)
۶۱۔ جیورگن	Georgen E. P.	Mohammed ein Cheracerbild (Berlin 1878)
۶۲۔ جیفرے	Jaffery, Arthur	Islam Mohammad and his Religion(newyork 1958)
۶۳۔ جانسٹن	Johnston. P. Lacy de	Muhammad a his power (newyork 1901)

سیرت ابن ہشام مع متن و ترجمہ لاطینی، لیڈن ۱۸۸۱ء بمعاونت دی خویہ	Jong, P. de	۶۴- جونگ
La vie do Mohamet [Paris 1962)	Chaorghiu, C. V.	۶۵- چیپورغیو
Mahomet less Khalifes (Paris 1912	Chagavat, Michel. S.	۶۶- چگاورٹ
Là vie de Mahomet (Feris 1929)	Dermanghsm E.	۶۷- درمنگھم
Maometta (1931)	Ducati, Brumo	۶۸- دوکات
Maishaya Muhammad (London 1909)	Dale, Codetrey	۶۹- ڈالے
Mohammad. (NewYork 1926)	Dibble, R.F.	۷۰- ڈبنے
Apology for Mohammed and the Quran.(London1879) Reprint Lahor-1975	Davenport John.	۷۱- ڈیون پورٹ
The Alcoran of Mahomet (London1649)	Du Rver, Andre.	۷۲- ڈوریر
Mohomet, Founder of Islam (London1915)	Dray cott.G M.	۷۳- ڈریکاٹ
Mahomet daus Son Lemps (Geneva1908)	Ducasse Raymond.	۷۴- ڈوکاسے
Vie de Mohammed(Paris1837	DesvergersN.	۷۵- ڈیورجرس
Spanish Islam (1863) Het Islami sime (Krusemah 1863)	Dozy R. P. A.	۷۶- ڈوزی

The life and Death of Mahomet (London 1637)	Raleigh, Sir W.	۷۷۔ ریلے
Vita di Maometto (Milano 1922)	Ram poldi	۷۸۔ رام پوڈی
Mohamad und die Seuinen (Leipzig 1907)	Reckender H.	۷۹۔ ریکینڈر
Reflections on Mohamedanism and the conduct of Mohamdd (London 1712)	Reelandh	۸۰۔ ریلینڈ
Mohamed and die welt des Islam Leipzig 1755]	Rehm, H.S.	۸۱۔ ریم
Notice Sur Mahomet (Paris 1860)	Reinand, J.t.	۸۲۔ رینو
De religione Mohamedica libra due (Utruht 1704)	Reland, H.	۸۳۔ ریلان
Mahomet et ler origines de L, islamism. (Paris-1880)	Renan, Ernest	۸۴۔ رینان
Islam et son Prophet (Lausaune 1870)	Rink, F. Th.	۸۵۔ رنک
Hayyey Muhammad (Mizz) 1932	Rivlin, Josef. J.	۸۶۔ ریولین
(i) Islam Mahomet et les origines de L. Islam (Paris 1957	Rodinson. M.	۸۷۔ روڈنسن

		(ii) Mahomet. (Paris. 1961)
۸۸- روبک	Roebuck, J. A.	Life of Mahomet. (London 1833)
۸۹- رومرو	Romro, Jacob	Mohomed (Newyork 1907)
۹۰- زکریا	Zakarias, Heuna.	Voici le Vraj Mohamedet la fauLX Coran (paris 1960)
۹۱- سیکو	Sacco, G.	Le Cedenze religiose de Maomettd. (Rome 1922)
۹۲- سیل	Sale, George	The Koran or Al-coran of mohammed. (London 1734)
۹۳- سوارے	Sawary Claude E.	morale de mahomet (Paris 1784)
۹۴- سیل	Sell, por	The life of muhamed (London 1913
۹۵- سوان	Svan Borg.	Ono Successn Davidiros Hymsnas Unitatosis muhamad Upsalise. 1886)
۹۶- سونڈرز	Saunders, J. J.	A History of medieval Islam (London 1965)
۹۷- شروڈر	Schroeders, J. J.	muhammad testics veritatis Contrasoipsum [Leipzig 1718]
۹۸- طورانیڈرے	Tor Andrae	muhammad : The man and his faith (Tr,) London 1956

۹۹۔ فیورٹ	Favrot, Alexis	mahomet : Da Science Chezles Arabs [Paris1866)
۱۰۰۔ فارسٹر	Forster Charles	mahometani sm Unveiled [london 1829]
۱۰۱۔ فرائڈ	Fried,Dezro	mohammad a Regebbi Zeridosag megitelaseben[Budapest 1934]
۱۰۲۔ فوربنگ	Fòrebing, J. C.	mohamad, muuzer und Bockold [Hamover 1788]
۱۰۳۔ کیتانی	Caetani, leone.	[i] Annalidell's Islam [Hepoli 1905–26]
		(ii) Maometto Proheta d, Arabia Islam 1910
۱۰۴۔ کارلائل	Carlyle, Thomas	The Hero as Prophet Mahomet (Newvark!1902)
۱۰۵۔ کاستری	Casiries Henridelac	Comte dp.L. Islam Impressions et etudes (Paris1912)
۱۰۶۔ کلیمن	Clemens, J. F. G.	Leban Muhammed !des Stifters der Muhammadanism Religion (Himberg 1814)
۱۰۷۔ کلاڈیس	Claudius, A. H	Muhameds Religiou aus dem Koren (Atona1908)

۱۰۸۔ کورینالڈی	Corinaldi, Gino	Maometto egli Ebrie (Milans 1925)
۱۰۹۔ کریمی	Karimi. R. W.	Anacdotes of Hazrat Mohammed (London 1939)
۱۱۰۔ کاسٹ مین	Kastman carl	Muhammed, Haus Lefnad beratted (Stockholm 1908)
۱۱۱۔ کوئیل	Koelle, g. W	Mohamed and Mohamedeni sm (London 1889)
۱۱۲۔ کروپن	Kroppen P	Mohamed der Prophet Himb-erg 1851)
۱۱۳۔ کاسن ڈی پرسیوال	Caussin de Perceval A. P.	Essai Sur l 'Histoire des Arabes (1847)
۱۱۴۔ الکندی عبدالمسیح بن اسحاق	Al- Kindi	Risalah-Ed. Tien (London 1880) The Apology of al – Kindi (London 1887) by Muir
۱۱۵۔ گارساں دتاسی	Garcin de Tussy	Le Doctrine et les Deviors de la Religion Musulmane (Peris 1826)
۱۱۶۔ گاڈفرے ڈی ممبائن	Gaudefroy De Mombynes	Mahomet (Paris 1957)
۱۱۷۔ گب	Gibb. H. A. R.	Mohamedani sm Historical

Suryey (London 1953)		
Life of Mahomet (Newyork 1879)	Gibbon, Edward	۱۱۸- گبن
Mohamed and Islam (Tr) Yale 1917)	Goldziher, Ignac	۱۱۹- گولڈزیہر
The Saraceus, (London1887)	Gilman, Arthur	۱۲۰- گلمین
Mahomet et Son Denure (Paris 1897)	Gold. I. L.	۱۲۱- گولڈ
The Life of Mahomet, founder of the Religion of Islam and the Empire of the Saraseus (London 1840)	Green Samuel	۱۲۲- گرین
Mohammad, Des Leban Nachden Quellen(Minister1892-95)	Hubert Grimme,	۱۲۳- گریم
Muhammad (London 1983)	Lings, Martin	۱۲۴- لنگز
Vide de Mahomet d' apres la tradition (1897-98)	Lamairesse E. D. G.	۱۲۵- لیمیریسی
(i) Mahomet in les Crand Bommes-De orient (Paris 1889) (ii)Histore de la Turquie (Paris-1854)	Lomartine A. M.	۱۲۶- لامارٹن
Muhammadani sm (Working 1889)	Leitner G. W.	۱۲۷- لیٹنر

Reprint Lahore1893

۱۲۸۔ لیروگ Lerouge, R.
Vie de Mahomet (Paris 1939)

۱۲۹۔ لیوی Levy, Simon
Moise, Jesus et Mahomet on
less Trios Grands (Paris 1887]

۱۳۰۔ لیوچی فی Lew, Che, Fi
The Arabian Prophet : a life
of Mohammad from Chinese and
Arabic Sources [Shanghai 1921

۱۳۱۔ لینارڈ leonard, Arthur, G.
Islam, Her moral and
Spiritual Value (london 1927]

۱۳۲۔ لین پول lane-Pool, Stainley
The Speeches and Table Talk
of the Prophet Moammad
[london 1882]

۱۳۳۔ لامنس lammens, P. H.
اخلاص محمدؐ (۱۹۱۱ء)
فاطمہ وبنات محمدؐ (روم ۱۹۱۲ء)
عہد الاسلام (روم ۱۹۱۴ء)

۱۳۴۔ میڈن madan, A. C.
Muhammsi, mans Hayake
Pannoje na habariza Wasliuin
na matu ruki [london 1888
Eng Tr. london 1896

۱۳۵۔ مگنامی Magnami, L.
(i) Allahe il su Prefeta
Pernis (Estre1922)

		(ii) Mahomet ne imposter. (London 1923)
۱۳۶- مینفریدی	Manfredi Vit	La Vita di Maometto (Milano 1888)
۱۳۷- مارگولیتھ	Margoliouth D.S.	Mohammad and the rise of Islam (Newyork 1905)
۱۳۸- مراکی	Maracci, Loiws	Mehumeti-Vita rerum que gestarm Synopsis Roma 1691)
۱۳۹- مارٹن	Martin, M. J.	Historia del falsay perver so Profeta Mahoma (Madrid 1781)
۱۴۰- مینازیس	Menezes, J. L.	The life and the religioan of Mohammad the Prophet of Arabia (Lodon 1921)
۱۴۱- مسارا	Messara, Pina	Maomettoeil peradise (Milano 1946)
۱۴۲- مِل	Mills, Charles	An History of Muhamedeni sm (London 1817)
۱۴۳- مِل مین	Milman, H. H.	Memories of the life of Mahomet (London 1727)
۱۴۴- مونٹیرو	Monters Yvidalg	Mahoma, Su Vida (Madrid 1727)

۱۴۵۔ موسس	Mosts the Lawgiver	False divinities : On Moses Christ and Mahomet and other religious deceptives (London1870)
۱۴۶۔ مور	Moore G.F,	History of Religis : Judaism Christianty, Mohamedani sm (Newyork 1929)
۱۴۷۔ میور	Muir, Sir. William	The life of Mahomat pom original Sourca (London 77)
۱۴۸۔ موزے	Muzzay, D. S.	Spiritual heroes, a study of the world's Prophets (Newyork 1955)
۱۴۹۔ ناعقن	Nathene, C. A,	Vite de Maometto. (Rome 1946)
۱۵۰۔ نکلسن	Nicholson, R. A.	A Literary History of the Arabs (newyork 1907)
۱۵۱۔ نولدیکے	noldke theodar	Das Heben muhamed's nach der Quellen Popular darqlstett (Hemover.1863)
۱۵۲۔ نارتھ	norlth C.R.	An outline of Islam(London1934)
۱۵۳۔ واٹ	watt, w.m.	(i)muhammad at mecca(1953 (ii) Muhammad at medina (1926)

		(iii)muhammad Prophet and Statesman (London 1961)
۱۵۴- ویل	Wefl, Gustav	mohammad de Prophet Seinleban and Scine Lehre (Stuttgart 1843)
۱۵۵- ویلجس	Wellejus, H.	Fra missionen Blanat muhammedaners, (De-nmark 1909)
۱۵۶- والسٹن	Wollaston, Sir. A. n.	Half Hours with muhammad : Being a popular Account of the Prophet of Arabia and of His more immediate follo-wers together with a short Synopsis of the relegion he founded. (London)
۱۵۷- ویاز	Wueaz Friechich	muhamed und sein werk (Stuttgurt 1923)
۱۵۸- وسٹنفلڈ	Wustenfeld, F.	(تاریخ مکۃ المکرمہ، سیرت ابن ہشام مع تعلیقات، اراضی مدینہ منورہ، تاریخ اشراف مکہ وغیرہ)
۱۵۹- ویٹیر	Vat ier, Pierre	L Histore mahometane (Paris 1657]

۱۴۰- ویلارڈ	Vieillard, Pane	[i] mohammad, messenger d' Allah [Philip 1657] [ii] mohammed[A Bengali Account of the life of muhammed] Calcutta 1892
۱۴۱- والش	Wallich, J. U.	Religio Turcico ,mahometisvita (Suecorum 1659
۱۴۲- ہوس	Hoas, Hans	Das Bild Muhameds in Wandel der Zeiten. (Berlin 1916)
۱۴۳- ہٹالا	Hatala, Peter	Mohamad elete estan a (Budapest 1878)
۱۴۴- ہیڈلے	Headley Rowland. G	The Three Great Prophets of the World. (Woking 1923)
۱۴۵- ہگنز	Higgins, Godfray	An Apology for the life and character of the celebrated Prophet of Arabia, Called Mohammad or the illustrious (Lodon 1829)
۱۴۶- ہلارڈ	Hillard, Frederick. H.	History of Mahomet the Great imposture (Falkink 1821)
۱۴۷- ہوویل	(Hoevell, W. R. V.)	Mohammed (Bataria 1939)

۱۶۸- ہولباش	Hollach, Panl,H.	Moisesgesus, Mahamet (Valencia 1903)
۱۶۹- ہولما	Holma Harri	Mahomet, Prophete des Arabes (Paris 1946)
۱۷۰- ہالینڈ	Holland, Edith	The Story of Mohamed (London 1914)
۱۷۱- ہرگرونج	Hur Gronj C. S	Muhamed in Selected works (ed) (Leiden 1957)

فہرست مستشرقین "حصہ دوم"

۱۷۲- ایتین مارک (Etieunne Marc Quatreimere)

۱۷۳- اڈمنڈ کاسل (Edumund Castell)

۱۷۴- اڈولف وارمنڈ (Adolf Wahrmund)

۱۷۵- البرتوس شولتنز (Albertus Schultens)

۱۷۶- الفرڈ اکتاف بل (Alfred octave Bel)

۱۷۷- امیلو لافونتے الکنترا (Emilo Lafouentey Alcomtara)

۱۷۸- اربی نیوس (Erpenuis)

۱۷۹- ایڈلر (Adler J. G.)

۱۸۰- اسٹینلے ڈین (Stanley Dean)

۱۸۱- الفسٹن (Elphistone)

۱۸۲۔ امبریکو آف منز	(Embrico of Mainz)
۱۸۳۔ اسمتھ	(Smith. W. C.)
۱۸۴۔ اولٹو	(otto, Richard)
۱۸۵۔ الیکزینڈر روس	(Allexander Ross)
۱۸۶۔ الیس	Alles, T. W.
۱۸۷۔ الکوک	Alcocke, Nathan
۱۸۸۔ اموس	Amos Psend
۱۸۹۔ اجودی سانتالہ	Ugodi Samtalla
۱۹۰۔ ایڈورڈ جے جرجی	Edward J Jurji
۱۹۱ احرث	Ehrharth, jacob
۱۹۲۔ الورث	Ahlwardt, Wilheln
۱۹۳۔ امبرڈس	Imberdis, Victor
۱۹۴۔ اشپرہر	Sperher, jakob
۱۹۵۔ اسپائن	Spien, Bernard
۱۹۶۔ اسپائرد	Spiro, gean
۱۹۷۔ اڈیلر آف باث	Adelard of Bath
۱۹۸۔ براؤن	Brown, E. G.
۱۹۹۔ بیریزین	Beresine, N.
۲۰۰۔ بارتھولڈ	Barthold, V. V.
۲۰۱۔ برخارث	Burchardt, L.
۲۰۲۔ بی وا	Beawais Vincentde

۲۰۳- بیجر — Badger, G. P.

۲۰۴- بارو — Barrau, J. J.

۲۰۵- بارٹول — Bartoi

۲۰۶- باڈیر — Baudier, Michel

۲۰۷- بازن — Bazin, Lowis

۲۰۸- بنسن — Benson, A. C.

۲۰۹- بیثمان — Bethman, W. C.

۲۱۰- بیون — Bevan, a. a.

۲۱۱- بحلیانڈر — Bihliander, theoder

۲۱۲- بلم — Blum, Erner Alfred

۲۱۳- بوساشیو — Boccacio, Giorani

۲۱۴- بولیقو — Bolitho, William

۲۱۵- بیکر — Becker, C.H

۲۱۶- برلفالٹ — briffault, Rs.

۲۱۷- بینگ — beyng, E.J.

۲۱۸- بارکر — barker E.

۲۱۹- برنارڈ لوئیس — blewis, b.

۲۲۰- بیل — bell, R.

۲۲۱- پوکاک — Pococke E.

۲۲۲- پوسٹل — قواعد اللغۃ العربیۃ ۱۵۳۸ء — Postel G.

۲۲۳- پیرون — ترجمہ الطب النبوی از جلال الدین ابی سلیمان داؤد ۱۸۶۰ء — Perrona, A

۲۲۴- پکتھال (ترجمۃ القرآن، الثقافۃ الاسلامیۃ)	Pickthel M. W.
۲۲۵- پامر	Palmer E. H.
۲۲۶- پالگریو	Arabia 1867 Palgrave
۲۲۷- پرائس Price	History of Mohammadens London 1812
۲۲۸ پیٹر	Peter the Venerable
۲۲۹- تھیوفین	Theophanes Saint
۲۳۰- تھامس برٹران	Thomas bertran
۲۳۱- تھامر	Thompsor, J. W.
۲۳۲- تھامسن	Thomson, wiltiam
۲۳۳- ٹیٹس	Titus, M. T.
۲۳۴- ٹوری	Tory, Fawford .H.
۲۳۵ ٹرٹین	Tritton, a. s.
۲۳۶- ٹرولش	Troltsch, charltorule F. K.
۲۳۷ تشودی	Tochudi, R.
۲۳۸ تھیوڈور فیلم جان	Thoedore wilhelun Gean juynboll
۲۳۹- جرترد مارگریٹ - انگریز مستشرقہ	Gertrude Margaret Lorothian bell
۲۴۰- جوتلف برک	Gotlhelf bergstrasser
۲۴۱- جارج جیکب	Jacob, George
۲۴۲- جویدی	Ignazio Gudi

Edward Glaser	۲۴۳ - جلازر
Gean arthorki	۲۴۴ - جان ارثوکی
Gabriel Ferrand	۲۴۵ - جبرئیل فِران
Gablricel Levenq	۲۴۶ - جبرئیل لیوان
Gesbert de oraliac	۲۴۷ - جربردی اورلیاک
Geer, b. j.	۲۴۸ جیر
jarazbhry a q, a.	۲۴۹ - جرازبری
(Jackel, R.)	۲۵۰ جیکل
(Juinez de Roda R.)	۲۵۱ - جیمز ڈی روڈا
(John, V.)	۲۵۲ - جان
(Jones, Da id)	۲۵۳ - جونز
(Jong P. De)	۲۵۴ - جونگ
(Johnson, E. N.)	۲۵۵ - جانسن
(John contineau)	۲۵۶ - جان کینیتو
(Sir Wdliam Jons)	۲۵۷ - جونز
(John of Damasens)	۲۵۸ - جان آف دمشق
(Johuston)	۲۵۹ - جانسٹن
(John lydgate)	۲۶۰ - جان لڈگیٹ
(Gene berard)	۲۶۱ - جین بررڈ
[Chadzko] A. B.	۲۶۲ - چاڑکو
(Hitti, P.K.)	۲۶۳ - حتّی

۲۶۴- درنبرگ	(Derenbourg. H.)
۲۶۵- دیؤ	(Etienne Duiret)
۲۶۶- دی ساسی	(Antoine Isac Sihestre de Sacy)
۲۶۷- دورن	(Bernhárdt Dorn)
۲۶۸- دانتے	(Dante)
۲۶۹- دی خویہ	Goeje, M.J. de
۲۷۰- ڈی کوئل	(Decull)
۲۷۱- ڈلبرگ	(Dalberg F. V.)
۲۷۲- ڈالاپورٹ	(Dalaporte, p. h.)
۲۷۳- ڈاس	(Dias, Eduardo)
۲۷۴- ڈیل	Diehal, charles
۲۷۵- ڈابس	Dobs, Narcus
۲۷۶- ڈی لنگر	Declinger, J. J. I V.
۲۷۷- ڈوگارگ	Dugarric, F.
۲۷۸- ڈن	Dunn
۲۷۹- ڈیلاویڈالیوی	Della Vida, G Levi
۲۸۰- ڈیفریمرے	Chades Francors Defremery
۲۸۱- رینکے	Ranke, Lcopold, Von
۲۸۲- راتی جی	Rattigea, W. H
۲۸۳- ریناخ	Reinach, Salneon
۲۸۴- رسک	Reiske, G K.

۲۸۵۔ ریوش	Reosch, R.
۲۸۶۔ رائمنڈ	Reymond, J.
۲۸۷۔ رٹر	Ritter H.
۲۸۸۔ روپر	Ruper, C. L.
۲۸۹۔ راجر بیکن	Roger Bacon
۲۹۰۔ راڈویل	Rodwell, J. M.
۲۹۱۔ ریکنڈوف	Reckendorf
۲۹۲۔ روزنتھال	Rosenthal E. I. J
۲۹۳۔ روزنتھال	Rosenthel, F.
۲۹۴۔ روزنزیوال	Sabastien Ronzevalle
۲۹۵۔ روزن	Victor Romamoiche Rosen
۲۹۶۔ رازمیسن	Lassen Rasmussen
۲۹۷۔ زمبرینی	Zam Brini, F.
۲۹۸۔ زویمر	Zwemer, S. M.
۲۹۹۔ زخاؤ	Sachau E.
۳۰۰۔ زیٹرسٹین	Zettersteen, K. V.
۳۰۱۔ ساسمنٹو	Sasmients Mantin
۳۰۲۔ سرسانو	Sarsano, M. Y. S,
۳۰۳۔ سرویز	Servier, Andic
۳۰۴۔ سائن	Sine, W.
۳۰۵۔ سائمن	Simion, Gottefried

۳۰۶- سلیرو	Solero, Silvio
۳۰۷- سارڈل	Sourdel, D.
۳۰۸- سودے	Southey, R.
۳۰۹- سائیکس	Sykes, Sir Percy
۳۱۰- سائبرگ	Syburg, F.
۳۱۱- سیورے	Savery
۳۱۲- سینٹ ہلیر	Barthelonyst Hailaire
۳۱۳- سان پیڈرو پیسکال	San Pedeo Persenal
۳۱۴- سدیو جان جاک	Sedillot, J J.
۳۱۵- سلیم نوفل	
۳۱۶- شن	Schuon, F. J.
۳۱۷- شول	Scholl, Addf
۳۱۸- شروڈر	Schroeder E.
۳۱۹- شوودن	Victor Chamvin
۳۲۰- شولتنز	Henrik Alber Schnltens
۳۲۱- شاخت	Schacht, J.
۳۲۲- شولتنز	Schnltens, J. J:
۳۲۳- شوفاجیہ	geen Saunvaget
۳۲۴- شیخاس	Francis goseph Steingan
۳۲۵- طنطاوی، الشیخ محمد عیاد	
۳۲۶- غریفینی	Engenio Griffini

۳۲۷۔ فلکے	Falke, Robest
۳۲۸۔ فنگر	Finger Charler
۳۲۹۔ فنلے	Finlay, G.
۳۳۰۔ فشر	Fisher, A. M.
۳۳۱۔ فلیگل	Flugel, G. L.
۳۳۲۔ فونٹین	Fontane Marivo E.
۳۳۳۔ فوسٹر	Foster, H. F.
۳۳۴۔ فری مین	Freeman E. A.
۳۳۵۔ فک	Fuck, J.
۳۳۶۔ فان کریمر	Alfred Von Kremer
۳۳۷۔ فلایشر	Fleiseher H. L.
۳۳۸۔ فرڈیننڈ	Augerst Ferdinand Mehren
۳۳۹۔ فیل	Gotthoed wail
۳۴۰۔ قسطنطین الافریقی	Constantinus African
۳۴۱۔ کانتو	Cantu, Ceoase
۳۴۲۔ کارا	Carra de von, B.
۳۴۳۔ کیش	Cash. W. W.
۳۴۴۔ کیو	Cawe, Sjgney
۳۴۵۔ کلارک	Clarke, gams F
۳۴۶۔ کلینارڈس	Clenardus, N.
۳۴۷۔ کریگ	Cragg, Kemath

Curio C. A.	۳۴۸- کیوریو
Kaibel. F. V	۳۴۹- کیبل
Kellerhal, E.	۳۵۰- کلرہال
Klein, F. A. P.	۳۵۱- کلین
Krehl, C.L.E.	۳۵۲- کرے ہل
carlyl H. H. Macartney	۳۵۳- کارلائل
Williau curreton	۳۵۴- کیورٹین
J. G. L. Kosegarton	۳۵۵- کوزے گارٹن
conde	۳۵۶- کوندے
Eraucescus codera Zaydin	۳۵۷- کوڈیرا
Kruger	۳۵۸- کروگر
cohen, cl	۳۵۹- کلودکاہن
colin G. S.	۳۶۰- کولن جارج
	۳۶۱- کاظم مرزابک
Krymsky A F	۳۶۲- کریمسکی
Kratch Kovsky, I. J.	۳۶۳- کراتشوفسکی
Calverley E. E.	۳۶۴- کلورلے
clestino Scheaparelli	۳۶۵- کلسٹینو
gear, gosegan	۳۶۶- گیر
Gardet. L.	۳۶۷- گارڈے
Goldsack, Williar	۳۶۸- گولڈسیک

Goodrich c a.	۳۶۹- گڈرچ
Guibertus	۳۷۰- گیبرٹس
Gnidi M.	۳۷۱- گیدی
Gui llanome Alped	۳۷۲- گیام
Goethe	۳۷۳- گوئٹے
Grun cbaume, G E	۳۷۴- گرینیبام
Leusden gohan	۳۷۵ - لسڈن
La Beaneme, J.	۳۷۶ - لابیوم
Laffitte, Piesse	۳۷۷ - لفیٹے
Lunt, theodore	۳۷۸ - لنٹ
Lyth, Henricus	۳۷۹ - لائتھ
Lebon Dr. G	۳۸۰ - لیبان
(Levi Provencal, E.	۳۸۱ - لیفی پروفنسال
Lawrence, T. E.	۳۸۲ - لارنس
(Edward william lane	۳۸۳ - لین
Carlo Landberg	۳۸۴ - لینڈبرگ

۳۸۵۔ لیس	willioım nassan lees
۳۸۶۔ میکڈونلڈ	Macdonald, D- E.
۳۸۷۔ ماسں	Mass'e Henri
۳۸۸۔ مازاس	Mazas, Alexande
۳۸۹۔ مورلے	Willianr Hook Morley
۳۹۰۔ میفنگ	(J. Petrns M. Mevsing
۳۹۱۔ مل مین	Milman
۳۹۲۔ مورس	Maurice, F. D.
۳۹۳۔ میلبوگنار	Melbo Gummar
۳۹۴۔ مرکاڈیر	Mercadier, G.
۳۹۵۔ مارکیل	Markel, G. H. G
۳۹۶۔ میار	Mayer, Edward
۳۹۷۔ میسر	Mayer, J. J.
۳۹۸۔ میرس	Meyerns, P.
۳۹۹۔ میمیر	Meymier, E.
۴۰۰۔ میرو	Mierow, C.C.

Muir gohn	۴۰۱ - میور
Mouzaray, F. de	۴۰۲ - موزرے
Moyer, E. S.	۴۰۳ - مویر
Manro, D. C.	۴۰۴ - منرو
Meynard. Barbierde	۴۰۵ - مینارڈ
Montet, Ed.	۴۰۶ - مونٹے
Michaux Bellaise, E.	۴۰۷ - میشو
Augents Muller	۴۰۸ - ملر
Eugen Mittwech	۴۰۹ - متفخ
Marcus goscpn Muller	۴۱۰ - مرکس ملر
Nather, E. S.	۴۱۱ - ناتھر
Nanphal, I.	۴۱۲ - نوفال
Neale, W. H.	۴۱۳ - نیسل
Neilson J. B.	۴۱۴ - نیلسن
Niemanu, A. K.	۴۱۵ - نی مین

۴۱۶ - نللینو	Nallino Carlo Alfouso
۴۱۷ - نبیہ عبود	Abbot, N.
۴۱۸ - نسطاس بازنطینی	Nicetas of Byzantni
۴۱۹ - والٹیر	Voltair, F. M.
۴۲۰ - وارف	Wayriffe, V.
۴۲۱ - ولہازن	Welihausen
۴۲۲ - ویلز	Wells, H. G.
۴۲۳ - ویلزوفر	welzhofer, H.
۴۲۴ - وینسنک	Wensinck, A. J.
۴۲۵ - ولیم	William Monier
۴۲۶ - وڈس	Woods, Mathew
۴۲۷ - وہائٹ	White goseph Planco
۴۲۸ - ویہرن	Wyharne, goreph
۴۲۹ - ولیم مارسہ	marcais, W.
۴۳۰ - ولیم رائٹ	Wright, W.
۴۳۱ - وپکے	Frantz woepcke

goham. G. Wetzstein	۴۳۲ - ویٹسٹین
Hottinger, J. H.	۴۳۳ - ہاٹنجر
Hallan	۴۳۴ - ہالان
Hackspam	۴۳۵ - ہیکس پین
Hall, m. p.	۴۳۶ - ہال
Hartman. m.	۴۳۷ - ہارٹ مین
Haumer, P. J.	۴۳۸ - ہیمر
Hanri, goh	۴۳۹ - ہوری
Haurt, C. L.	۴۴۰ - ہارٹ
Havet. Erset	۴۴۱ - ہیوٹ
Hawkins, A.F.H.	۴۴۲ - ہاکنس
Herbelold	۴۴۳ - ہربلوٹ
Hell, goseph	۴۴۴ - ہیل
Herbel of de molainville	۴۴۵ - ہربل
Halphen, L.	۴۴۶ - ہالفن
Hermalin, D.	۴۴۷ - ہرمیلن

۴۴۸ - ہجین Higden, Rannlf.

۴۴۹ - ہنڈاس Hondas, O. V.

۴۵۰ - ہبتر Hubrer, F.

۴۵۱ - ہیوز Huzhes, J. P.

۴۵۲ - ہیوز Huzhes, willin

۴۵۳ - ہاروے New Comb harvey

۴۵۴ - ہمفرے Prideau humphrey

۴۵۵ - یوپی نیوس Eupeuins Thomas

۴۵۶ - یولوجیس قرطبی Enlogiuu Cordovem

۴۵۷ - یوجین یونگ Eugenc yomg.

حضرت ابراہیم اور مستشرقین

از

جناب مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم (سابق ناظم جمعیۃ العلماء ہند)

"کلام پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر جس طرح آیا ہے، اس پر بعض مستشرقین نے اپنے خیالات کا اظہار کر کے آپ کی ذات مقدس [illegible] شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے اپنی [illegible] القرآن جلد اص ۱۵۶ تا ۱۹۰ میں بڑی اچھی بحث کی ہے" (ادارہ)

مستشرقین یورپ کی ایک [illegible] اسلام [illegible] میں ہمیشہ [illegible] رہی ہے، اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآن عزیز کے خلاف بے دلیل ان کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے، ایک موقع حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا بھی ہے،

دائرۃ المعارف الاسلامیہ نے دنسنک کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیفہ کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی، البتہ عرصۂ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے، اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے، چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا، اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوک ہیکر ونیہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا، اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا، اس نے کہا قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں، ان میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل علیہ السلام

(۱) جلد اص ۲۷-۲۸

کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا، اور نہ ان کو اول مسلمین بتایا گیا ہے، بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں، ان کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جوان کو موسس کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملت حنیفی کا داعی ظاہر کرتی ہو، سورۂ الذاریات، الحجر، الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیا، اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں، اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمین عرب میں کوئی نبی نہیں آیا، اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا،

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں،

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے، اور انہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی انھوں نے اسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے، لیکن جب مدینہ پہنچکر انھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی، تو انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا، اور وہ آپ کے دشمن ہوگیے، اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا، اور خوب سوچا، آخر ان کی ذکاوت اور جودت طبع نے رہنمائی کی اور انھوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیت ابراہیمی کہنا چاہیے، لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کیلئے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملت حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیل ؑ کے والد، کعبہ کے موسس نظر آتے ہیں" (Het Mekkaansche Feest ص ۲۰)

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور دینسک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں، کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے، اور نیز یہ کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی، لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے، تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے، اس لیے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے، کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سرتاسر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ کھلی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف انہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں حضرت ابراہیمؑ کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیمؑ کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے ان کے نام ہی سے معنون کر کے نازل کی گئی ہے یعنی سورۂ ابراہیمؑ، اس کو نظر انداز کر دیا گیا، تاکہ قرآن عزیز سے براہ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے، اور کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں،

سورۂ ابراہیمؑ مکی ہے، اس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے، اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے:

(۱) حضرت ابراہیمؑ عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں، اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا	اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا
وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ	مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ	کی پرستش سے دور رکھ۔ اے پروردگار!
النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ	بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو

وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ
(سورہ ابراھیم ع ۶)

گمراہ کر دیا پس جو شخص میری پیروی کرے
وہ میری جماعت میں سے ہے اور جو میری نافرمانی
کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے،

(۲) حضرت ابراہیمؑ اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز (جو عرب کا قلب ہے) انہی کی اولاد سے آباد ہوئی، اور انھوں نے ہی اس کو بسایا ہے، اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت محرم (کعبہ) کے موسس ہیں،

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ
غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ
رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ
اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْ
اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝
(ابراھیم ع ۶)

اے ہمارے پروردگار! بے شک میں نے
اپنی بعض ذریت کو اس بن کھیتی کی سرزمین
میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے
اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے تاکہ وہ
نماز قائم کریں، پس تو لوگوں میں سے کچھ
کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ اس کعبہ
کی بدولت ان کی جانب مائل ہوں، اور
ان کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ شکر گذار ہیں،

(۳) حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ و حضرت اسحٰقؑ کے والد ہیں، اور یہی اسمٰعیلؑ اہل عرب کے باپ ہیں، اور حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی اولاد کیلئے ملت حنیفی کے شعار "صلوٰة" کی اقامت کی دعا کر رہے ہیں،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ
عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ
اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ
اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ
ذُرِّیَّتِیْ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝
رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ

سب تعریف اس اللہ کیلئے ہے جس نے مجھ کو
بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ بخشے، بلاشبہ
میرا پروردگار ضرور دعا کا سننے والا ہے،
اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز
قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے
پروردگار، ہماری دعا سن، اے ہمارے پروردگار،

وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ	تو مجھ کو اور میرے والدین کو اور کل مومنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخش دے،
(۳۹-۴۰-۴۱) ابراھیم ع ۶)	

ان آیات کے مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقین یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے، کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں۔ اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے،

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیمؑ کے علاوہ سورۂ انعام اور سورۂ النحل بھی مکی سورتیں ہیں، ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ شرک کے مقابلہ میں ملت حنیفی کے داعی ہیں، اور ان کی شخصیت آل دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ	بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اسی ذات کی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ	طرف متوجہ کرتا ہوں جو آسمانوں اور زمین کا
مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ (الانعام)	پیدا کرنے والا ہے، اور میں شرک کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں
قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا	کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے سیدھی
قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ	راہ کیطرف ہدایت کی ہے، جو کج راہ سے
حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ	الگ، صاف اور سیدھا دین ہے ملت
مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝	ابراہیمؑ کی، جو تھے ایک خدا کی طرف جھکنے
(الانعام: ۱۶۱ ع ۲۰)	والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے،
اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا	بے شک ابراہیمؑ تھا راہ ڈالنے والا
لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَّلَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ	حکم بردار صرف ایک خدا کی طرف جھکنے والا، اور
(سورۃ النحل: ۱۵)	نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے،

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(سورۃ النحل: ۱۵)

پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کی، تو پیروی کر اس ابراہیم کی ملت کی جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے، اور نہیں ہے مشرکوں میں سے،

تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے، جو اس سلسلہ میں سنوک اور اس کے ہمنواؤں نے بیان کیے ہیں؟ کی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیمؑ کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملت حنیفی کے داعی، حضرت اسمٰعیلؑ اور عرب کے باپ، کعبہ کے موسّس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں، اور اس لیے مستشرقین یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے، نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گذرا، اس لیے کہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ اور ہودؑ و صالحؑ علیہم السلام اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں،

ان مدعیان علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (توراۃ) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں، اس لیے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ اسمٰعیلؑ، ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، اور اسمٰعیلؑ ہی عرب کے باپ ہیں، اور ابراہیمؑ کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی، اور یہ دونوں باپ اور بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں،

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ "مکہ کی زندگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور ان کے مذہبی امور کی تقلید کی، اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور ان کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی، اور اس کو ملت ابراہیمی کا لقب دیا" اس لیے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود

سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا، البتہ مدینہ میں آکر آپؐ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی، اور یہ اس لیے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دین موسوی کے پیرو تھے، اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی، مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے، اور ان محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے ایسے جملے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں، اور ان سے آپؐ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں، نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحیِ الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور دین موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں، اس لیے آپؐ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملّت ابراہیمی یعنی اسلام قبول کرلیں گے، لیکن جب آپؐ نے ان کے انکار، بغض و حسد کا تجربہ کرلیا تو پھر ان کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا، جو مشرکین کے ساتھ تھا، اور بمصداق "الکفر ملۃ واحدۃ" (کفر سب ایک ملّت ہے) آپؐ نے ان سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا،

اسپرنگر، سنوک اور ان کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں، یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے، اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیلؑ کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے، تو ان کا یہ کہنا کہ ابراہیمؑ بھی یہودی تھے، کس قدر مضحکہ خیز تھا، کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا،

پس اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآن عزیز نے یہ اعلان کیا:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا — ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی، البتہ

وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا — وہ تھے ایک خدا کی طرف جھکنے والے مسلمان،

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر رہے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے ان کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوت طبع سے یہودیت ابراہیمی ایجاد کرلی، سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

سنوک اور اس کے ہم نواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا، قرآن عزیز کی اس آیت کو پیش کیا ہے،

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ — تاکہ تو ڈرائے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرانے

مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ، — ایسی قوم کو کہ نہیں آیا ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا،

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم و اسمٰعیل عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآن عزیز امت عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا،

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآن عزیز کے طرز خطابت، اسلوب بیان، اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے، یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے،

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے، مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لیے سائبہ، بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، اور مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد و ضوابط وغیرہ، اس لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بددین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے، ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں، اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے،

قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ — (مشرکین نے کہا) ہم نے اسی (بت پرستی)

اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا، — پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے، اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے،

تب قرآن عزیز نے ان کے باطل عقائد کی حقیقت کو ان پر واضح کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لیے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، کہ حسی اور عقلی

راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اس کا مرغوب مذہب ہے، اور یا نقلی روایات اس کا قطعی یقینی اور ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتی ہوں، کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے، اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوے کے لیے بند ہیں تو وہ دعویٰ باطل اور اس کا مدعی کاذب ہے،

پس قرآن عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لیے آیاتِ قرآنی کے تین حصے کر دیے ایک حصہ میں ان کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ "اللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا" (ہم کو خدا نے ایسا شرک کرنے ہی کا حکم دیا ہے) بالکل غلط اور سرتاپا باطل ہے، اس لیے کہ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ
أَتَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ
(سورۃ الاعراف)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم
نہیں دیا کرتا، (اے مشرکین) کیا تم اللہ
کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے،

اور دوسرا حصہ ان کے باطل دعوے پر حسّی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ انھوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں، اور جن پر ان کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہلِ عقل کے نزدیک قابلِ تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ
وَلَهُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ خَلَقْنَا
الْمَلَائِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ
شَاهِدُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ
إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ
اللّٰهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝
أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ ۝
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝

پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان
سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار
کے لیے لڑکیاں ہیں اور ان کے لیے لڑکے
کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا، اور
اس وقت وہ موجود تھے، خبردار بلاشبہ یہ
سب ان کی بہتان طرازی ہے کہ یہ کہتے
ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے، بلاشبہ یہ قطعاً
جھوٹے ہیں (یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے) اپنے

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝	اپنے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کیا ہے
(الصّٰفّٰت ع ۵)	(اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا)
	حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل کرو گے؟

اور تیسرا حصہ ان کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآن عزیز ان سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمھارے پاس اس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی حجت اور دلیل نازل ہوئی ہے یا اس کے پاس سے ان عقاید کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے، اگر ایسا ہے تو پیش کرو؟

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَأْتُوْا	کیا تمھارے پاس کوئی ظاہر حجت اور
بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ	صاف دلیل ہے پس تم اپنی (خدا
صٰدِقِيْنَ ۝	کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب
(الصّٰفّٰت ع ۵)	لاؤ اگر تم سچے ہو،

اب اگر ان کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے ان کے پاس نہ کوئی حسی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اس کی منضبط شریعت بھی! بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمھارے پاس اپنے دعوائے باطل کے سلسلہ میں نہ عقلی سند ہے نہ نقلی، اور ان کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے،

اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ	تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن کو تم پوجتے
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا	ہو مجھے دکھلاؤ کہ انھوں نے زمین سے کیا
خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ	بنایا، یا کیا ان کی آسمانوں میں (اللہ کے ساتھ)
شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ	کوئی شرکت ہے، اس سے پہلے کوئی کتاب
اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ	اگر تمھارے پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق

هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ	کرتی ہو) تو وہ لے آؤ یا علم اولین میں
(سورۃ الاحقاف ع ۱)	سے کوئی بقیہ علم تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔

پس یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآن عزیز کی اُن آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا، ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمین عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم رہی ہے، اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سب سے پہلی آمد ہے، قرآن عزیز ایسی خلاف حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا، جب کہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النحل کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں، اور قرآن عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اسی بات کا اقرار، اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنے والے انسان کا کلام۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ	کیا انھوں نے قرآن میں غور نہیں کیا،
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا	اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام
فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝	تو ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور ونسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افتراء ہیں، اور ان کے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآن عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ ان کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے، بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں، بلکہ اس قسم کے الزامات سے ان کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا

ہے جس کو قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لیے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے،

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً،

یہ (منکرین قرآن و اسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی ان کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں،

اس لیے ان منکرین (کافروں) کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے،

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا،

اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہ یاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا،

بہرحال قرآن حکیم کی مسطورۂ بالا بیشتر آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبر عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے،

اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک میں موجود تھے، ان کے گزشتہ آباء و اجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے،

تاریخ ارض القرآن
میں
مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات

(از حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین)

"تاریخ ارض القرآن" مولانا سید سلیمان ندوی" کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے، مگر ذوق نظر اور تحقیق و تنقید کی وسعت اور جامعیت کے لحاظ سے اس کا شمار ان کی شاہکار تصنیفات میں ہوتا ہے،

قرآن مجید میں عرب کی قدیم قوموں مثلاً عاد، ثمود، مدین، سبا اور قوم تبع وغیرہ کا ذکر بار بار آیا ہے، پیغمبروں اور ان کی قوموں کے ساتھ ان کے علاقوں اور بستیوں کا بھی ذکر ہے، قدیم مفسرین کا اصل مقصد جغرافی اور تاریخی انکشافات کی تحقیق نہ تھا، اس لیے ان سے بعض اسرائیلی روایات کے نقل کرنے میں کچھ تسامح ہوا، اور ایک زمانہ کے بعد جب مستشرقین یورپ کے سامنے جدید جغرافی و تاریخی حقیقتیں آئیں تو ان کی کلیسانہ فطرت کو مسلمان مفسرین و مورخین پر حتیٰ کہ خود قرآن مجید کے بیانات پر شک اور اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ آیا، ان کی ظاہری علمی سنجیدگی نے جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایک طبقہ کو بھی کچھ حد تک متاثر کیا، مولانا سید سلیمان ندوی" کے پیش نظر یہ سارے حقائق تھے، چنانچہ ارض القرآن میں جہاں عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق ہے، وہاں مستشرقین کے بعض اعتراضات

کے جوابات بھی ہیں، سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں بھی اسی جذبہ کی نمائش کارفرما تھی، ارض القرآن کو سیرۃ النبیؐ کا دیباچہ سمجھنا چاہیے، جیسا کہ خود سید صاحب نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "جب میں دفتر سیرت نبویؐ کے جب وہ اسسٹنٹ تھے، تو اس موضوع کا خیال آیا، بلکہ اصل میں سیرت نبویؐ کے دیباچہ کے طور پر اس کے لکھنے کی تحریک ہوئی، (دیباچہ ج ۱ ص ۶، اڈیشن ہم ۱۹۵۵ء) لیکن جیسے جیسے سید صاحب آگے بڑھتے گئے میدان زیادہ وسیع اور کشادہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ یہ بالکل مستقل ایک تصنیف بن گئی،

سیرۃ النبیؐ کی طرح سید صاحبؒ کا طرز تحریر اس کتاب میں بھی مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ ہے، اس میں جہاں مستشرقین کے غلط اور باطل نظریات و تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے، وہاں ان کی محنت و کاوش کی داد بھی دی گئی ہے، البتہ جب ذات رسالتمآبؐ پر کسی نے انگشت نمائی کی کوشش کی ہے تو سید صاحبؒ کے قلم میں ایک شدت ضرور پیدا ہو گئی ہے،

اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات جواہر ریزوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں، اس مضمون میں ان کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس طرح اس کتاب کے صرف ایک پہلو پر نظر ڈالی گئی ہے، ورنہ درحقیقت اس کتاب کی علمی افادیت اور تاریخی اہمیت کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا تھا، کہ اس کتاب میں ایک خاص پہلو سے "قرآن فہمی" کے معیار میں فکری انقلاب پیدا ہو گیا، (حوالہ مضمون تاریخ القرآن از مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف سلیمان نمبر ص ۲۱۷)

سید صاحبؒ نے شروع میں ایک بڑا قیمتی مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں اس کتاب کے موضوع اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ قدیم و جدید معلومات کی تطبیق کر کے ارض القرآن (عرب) کے حالات کی اس طرح تحقیق کی جائے کہ قرآن مجید کی صداقت اور معترضین کی لغزش علی الاعلان آشکارا ہو جائے،

قرآن مجید نے عبرت کے طور پر عرب کی کئی قوموں اور ان کے انبیاء کے حالات بیان کیے ہیں، چونکہ

عرب کی قوم تصنیف و تالیف سے آشنا نہیں تھی، اس لیے ان انبیاء و اقوام اور ان کے تاریخی، سیاسی قومی، مذہبی اور جغرافی حالات کی تفصیل میں مسلمان مصنفوں نے غیر محتاط طریقہ پر زبانی روایات سے کام لیا، جب کہ یورپ نے اس کے برخلاف یونانی و رومی سیاحوں کے تحریری بیانات اور عرب کے آثار قدیمہ اور نقوش و کتبات کو دلیل میں پیش کیا، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت سے شاید کسی مسلمان کو انکار نہ ہوگا، قرآن مجید میں عرب کی بیسیوں قوموں، شہروں اور مقامات کے نام ہیں، جن کی ہر قسم کی صحیح تاریخ سے نہ صرف عوام بلکہ علماء تک ناواقف ہیں، اور نہایت عجیب بات ہے کہ تیرہ سو برس میں ایک کتاب بھی مخصوص اس فن پر نہیں لکھی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود مسلمانوں کو ان حالات سے ناواقفیت رہی، اور دوسری طرف غیروں کو انھیں افسانہ کہنے کی جرأت ہوئی" (تاریخ ارض القرآن ج اص ۴، ایڈیشن چہارم ۱۹۵۵ء)

سید صاحبؒ کو مستشرقین کی محنت و کاوش اور جانفشانی و کوشش کا بخوبی احساس تھا، وہ ان جرمن، فرانسیسی، اٹالین اور انگریز مستشرقوں کے کام سے واقف تھے، کہ ان لوگوں نے یونانی و رومی تصنیفات سے جو عرب قبل اسلام کے حالات سے پر تھیں، ان کا انتخاب و خلاصہ کیا، قرآن مجید نے جن قوموں اور بستیوں کا ذکر کیا ہے، ان کے کھنڈروں کا ان لوگوں نے مشاہدہ کیا، ان کے کتبات کو حل کیا، اور پھر ان سے عجیب و غریب نتائج کا استنباط کیا، مگر سید صاحبؒ کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ یہ مستشرقین مسلمان نہیں، یہودی یا عیسائی ہیں، اور ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن مجید کے فوائد کو پامال کیا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

"بعض متعصب مستشرقین نے ان معلومات کو غلط طور سے قرآن کی مخالفت میں استعمال کیا ہے، اٹھارہویں صدی کے وسط میں ریورنڈ فارسٹر نے عرب کا تاریخی جغرافیہ لکھا جس میں اس نے اپنی جہالت کے عجیب و غریب نمونے پیش کیے، جن کو پڑھ کر کبھی ہنسی اور کبھی رونا آتا ہے۔ لیکن کیا کیجئے کہ ہماری غفلت سے وہ قرآن

کی صداقت تاریخی کا معیار ہے..... نولدیکی نے عمالقہ و عاد کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں، دکن، اور روبرٹسن اسمتھ عرب کے اوتائے نسب کا انکار کرتے ہیں، عرب کے بعض اثری اکتشافات کی بنا پر یورپ کے بعض سبک مغز مصنفین جرأت کے ساتھ کہتے ہیں، کہ "قرآن کے پہلے کا عرب قرآن کے بعد کے عرب سے ہزار درجہ بہتر تھا، لیکن ایک فرانسیسی مستشرق سینٹ ہلیر نے اس کا عمدہ جواب بھی دے دیا کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو قرآن تمدن و تہذیب کے عام ابتدائی تعلیمات اور کم از کم محرمات نکاح کے بیان کی تکلیف گوارا نہ کرتا۔"

(تاریخ ارض القرآن ج ا ص ۵)

سید صاحبؒ نے ارض القرآن کی تاریخ و تحقیق کے لیے چار ماخذ کو سامنے رکھا ہے، (۱) ادبیات اسلامیہ (۲) ادبیات اسرائیلیہ (۳) ادبیات یونانیہ درومانیہ، اور (۴) اکتشافات اثریہ (آرکیالوجیکل فرائنڈ) اس سلسلہ میں انھوں نے چند ایسی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو مستشرقین نے بنظر استحسان دیکھا ہے مثلاً ابن الحائک ہمدانی ایک عرب جغرافیہ نویس تھے، ان کی دو کتابیں "صفۃ جزیرۃ العرب" اور "اکلیل" ہیں، پہلی کتاب عام جزیرۃ العرب کا جغرافیہ، اور دوسری کتاب الاکلیل صرف یمن کی تاریخ ہے، یورپ میں اس کتاب کا اکثر حصہ برٹش میوزیم لندن اور رائل لائبریری برلن میں موجود ہے، ان کے علاوہ سید صاحب نے کئی اور کتابوں کا ذکر کیا ہے (ایضاً ص ۱۷- ۱۹)

انساب اور مستشرقین فن انساب، عرب کا ایک محبوب فن تھا، فخر و مباہات کے اظہار کے لیے عرب کا بچہ بچہ اپنے نسب کا یاد رکھنا ضروری سمجھتا تھا، شعرائے عرب اکثر قبائل کے سلسلۂ انساب کو محفوظ رکھتے تھے، اور ان کے لیے یہ اس لیے ضروری تھا کہ مدح و ہجو کے موقعوں پر اس کا ذکر کر سکیں، زمانۂ جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی، عرب میں بڑے بڑے علمائے انساب گزرے ہیں، جو عرب کے تمام قبائل کے اور اکثر ہر قبیلہ کے مشاہیر کے نسب سے واقف تھے، اور جب دوسرے علوم کی تدوین کا کام شروع ہوا تو یہ فن بھی مدون ہوا، اور علمائے انساب نے اس فن میں کئی کتابیں لکھیں، فضل کلبی

ہشام کلبی، محمد بن سائب کلبی، مدائنی، فاکہانی، زبیری، زبیر بن بکار، اصمعی، ابو عبیدہ بن ہشام، مبرد، ازرقی بلاذری، سمعانی، ابن حزم اور قلقشندی وغیرہ اس فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی روایات کمزور اور یقینی صحت میں کمتر درجہ کی بھی ہیں، لیکن روبرٹسن اسمتھ اور نولڈیکی ان روایات سے آگے بڑھ کر اس پورے فن کا ہی انکار کرتے ہیں، نولڈیکی لکھتا ہے:

"اب علماء کے لیے موقع آگیا ہے کہ ان طفلانہ خیالات کو پس پشت ڈالدیں جو چاہتے ہیں کہ عرب کی کتب انساب کو جن کو محمد کلبی اور اس کے بیٹے ہشام کلبی نے گھڑ لیا ہے، مانیں تاکہ باہم قبائل عرب قدیمہ وجدیدہ کے تعلقات تحقیق و یقین کے ساتھ ظاہر ہوں، کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ تمام قبائل بنی قیس جو وسط ملک عرب میں آباد ہیں، وہ صرف ایک شخص کی نسل سے ہوں، یعنی قیس کی، جو مسیح سے کچھ پہلے تھا۔ اس لیے ہماری تحقیق یہ ہے کہ کوئی قبیلہ درحقیقت اپنے اس پدر اول سے واقف نہیں جس کی طرف وہ منسوب ہے۔ (ایضاً ص ٢٠)

روبرٹسن اسمتھ کا خیال بھی یہی ہے کہ:

"یہ محقق ہو چکا ہے کہ چند قبائل زمانۂ ماضی غیر قدیم میں کسی تاریخی شخص کی طرف منسوب ہیں۔"

(ایضاً: ص ٢١)

سید صاحبؒ نے ان دونوں مستشرقوں کی رائے کو نقل کر کے ان سے دریافت کیا ہے کہ آخر اس بے اعتباری کے دلائل کیا ہیں؟ وہ لکھتے ہیں کہ:

"عرب کے ایک ایک قبیلہ کیلئے ضروری تھا کہ دوستوں کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے لیے انساب محفوظ رکھے، عرب کا ہر وہ قبیلہ جو غیر پدر کی طرف انتساب کرتا وہ عرب میں حقیر و ذلیل سمجھا جاتا، اور بطور نشان ملامت کے اس کا نام لیا جاتا، شعرائے عرب مختلف مواقع کے لیے انساب کے زبانی یاد رکھنے پر مجبور رہتے تھے، کیا ان واقعات کے بعد بھی اس عام بے اعتباری کی کوئی مناسب وجہ ہے؟ بنو قیس کی طرح چھ سو برس کی

مدت میں ایک شخص کی اولاد سے چند بطون و قبائل کا پیدا ہو جانا کوئی محال امر نہیں۔" (الیضاً[۲۱])

سید صاحبؒ اس کے بعد ان مستشرقین کے اعتراض کی اصل وجہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"یورپ کے ان علمی توہّم پرستوں کے انکار انساب کی بنیاد مسئلہ طوطمیت (ٹوٹزم) پر ہے، طوطمیت اس کا نام ہے کہ "اشخاص و قبائل کا اپنے کو دیویوں، ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی طرف منسوب کرنا" قدیم زمانہ میں جب انسان بچہ تھا، جب کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا تھا، تو وہ انسانوں کی والدیت سے نکل کر دیویوں کی نسل قرار پاتا تھا، وہ دیویاں خواہ ستارے ہوں یا حیوانات ہوں، یا درخت ہوں، ہندؤں میں سورج بنسی اور چندر بنسی وغیرہ قبائل تھے، جو اپنے کو انسانوں کے نہیں، بلکہ آفتاب و ماہتاب کے بیٹے کہتے تھے، اس لیے سورج اور چاند کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیے، کہ وہ اس قبیلہ کے مورث اوّل کا نام ہے بلکہ وہ اس قبیلہ کی دیوی کا نام ہے۔"

"قبائل عرب میں بھی بنو شمس وغیرہ اسی قسم کے نام ہیں، اور حیوانات کے نام تو بکثرت آتے ہیں، جیسے بنو اسد، بنو فہد، بنو ثعلب، بنو کلب، بنو نمل، بنو عجل وغیرہ، نظریہ طوطمیت کے مطابق شمس، اسد، فہد، ثعلب، کلب، نمل، عجل اشخاص تاریخی نہیں ہیں، اور نہ ان قبائل کے مورث اوّل کے نام ہیں، بلکہ یہ ان ستاروں اور جانوروں کے نام ہیں، جن کی پرستش وہ قبیلے کرتے تھے، اور ان ہی کی طرف اپنے کو منسوب سمجھتے تھے لیکن یہ محض علمی توہّم پرستی ہے، عرب میں کبھی اس قسم کا خیال نہیں پیدا ہوا، اس خیال کی پیدائش عراق، ہندوستان، مصر اور یونان کی میتھالوجی (علم الاصنام) میں ممکن ہے اس قسم کے نام عرب میں صرف چند ہیں، اور جو ہیں ان میں کلب (کتا)، نمل (چیونٹی) ثعلب (لومڑی) کون سی گرامی قدر ہستیاں ہیں جن کے انتساب سے خاندان کی بنیاد قائم ہوا، اور یہ اس قسم کے نام ہیں جن سے اس زمانۂ روشن کا طبقۂ متمدن بھی خالی نہیں تم نے بعض انگریزوں کے نام FOX (لومڑی) بل (BULL) سنے ہوں گے، کیا

یہ بھی طرح سے ہے"۔ (ایضاً: ص ۲۰-۲۱-۲۲)

سید صاحبؒ کی مذکورۂ بالا عبارت سے نولڈیکی اور ان کے ہم نواؤں کے اعتراضات کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟

ادبیات رومانیہ کا ایک جغرافیہ نویس

سید صاحبؒ نے ادبیات یونانیہ و رومانیہ کے زیر عنوان ایک باب قائم کیا جس میں ان یونانی و رومانی مورخوں اور سیاحوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے، جو قرآن کی مذکورہ قوموں کے معاصر یا قریب العصر تھے، ان میں بطلیموس اسکندریہ کا مشہور ہیئت داں وجغرافیہ نویس تھا، اس نے خود تو عرب کی سیاحت نہیں کی تھی، تاہم اسکندریہ میں عرب تاجروں سے وہ ملاقاتیں کرتا تھا، ان تاجروں اور دوکان داروں سے دریافت کرکے اس نے عرب کا جغرافیہ ترتیب دیا تھا اور اس میں عرب کے مشہور قبائل، شہر، گاؤں، پہاڑ، سواحل، تجارتی منازل اور تجارتی راستوں کو بیان کیا تھا، عرب آبادان میں اس کے بیان کے مطابق ایک سو چھیالیس آبادیاں تھیں، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چند ناموں کے سوا اب ان قبائل و منازل کے نام خارج از فہم ہیں، جرمن مستشرق اسپرنگر کی کتاب "قدیم جغرافیہ عرب" جو ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی تھی، اس میں بطلیموس کے ناموں اور مقاموں کا عرب جغرافیہ نویسوں اور موجودہ سیاحوں کے بیانات سے مقابلہ کیا گیا تھا، اور بطلیموس کے مذکورہ ناموں کی صحت ثابت کی گئی تھی، لیکن سید صاحبؒ اسپرنگر کی اس تحقیق و تطبیق سے متفق نہیں ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ چند ناموں کے سوا اور تمام ناموں کی تطبیق بہ تکلف ہوسکتی ہے اور اس کی مثالیں ہماری کتاب میں جابجا ملیں گی، اور یہی شکایت مسعودی اور یاقوت حموی تقریباً آٹھ سو برس پہلے کرچکے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبائل عرب زیادہ تر بادیانہ زندگی کے عادی تھے، اس لیے ان کے مقامات کی تعیین نہایت مشکل ہے، پھر بطلیموس کی، تاجروں اور کاروانوں کی زبانوں سے ان کی تحقیق اور یونانی حرف و لہجہ میں ان کی تعبیر اور پھر انقلابات و حوادث روزگار کا تواتر، کاتبوں کی جہالت اور ناآشنائی فن، ان

ذریعہ سے قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ایک لفظ اپنے صحیح مخرج سے کہاں کہاں جا پڑا ہوگا۔"

(ایضاً: ص ۲۸، ۲۹)

اکتشافات اثریہ اور مستشرقین

"اکتشافات اثریہ" (ص ۳۱) کے زیر عنوان سید صاحبؒ نے قدیم عربوں کے بہت سے آثار، عمارات اور یادگاروں کی بازیافت کی مہم میں علمائے یورپ کی کوششوں کی تعریف کی ہے، کتبات اور نقوش زیادہ تر حمیری، سبائی، آرامی اور نبطی خط میں ہیں، ان کتبات کو حل کرنے کے فن کو مستشرقین نے بے حد ترقی دی، اور اس اشاعت میں بے انتہا برگ و بار پیدا کر کے اس کو مستقل ایک فن بنا دیا، لیکن سید صاحبؒ کی تحقیق کے مطابق بہر حال اولیت کا سہرا ان کے سر نہیں ہے، وہ لکھتے ہیں:

"دولت بنی امیہ اور عباسیہ کے ابتدائی زمانہ میں جبکہ تاریخی مذاق مجتہدانہ حیثیت رکھتا تھا، ان آثار کی تحقیق کی گئی اور ان میں سے اکثر خطوط اور زبانوں سے اس عہد کے علماء واقف تھے، ذوالنون مصری جو دوسری صدی میں تھے، مصر کے خط برابی (ہیروگلفی) پڑھتے تھے، حمیری محقق علامہ ہمدانی نے صفۃ جزیرۃ العرب اور الاکلیل میں تمام مشہور آثار کے نام گنائے ہیں، اور ان کے تفصیلی حالات کے لیے اپنی کتاب "اکلیل" کا حوالہ دیا ہے، قلعۂ ناعط جو سلاطین یمن نے پہاڑ کی چوٹی پر بنایا تھا، اسلام سے تقریباً پندرہ سو برس قبل کی تعمیر ہے، وہب بن منبہؒ (جنھوں نے صحابہؓ کا زمانہ پایا تھا) اس کا ایک کتبہ پڑھا تھا، ہمدانی کے علاوہ مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں، یاقوت نے اپنی معجم میں، نویری نے اپنے جغرافیہ میں اور قزوینی نے اپنی آثار البلاد میں اسی قسم کے آثار و کتبات کا ذکر کیا ہے۔" (ایضاً: ج ۱ ص ۳۲، ۳۴، ۳۵)

لیکن سید صاحبؒ نے فراخدلی سے اس کا اعتراف کیا کہ یہ بہر حال ادھوری کوششیں تھیں، علمائے یورپ نے ان کو بہت ترقی دی، اس کے بعد سید صاحبؒ نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور مختلف سیاحوں مثلاً نیوبھر، ہز برگ، ہمپرچ، ارناؤ، ہالوے، ورڈیے، ہریش، برکہارڈ، بیڈیے ایچ اچارس

ڈوٹے اور ہیوبر کی تحقیقات واکتشافات کاذکر ایجاز کے ساتھ کیا ہے، ہیوبر کی تحقیقات کو وہ عام حالات وواقعات سے بلند تر اور زیادہ علمی سمجھتے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ ہیوبر کو عرب کی آرکیالوجی اور ٹاپوگرافی کا محسن سمجھتے ہیں۔ (ارض القرآن: ص ۴۴)

تاریخ قدیم کے بعض اصول | سید صاحبؒ نے تاریخ قدیم کے بعض اصول کے تحت مختصر مگر نہایت عالمانہ بحث کی ہے، تاریخ قدیم کی ترتیب وتدوین میں سب سے بڑی دقت اور دشواری جو پیش آتی ہے، وہ زمانہ کی تعیین اور ناموں کے اتحاد واختلاف کی ہوتی ہے، سید صاحبؒ نے اس ضمن میں چند اصول مقرر کیے ہیں، مثلاً اصول تعیین زمانہ یعنی جدید طرز تاریخ کی رو سے قبائل کے دور اور عہد کی تعیین کی جائے، عام طور سے کسی مجہول العہد قوم کے زمانہ کی تعیین اس طور پر کی جاتی ہے کہ اسی قوم کی ہمعصر قوم یا کسی شخص کے زمانہ سے اس کا قیاس کیا جاتا ہے، ایک اصول یہ بھی ہے کہ تاریخی اشخاص اور ان کے مقامات سکونت کے ناموں کا یا دو قوموں کی زبان، اشخاص اور دیوتاؤں کے ناموں کی آپس میں تطبیق دی جائے جس سے مقامات سکونت اور اتحاد قومیت کی طرف اشارہ مل سکتا ہے، مستشرق فارسٹر نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر اپنی کتاب "عرب کا تاریخی جغرافیہ" میں چند نتائج پیدا کیے، سید صاحبؒ ان نتائج کو کارآمد قرار دیتے ہیں، گو بعض مقامات پر فارسٹر صاحب کے استنباطات سید صاحبؒ کی رائے کے مطابق وہم وظن سے آگے کا علم نہیں بخشتے اور کہیں علم کے بجائے وہ جہالت کا ثبوت پیش کرتے ہیں، فارسٹر کے اخذ کردہ اصول کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

> "اس اصول کے اجراء میں دو بہت بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، پہلی یہ کہ زمانہ کے امتداد، قوموں کے انقلابات اور زبانوں کے تغیر سے نام کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں، اس لیے مقامات اور باشندوں کے ناموں میں تطابق کے بجائے کہیں صرف تشابہ پر قناعت کرنی پڑتی ہے، دوسری دقت جو پہلے سے مشکل تر ہے، یہ ہے کہ سامی زبانوں میں باہم اور نیز یونانی زبان میں جس میں تورات کا قدیم ترجمہ ہے، اور اب زیادہ تر وہی پھیلا ہوا ہے، جب ایک نام ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو

بعض حروف کا خصوصیت زبان کی وجہ سے مبادلہ ہو جاتا ہے، مثلاً ہجر اور ہاجر، اسمائیل اور اسماعیل، ثمود اور ثمود، حصارموت اور حضرموت، ضحاک اور اسحاق حدرموت اور حضرموت، ابراہام اور ابراہیم وغیرہ۔" (ارض القرآن ج ۱ ص ۱۵ تا ۴۵)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے اصول اتحاد اسماء والسنہ کو اس بحث میں سب سے مفید اور کارآمد قرار دیا ہے، کہ ہر قوم کے نام کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے، جس میں اس کی قومیت کا امتیاز پوشیدہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر دو قوموں کے ناموں میں باہمی تشابہ نظر آئے گا، تو یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے، کہ یہ دونوں قومیں حقیقت میں متحد الاصل ہیں، یہی حال مذہبی اعتقادات کے تشابہ اور زبان کے الفاظ کی مماثلت کا بھی ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اقوام کے اتحاد نسل کی یہ بھی ایک دلیل ہے، گو مبہم ہے،

جغرافیۂ عرب اور فارسٹر اوپر بطلیموس کا ذکر آچکا ہے، جس نے عرب کی جغرافی تقسیم کو مرتب کیا، اور اس کی یہ ترتیب سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہوئی، اس نے اپنے جغرافیہ عرب کے ۴۵ قبائل، ۱۶۴ مقامات، ۵۰۷ کوہستانی سلسلے اور ۴ دریاؤں کا ذکر ہے، لیکن بطلیموس کے مخالفوں کو ان ناموں کو تسلیم کرنے میں پس وپیش ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان ناموں کا وجود و مصداق بطلیموس کے دماغ کے سوا خارج میں کہیں نہیں ہے، لیکن بطلیموس کے معتقدین اس الزام سے برہم نظر آتے ہیں، ان کی نمایندگی فارسٹر کرتے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب میں ۱۵۷ ناموں کی تحقیق کی ہے، سید صاحبؒ اس تحقیق کو "عالمانہ جہالت" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"غریب فارسٹر کو نہیں معلوم کہ یہ قبائل کب پیدا ہوئے، ان مقامات میں کب آباد ہوئے اور عربی میں ان کا صحیح نام کیا ہے، وہ بطلیموسی قبائل کے ناموں کو حروف کے ہیر پھیر سے موجودہ قبائل سے تطبیق دیتا ہے، اس کو نہیں معلوم کہ اب قدیم قبائل کے نام بالکل نئے ہیں"

(ایضاً: ج ۱ ص ۷۱)

بطلیموسی جغرافیہ کے تحت تین قبیلوں کو سب سے زیادہ اور پرزور اور طاقتور بتایا گیا ہے، یہ قبائل ہیں:

بنی زدمین (۲) سیاینی اور (۳) بنو بری، ان تینوں قبیلوں کو بحر احمر کے ساحلی علاقوں میں خلیج ... سے عسیر تک حجاز و تہامہ میں متوطن ظاہر کیا گیا ہے، لیکن سید صاحبؒ پوچھتے ہیں کہ ان کے اصلی اور صحیح نام کیا ہیں"؟ کیونکہ ان ناموں کا قبیلہ عرب میں تو ... نہیں ہے، لیکن ریورنڈ فارسٹر بغیر کسی شک و سوال کے یقینی انداز میں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بنی زدمین بنی عمران ہیں، سیاینی قبیلہ جہنیہ کا نام ہے، اور بنی بری یہ کنویں والا قبیلہ ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ بطلیموس کے دو[2] ہزار برس کے بعد یورپین سیاحوں برکہارٹ اور نیبہر نے انہی مقامات میں مذکورہ قبائل کو دیکھا ہے، سید صاحبؒ اس دلیل کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ:

"صاف ظاہر ہے کہ زدمین خزیمین ہے، سیاینی سیادینا ہے اور بنو بری بنو بربر ہیں، فارسٹر کی عربی دانی ملاحظہ ہو کہ عربی میں چونکہ کنویں کو بئر کہتے ہیں، اس لیے انھوں نے بری کے معنی بھی کنویں کے ہی سمجھے، خزیمہ حجاز میں، سیدین اور بربر دیگر اطراف میں مشہور قبائل ہیں" (ص ۸۷)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے بطلیموسی قبائل کے ناموں کی ایک فہرست دی ہے، جس میں یونانی تلفظ انگریزی و فارسی رسم الخط میں دیا گیا ہے، پھر فارسٹر کی رائے دی ہے، اور اس کے مقابل انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً ڈیبائی کو فارسٹر زبید کہتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ اس کو ضبّہ کہتے ہیں، الاٹیاری کو فارسٹر بنی یام اور سید صاحبؒ بنو عیلام قرار دیتے ہیں، مانی تالی اور کیتھی بانی تالی کو فارسٹر اہل منیٰ اور بنو قحطان سمجھتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ معین (واقع یمن)، اور قتابین (قتاب واقع یمن) قرار دیتے ہیں، ایک نام وآخری مونرائی ہے، ... کو فارسٹر دار القرامطہ (واقع بحرین) سمجھتے ہیں، سید صاحبؒ اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں کہ:

"غریب مستشرق کو معلوم نہیں کہ بحرین میں قرامطہ کا وجود بطلیموس کے آٹھ سو برس بعد ہوا ہے" (ایضاً: ص ۸۱ ج ۱)

ریورنڈ فارسٹر کو صرف اسی پر اصرار نہیں ہے کہ بنی زدمین بنی عمران ہیں، اور یہ کہ ان کا مسکن حجاز

نہیں ہے، بلکہ خلیج عقبہ ہے، اور اس اصرار کی وجہ صرف یہ ہے کہ مسیحؑ سے سولہ سو برس پہلے سسلی کے ڈانڈورس نے لکھا تھا کہ "بنی زوبین کے ملک میں ایک معبد ہے، جس کی تمام عرب عزت کرتے ہیں"۔ اس معبد کو ان علمائے یورپ نے جو کہ ریورنڈ یعنی پادری نہیں ہیں، انھوں نے بھی کعبہ سمجھا ہے، ظاہر ہے کہ کعبۂ حجاز کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سید صاحبؒ نے اس نکتہ کو بھی محسوس کیا، اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کی بحث وہ الگ کریں گے۔

اُمم سامیہ کا مسکن اول اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نہایت محققانہ بحث کی ہے، جس کی اہمیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس بحث میں سید صاحبؒ نے مستشرقین کی ایک جماعت کے خیالات کو قبول کیا ہے، بحث یہ ہے کہ زمانۂ تاریخ سے پہلے جو سامی قومیں الگ الگ لیکن متصل مقامات میں آباد تھیں اور صرف چند کنبوں میں تقسیم تھیں، تو ان کا مسکن کہاں تھا؟ عرب کے مورخین کے پاس تو اس کا صرف ایک جواب ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان کا مسکن عرب تھا، لیکن یورپ کے علماء و محققین نے اس سوال کے جواب میں چار نظریے پیش کیے ہیں، ان کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ ان سامی قوموں کا پہلا مسکن افریقہ ہے، جہاں سام کے بھائی حام کی اولاد، زمانۂ تاریخی میں آباد ملتی ہے، ان محققین کی دلیل یہ ہے کہ سامی اور حامی زبانوں میں بہت مشابہت ہے، نیز یہ کہ سامی اور حامی اور خصوصاً جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں (حبشی) کے بعض اعضا میں مکمل مشابہت پائی جاتی ہے، لیکن سید صاحبؒ اس دلیل کی پرزور تردید کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ:

> "یہ دلیل نہایت عجیب ہے، دو بھائیوں میں اگر مشابہت پائی جاتی ہے، اور ایک افریقہ میں رہتا ہو تو کیا ضرور ہے کہ دوسرا بھی افریقہ ہی میں پہلے رہتا ہو، یہ کیوں نہیں فرض کیا جا سکتا کہ خود حامی پہلے سامی خاندانوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ایک مدت کی یکجائی کے بعد ان سے الگ ہوئے، اسی یکجائی و اجتماع و اتحاد نسل کے بقیہ آثار دونوں میں موجود ہیں"۔
>
> (ارض القرآن: ج ا ص ۱۰۷)

جنوبی عرب کے سامیوں اور حامیوں میں مشابہت کی دلیل سے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ:

"جنوبی عرب (یمن) اور حبشیوں میں یقیناً تشابہ ہے لیکن اس کا سبب بالکل ظاہر ہے، حبش کی کوئی مستقل آبادی و نسل نہیں ہے، بلکہ وہ یمنی عربوں کی ایک نو آبادی ہے، اور ان کی نسل کا مخلوط حصّہ ہے، اسی لیے عرب ان کو حبش (مخلوط) کہتے ہیں، اور اسی بنا پر قدیم مورخین، یمن و حبش کو دو مستقل ملک نہیں قرار دیتے ہیں، بلکہ ایک ہی ملک (ایتھوپیا) کے ان کو دو ٹکڑے سمجھتے ہیں۔" (ارض القرآن، ص ۱۰۶، ۱۰۷)

مستشرقین کا دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بنو سام کا پہلا وطن آرمینیہ اور کردستان ہے، لیکن سیّد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ اس جمہوری کی صحت پر تورات کے چند الفاظ کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے، خود نولدکی بھی اس نظریہ کو صحیح نہیں مانتا۔ (ایضاً: ص ۱۰۸)

تیسرا نظریہ ایک اطالوی مستشرق پروفیسر گیڈی کا ہے، ان کا خیال ہے کہ سامیوں کا مسکن اول فرات کا نشیبی حصّہ تھا، پروفیسر گیڈی نے اپنے اس دعویٰ کو ان مقدمات پر قائم کیا ہے کہ "ابتدائی زبان میں سب سے پہلے ابتدائی ضروریات اور گرد و پیش کی چیزوں کے لیے الفاظ پیدا ہوئے ہوں گے اور اس لیے یہ الفاظ عموماً مختلف خاندانوں اور زبانوں میں تقسیم ہونے کے بعد بطور ترکۂ موروثی کے مشترک طور پر باقی رہیں گے، سامی زبان میں اس قسم کی چیزوں کے لیے جو مشترک الفاظ ہیں مجموعی طور پر ان کا وجود جہاں پایا جائے گا وہی اقوام سامیہ کا مسکن اوّل ہوگا، اس حیثیت سے جو مشترک چیزیں معلوم ہوتی ہیں، ان کی شہادت ہے کہ وہ فرات کے حصۂ زیریں کی پیداوار ہیں۔" (ارض القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

پروفیسر گیڈی کی ان رایوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ان سے پہلے اسی قسم کی دلیل وان کریمر نے قائم کی تھی، اور ان کا خیال یہ تھا کہ سامی قوموں کا ابتدائی مسکن ایشیائے وسطی میں نہر جیحون و سیحون کے پاس ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"ایک ہی قسم کی دلیل سے دو مختلف نتائج کا ظہور، دونوں کے ابطال کی دلیل ہے۔"

(ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۹)

چوتھی دلیل اس بحث میں یہ ہے کہ نسل سام کا مسکن اول ملک عرب ہے، سید صاحبؒ کی رائے میں یہ دلیل قرین صواب اور باعتبار دلائل مستحکم ہے، مستشرقین کی ایک بڑی جماعت بھی اسی رائے کی موید ہے، ان لوگوں میں ڈی خوئی، شریڈر، اسپرنگر، نولدیکی، روبرٹسن اسمتھ، سوال لے انگ، ولیم رائٹ اور راجرس وغیرہ شامل ہیں، سید صاحبؒ نے ان لوگوں کی رایوں کو تلخیص کے ساتھ نقل کیا ہے، بالخصوص انھوں نے نولدیکی کے ساتھ خاص اعتناء کیا ہے، ان کی رائے کو نقل کرنے سے پہلے ان کو "موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، ہم یہاں نولدیکی کی رائے کو نقل کرتے ہیں کہ اس کی افادیت کا یہی تقاضا ہے، نولدیکی کی عبارت یہ ہے:

"بعض مشہور محققین خیال کرتے ہیں کہ جنس سامی کا مولد عرب ہو سکتا ہے بہت سی چیزیں ہیں جو اس مفروضہ کی تائید کیا کرتی ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے عرب کے ریگستان سے قبائل نکل نکل کر قریب کے سرسبز ممالک میں آباد ہوتے رہے ہیں، آرامی اور عبری زبانوں میں بہت سے ایسے نشانات پائے جاتے ہیں، جن سے ابتدائی خانہ بدوشانہ حالت پائی جاتی ہے، اور عرب کا شمالی حصہ صحرائے مابین شام و عرب، خانہ بدوش قبائل کا مسکن ہے، اور نیز عرب ہی میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے، اور ان کی زبان قریب ترین اصل زبان ہے۔"

"ہم خوشی سے قبول کرتے ہیں کہ یہ تصویر کہ عرب امم سامیہ کا مسکن اول ہے، کسی معنی سے غیر معقول نہیں ہے۔" (ارض القرآن ج ۲ ص ۱۱۲)

سید صاحبؒ اس بحث کے آخر میں اسی فیصلہ کا اعلان کرتے ہیں، کہ عرب کے سوا قدیم زمانہ سے کوئی قوم اس کی مدعی نہیں ہے، کہ ان کا ملک بنو سام کا مسکن اور امم سامیہ کا مسقط الراس ہے، عرب عام طور پر اس کے مدعی ہیں اور حق یہ ہے کہ شواہد و قرائن کی شہادت کے ساتھ جب کوئی دوسرا مدعی موجود نہیں ہے تو مقدمہ ان ہی کے حق میں فیصل ہونا چاہیے، اس کے بعد سید صاحبؒ ابن قتیبہ اور یعقوبی کی دو تحریروں کو پیش کیا ہے، اور آخر میں یہ بلیغ فقرہ بھی سپرد تحریر کر دیا کہ:

"ان مقدمات پر ایک دفعہ کا اور اضافہ کرو کہ قرآن مکہ کو ام القریٰ (آبادیوں کی ماں) کا خطاب دیتا ہے: لتنذر ام القریٰ و من حولها۔"

(ایضاً: ص ۱۱۵)

مسکن اوّل سے ہجرت | اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نے عرب سے نکل کر دوسرے علاقوں کی طرف امم سامیہ کی ہجرت پر بحث کی ہے، اور اس ضمن میں ولیم رائٹ، سموآل لے انگ اور فرانسیسی مؤرخ ہیوآرٹ اور شریڈر کی تشریحات کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

"عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں، لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے، تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے، ایک مسیحؑ سے ڈھائی ہزار یا تین ہزار برس پہلے، جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل، اسیریا، مصر اور فینشیا (کنعان) میں پھیل گیا، اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان، آدمی، موابی اور مدیانی قبائل کا اٹھا، اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا، لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا، تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے، لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیحؑ سے چھ سو برس بعد اٹھا، وہ سب سے زیادہ وسیع الاثر تھا، جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا، اور دوسری طرف

بحر محیط سے۔" (تاریخ ارض القرآن ج ۱ ص ۱۱۶)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے امم سامیہ سے متعلق ایک طویل بحث کی ہے، عاد کے ذکر میں بعض مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ یہ نام صرف ایک فرضی اور مذہبی داستان کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن سید صاحبؒ اس کو انتہائی غلط تصور کرتے ہیں، اور جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتے ہیں، کہ عرب کے تمام قدیم باشندے (امم سامیہ) ایک ایسی بڑی اور باعظمت جمعیت تھے، جنہوں نے بابل، مصر، شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں، اب اگر عرب والے اپنی زبان میں ان قدیم باشندوں اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد، ثمود، طسم، جدیس کہتے ہیں، تو کیا ان ناموں کے وضع کرنے کے جرم میں حقیقت اور نفس واقعہ مٹ جائے گا، وہ لکھتے ہیں:

"کوئی قوم جب برسر اقتدار ہوتی ہے، تو حقیقت میں اس کل کے ضمن میں کوئی جزو ممتاز ہوتا ہے، اور اس کے انتساب سے مجموعی قوم مقتدر اور ممتاز تسلیم کر لی جاتی ہے، امم سامیہ کی کثیر الافراد جمعیت میں ضروری ہے کہ کوئی خاص جزو، قوت حاکمہ کا مالک ہو اور بقیہ اجزاء اس کے اشارہ پر حرکت کرتے ہوں، اس جزو کا حقیقی نام کچھ ہو لیکن اہل عرب اس کا نام عاد بتاتے ہیں، ولامشاحۃ فی الاصطلاحات" (ج ۱ ص ۱۲۶)

اس کے علاوہ سید صاحبؒ سب سے مستند ذریعہ قرآن کو سمجھتے ہیں، جس نے عاد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ" ایک اور جگہ آتا ہے "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ" تو قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمراں جماعت ظہور میں آئی، قرآن کی زبان میں اس کا نام عاد ہے، اور یہی قدیم و ابتدائی امم سامیہ کی حقیقت ہے، فرانس کے مشہور مورخ موسیو سیدیو، نے اپنی تاریخ عرب میں عاد کی حکمرانی کو ایک مفروضہ قرار دیا ہے، لیکن سید صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ "امم سامیہ کی حقیقت سمجھنے کے بعد یہ "فرض" یقین سے بدل سکتا ہے۔" (ایضاً: ج ۱ ص ۱۲۷)

سید صاحبؒ نے اس حقیقت کو صفحہ ۱۲۸ سے صفحہ ۱۸۵ تک جس انداز میں واضح کیا ہے، وہ اعلیٰ

تحقیق کی ایسی مثال ہے، جس پر خود تحقیق کو ناز ہے، تورات، تاریخ قدیم، تحقیقات جدیدہ، اور قرآن مجید کے بے شمار ماخذ سے انھوں نے جس طرح اس بحث پر داد تحقیق دی ہے، اس کی قدر صرف اس حصہ کے مطالعہ سے ہی ہو سکتی ہے، ایک انتہائی خشک موضوع پر لکھتے ہوئے بھی سید صاحبؒ کے قلم کی شگفتگی میں کمی کا احساس نہیں ہوتا، مثلاً تحقیقات جدیدہ کی بحث میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"آرکیالوجی کی اعانت سے بابل کے حفریات و آثار نے قدامت کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اب نئے سرے سے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے، اور علم الآثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آ رہا ہے کہ بابل و اسیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا صفحہ ہے۔" (جلد ا ص ۱۳۵)

عاد کی بحث میں شہر عدن پر بھی گفتگو کی گئی ہے، فارسٹر، عدن کو عدنان سے نسبت دیتے ہیں، لیکن سید صاحبؒ اس رائے کو قطعی غلط مانتے ہیں، کیونکہ عدنان کا مسکن تو شمالی عرب تھا، عدن جنوبی یمن میں ہے، اس لیے دونوں میں کوئی تعلق نہیں، سید صاحبؒ کی تحریر میں استدلال کا پرزور انداز ملاحظہ ہو:

"عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے، کہ شہر کا نام بعینہ بانی شہر کے نام پر رکھتے تھے، عرب کے شہر رقیم، سبا، حضرموت، عمان، مدین، اوفر، حویلہ، تیما وغیرہ کے اسی قسم کے نام ہیں، اس بنا پر اگر یمن کے قدیم شہر "عدن" کو جس کے قریب وہ تمام عمارات واقع ہیں، جن کو عرب، عادیات کہتے ہیں، اور تاریخ جس کے قریب عاد کی آبادی کا نشان بتاتی ہے، اگر ہم عادین کا مخفف سمجھیں تو کیوں غلط ہوگا؟ عادین کی جمعیت پر اعتراض نہ کرو کہ قبیلہ کے نام کے پہلے بنو (فرزندان) کا اضافہ کرنا شمالی عرب کی زبان ہے، عموماً قدیم طریقہ یہی ہے کہ پدر قبیلہ کے نام کی جمعیت سے قبیلہ کا نام پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً لودیم، مصرایم، جرایم وغیرہ عربی میں جمع مکسر میں اب تک یہ قاعدہ جاری ہے، مثلاً منذر سے مناذرہ، غسان

سے غساسنہ، ارقم سے اراقمہ۔" (تاریخ ارض القرآن ج ا ص ۱۸۴)

مستشرق نیوبھر نے عدن کو (بنیم) کے دوان کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے لیکن سید صاحبؒ ایک خاص انداز میں اس کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"شاید نیوبھر کو عنہ قبال کے اس درس کی خبر نہیں جس میں عدن اور دوان ایک ساتھ واقع ہیں۔" (ج ا ص ۱۸۵)

ایک موقع پر یارح، لیعرب اور جرہم کی بحث میں فارسٹر کا ذکر پھر آیا ہے، فارسٹر نے یارح، لیعرب اور جرہم کو ایک ہی نام ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"یارح اور لیعرب کا اتحاد تو ظاہر ہے، لیکن یارح اور جرہم میں باہم کیا تعلق ہے؟ یہ تعلق اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ یونانی تلفظ میں جس کی تمام السنۂ یورپ میں تقلید ہے، "ی" "ج" سے بدل کر یرح کا جرح ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ جرہم خاص سامی التلفظ نام ہے، یونانی نہیں، کیونکہ اسمائے قدیم کے متعلق عربوں کے معلومات براہ راست یہودیوں سے ماخوذ ہیں، جن کی زبان یونانی و سریانی تھی، اور یا خود ان کے عربی موروثی روایات ہیں، اور ان دونوں کے لحاظ سے ی اور ج کا مبادلہ غیر مسلّم ہے، یہ مبادلہ سامی (عبری و عربی) اور غیر سامی (یونانی و لاطینی) زبانوں کے مابین ہوتا ہے، ورنہ خود سامی زبانوں کے اندر اس قسم کا مبادلہ کبھی نہیں ہوتا۔" (ج ا ص ۲۲۶)

ہالوے کا اعتراض | حمیر و سبا کی بحث میں، سید صاحبؒ نے ہالوے کی ایک بحث کا جائزہ لیا ہے، جنھوں نے کتبات کے اصول کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "شاہان سبا و حمیر کا آئین تحریر یہ تھا کہ وہ کتبات میں عام طور سے لفظ ملک (شاہ) کے بعد قلعہ حکومت کا اور پھر اپنے شہر حکومت کا ذکر کرتے تھے، چنانچہ "ملک حمیر و ریدان و سبا و سلحین" میں سبا و سلحین میں جو تعلق ہے یعنی پہلا شہر ہے اور دوسرا قلعہ ہے تو یہی تعلق حمیر و ریدان میں بھی ہے، اس بنا پر حمیر قوم کا نام نہیں، بلکہ قلعہ شاہی کا نام ہے، رفتہ رفتہ اس نے حکومت کا اور پھر تمام قوم کا نام اختیار کر لیا۔" (ج ا ص ۲۷۴)

سید صاحبؒ کو متعدد وجوہ سے اس تحقیق سے انکار ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس تاریخ کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ سامی قوموں میں شخص کے نام پر ملک کے نام رکھنے کا رواج عام تھا، لیکن ملک کے نام پر قوم کا نام کبھی نہیں رکھا گیا، اس کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں، سبا، ایک قوم کا اصل میں نام ہے، لیکن چونکہ اس قوم کا پایۂ تخت شہر مارب تھا، اس لیے خود شہر مارب کو سبا کہنے لگے، جیسا کہ شاہ اذینہ حبشی کے کتبہ سے معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ قاعدہ یہ ہے کہ لفظ مذکور اگر کسی مقام کا نام ہوتا ہے تو اس کے پہلے لفظ "ذو" (مالک) یا لفظ "حصن" (شہر) یا لفظ "بیت" (قلعہ) آتا ہے، جیسا کہ "ذوریدان و ذو سلحین" کہ یہ دونوں مقامات کے نام ہیں، حضرموت و بیت ابین یعنی شہر عدن و قلعہ سلحین و شہر مارب، لیکن اس قسم کا استعمال لفظ حمیر کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتا، مزید براں اب تک کتبات میں جس قدر شہروں اور قلعوں کے نام ملے ہیں وہ تمام تر عربی جغرافیوں میں مذکور ہیں، لیکن حمیر کا بحیثیت قلعہ یا شہر کے کہیں ذکر نہیں ہے"

(تاریخ ارض القرآن ج ۱ ص ۲۷۵)

حضرت ایوبؑ اور فارسٹر

حضرت ایوبؑ کے ذکر میں بھی حسب سابق، سید صاحبؒ نے حضرت ایوبؑ کے خاندان، قبیلہ اور ان کے زمانہ کی تعیین میں حد درجہ تحقیق سے کام لیا ہے، دوران بحث وہ فارسٹر کا ذکر کرتے ہیں، جنہوں نے اس بحث پر کئی صفحے سیاہ کیے ہیں، کہ ایوبؑ عرب تھے، اور نسلاً ادومی تھے، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہاں تک تو صحیح ہے، لیکن فارسٹر یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ ایوبؑ کا شہر دنابا تھا، اور یہ غلطی ان سے اس لیے ہوئی کہ ان کی نقل کردہ ایک عبارت میں یہ تحریر ہے؛

والملوک الذی ملکوا فی ادوم الذی	اور یہ سلاطین پہلے ادوم پر حکمراں ہوئے تھے
کان ملک علی تلک الارض من قبل بالق	وہ بالق بن باعور تھے، اور ان کے پایۂ تخت
ابن باعور واسم مدینتہ دنابا و	کا نام دنابا تھا، اس کے بعد یوباب
ملک بعدہ یوباب، (ایضاً ج ۲ ص ۳۱)	بادشاہ ہوئے،

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ عبارت عربی قواعد کی رو سے بھی غلط ہے، اور مدینہ کی ضمیر یوباب کی طرف راجع کرنے سے فارسٹر کو غلطی ہوئی، یہ صریحاً غلط ہے، جس کو عربی داں سمجھ سکتا ہے۔

(ارض القرآن ج ۲ ص ۳۲)

فاران کی بحث | وادی فاران کے سلسلہ میں مستشرقین میں باہمی اختلاف رائے ہے، ان کو تحقیقی طور سے یہ معلوم نہیں ہے کہ فاران کس مقام کا نام ہے، بعض نے جزیرہ نمائے سینا کے مغرب میں مصر سے متصل علاقہ کو فاران قرار دیا ہے، بعض نے کوہ سینا کے دامن میں اس کو جگہ دی ہے، لیکن اجماعی طور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مستشرقین کے خیال میں فاران کوہ سینا میں واقعہ ہے، سید صاحبؒ نے ان کی رائے کی غلطی اور اسلام کے دعویٰ کی صحت کو متعدد طریقوں سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"سب سے اول یہ سمجھنا چاہئے کہ عرب، حجاز، مکہ، کعبہ، یہ جتنے الفاظ واسماء ہیں، اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، لفظ عرب دسویں صدی ق م میں پیدا ہوا ہے، حجاز کا لفظ اس سے بھی زیادہ مستحدث ہے، مکہ کا نام دوسری مسیحی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے مکاربا کی شکل میں نظر آتا ہے، اسی لیے تورات نے اس مقام کا نام اولاً صرف مدبار رکھا ہے، اور قرآن نے اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی زمین) کہا کہ اس کے سوا اس وقت کوئی دوسرا نام نہ تھا، مدبار، وادی غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ ہیں، اسی لیے توراۃ کا یہ کہنا کہ اسماعیل نے بادیہ میں سکونت کی، اس کے بالکل یہ معنی ہیں کہ انہوں نے عرب میں سکونت کی،

دوسری بات یہ ہے کہ ممالک عرب میں سے سب سے پہلا نام توراۃ میں مدیان (مدین) نظر آتا ہے، فاران کی طرح مدین غیر معروف نہیں ہے، شہر مدین تحقیقی اور یقینی طور سے حجاز میں ساحل بحر احمر وعقبہ کے سرے پر واقع تھا، اور اب تک اسی نام سے وہیں موجود ہے، قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی مدیانی لوگوں کا ذکر ہے، ساتھ ہی اتحاد نام کے ساتھ اسماعیلیوں کا ذکر ہے، بلکہ توراۃ نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے،

یہ اتحاد حضرت ابراہیمؑ کی ایک ہی پشت کے بعد توراۃ میں نظر آتا ہے۔" (ایضاً ص ۴۸)
اس کے بعد سید صاحبؒ نے توراۃ کی مختلف عبارتوں کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے، کہ ان عبارتوں میں جو اختلاط اور تشابہ ہے کیا اس کا حل بغیر اس کے ہو سکتا ہے، کہ ان لوگوں کو نسلاً اسمٰعیلی اور وطناً دیانی یعنی حجازی فرض کیا جائے! اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے توراۃ کے دوسرے حوالوں سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ فاران سے مراد ملک حجاز ہے، اور مستشرقین کے شکوک وشبہات ناروا ہیں، (جلد ۲ صفحہ ۴۹)

سید صاحبؒ، مستشرقین کی محض غلط بیانیوں کی ہی تصحیح نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی تحقیق اور تحریر میں اگر کہیں کوئی نقص یا کمی نظر آتی ہے، تو اس کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں، مثلاً شاہان انباط کے سلسلہ میں تاریخ ونگار نے جو انکشاف حال بیان کیا، اس کی اطلاعت سے دو سے نام ایک فرانسیسی مستشرق نے بادشاہوں کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی، یہ فہرست ۱۶۹ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ء پر ختم ہوتی ہے، سید صاحبؒ نے اس فہرست کو نقل کیا ہے، اور اس میں ایک نام "مالک اوّل" کا اضافہ کیا ہے، یہ اضافہ انھوں نے مشہور یہودی مورخ یوسیفوس کے حوالہ سے کیا ہے، (جلد ۲ صفحہ ۶۲)

قریش کی وجہ تسمیہ خاندان قریش کے بانی کا نام فہر تھا، اور لقب قریش تھا، قریش کے معنی متعدد ہیں، اس کا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے جس کے معنی "اکتساب وتحصیل" کے ہیں، چونکہ اس خاندان کا اصلی پیشہ تجارت تھا، اس لیے خیال ہوتا ہے، کہ یہ قریش کے نام سے موسوم ہوا، لیکن قریش کا لفظ ایک دریائی درندہ جانور کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، فہر نے ممکن ہے، اپنے غلبہ واستیلا اور طاقت وقوت کے اظہار کے لیے اس لقب کو اختیار کیا ہو، مستشرقین (مارگولیوتھ) نے اسی دوسری رائے کو پسند کیا، سید صاحبؒ کہتے ہیں کہ یہ قبول روایت اس بناء پر نہیں ہے کہ وہ روایۃً صحیح تر ہے، بلکہ یہ اس لیے قبول کی گئی ہے، کہ اس سے طوطمیت (ٹوٹم ازم) کے ثبوت کے لیے سند ہاتھ آتی ہے، (لائف آف مارگولیوتھ) حالانکہ اس کی تردید کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس خاندان میں قریش کے

کے نام کو ... پا ہوتی تھی نہ اس نام کا دیوتا پوجا جاتا تھا۔ (جلد ۲ صفحہ ۹۸)

نولڈکی | سید صاحبؒ نے ارض القرآن میں مستشرق نولڈکی کے لیے دادِ تحسین کے الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً ان کو یورپ کا سرمایۂ ناز محقق، محققین ترین مستشرق، محققِ کبیر اور موجودہ یورپ میں مشرقی زبان و تاریخ کا سب سے بڑا فاضل وغیرہ وغیرہ کہا ہے، تاہم انھوں نے نولڈکی کی غلطی کی سخت گرفت کی ہے، ایک جگہ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے، کہ عاد و ثمود وغیرہ امم بائدہ کی زبان عربی آرامی تھی، شمالی عرب کے جن مقامات میں ثمود کی سکونت ثابت ہوتی ہے، وہاں ایک خاص خط کے بہت سے کتبات پائے گئے ہیں، جن کی زبان آرامی عربی ہے، زیادہ تر لوگ اس زبان کو ثمودی کہتے ہیں، لیکن ثمود نولڈکی ان کتبات کی زبان کو ثمودی کہنا پسند نہیں کرتا، ان کی دلیل یہ ہے:

"بہت قدیم زمانہ میں ..... جب اپنی زبان کو قید تحریر میں لائے ..... ان کتبات کا نام ثمودی ہے، کیونکہ وہ ثمود کے مقامات پر پائے گئے ہیں، لیکن یہ وصف بہ مشکل مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جس زمانہ میں ثمود پوری ترقی پر تھے، اور وہ مکانات جن کو قرآن نے بیان کیا ہے، کہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنا رہے تھے، اس ملک کی زبان نبطی تھی"

(جلد ۲ ص ۱۳۳)

سید صاحبؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

"اس کی دلیل غالباً نولڈکی کے پاس یہ ہوگی کہ حجر جو عام طور پر ثمود کا دارالحکومت سمجھا جاتا ہے، وہاں کے عمارات کے کتبات کی زبان نبطی ہے، .... لیکن اس خیال کی غلطی ہم انباط کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں، ہم نے بیان کیا ہے کہ وہ انباط کی یادگاریں ہیں، ان کو کون صاحب عقل تسلیم کر سکتا ہے، کہ ایک طاقت ور قوم اپنے شباب اور ترقی کے عہد میں اپنی یادگاروں کے لیے غیر قومی زبان اختیار کر لے گی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ثمود جب اپنی پوری ترقی پر تھے، تو ملک کی زبان نبطی نہ تھی۔ (ج ۲ ص ۱۳۴)

ڈوزی کی ایک رائے میں ترمیم | سید صاحبؒ نے اسلام سے پہلے عرب کے مذاہب پر جو بحث کی ہے اس

میں تفصیل کے ساتھ امم سامیہ کا مذہب، شہروں، اور ہر ہر شہر کے معبودوں کے نام، سورج، چاند کی دیوتائی حیثیتیں اور پھر ان میں بھی بڑھنے والے اور گھٹنے والے چاند کی مختلف شکلوں میں ان کی معبودانہ حیثیت تمام قبائل عرب کے ممتاز معبودان کے علاوہ دیگر مذاہب کی عجیب و غریب تفصیل بیان کی گئی ہے اور اس میں جا بجا انسائیکلوپیڈیا کے ایک مولف، الف ہول کی تحریر کے اقتباسات دیئے ہیں، اور ان کے خیالات سے تعرض بھی نہیں کیا ہے، تاہم پروفیسر ڈوزی کے ایک نظریہ میں سید صاحب نے ذرا ترمیم کی ہے، پروفیسر ڈوزی نے مکہ میں بنی اسرائیل کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ بنی اسرائیل شام سے بھاگ کر حجاز کے شہر میں آکر آباد ہو گئے، اور کعبہ ان کا ہی بنایا ہوا معبد ہے، جس کو انھوں نے ہبل (بعل) دیوتا کے نام سے تعمیر کیا تھا، عربوں میں [illegible] دیوتا کا نام ہبل تھا، اور جو (حضرت) محمدؐ کے زمانہ تک خانہ کعبہ میں نصب تھا، سید صاحبؒ ڈوزی کی اس رائے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"پروفیسر موصوف کے اس نظریہ نے گو جرمنی کے اکثر یہودی علما میں برافروختگی پیدا کر دی. لیکن ہم مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے، اس رائے میں صرف اتنی ترمیم چاہتے ہیں، کہ مکہ میں بنی اسرائیل نہیں بلکہ اسرائیل کے عم زاد بھائی بنی اسمٰعیل آکر آباد ہوئے تھے، اس گھر کو بنی اسرائیل نے نہیں بلکہ ان کے دادا ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا، وہ ہبل کے نام سے نہیں بلکہ خدائے عز و جل کے نام سے بنایا گیا تھا" (ج ۲ ص ۱۸۳)

عرب میں عیسائیت | عیسائیت کے زیر عنوان سید صاحبؒ نے ایک بحث کی ہے، اس کے آخر میں وہ مستشرقین کے تضاد رائے پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عرب میں عیسائیوں کا کون سا فرقہ آباد تھا، خود عرب میں تو عیسائی، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے ناپید ہیں، اس لیے عیسائیوں کا ہر فرقہ مدعی ہے، کہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے، البتہ فرقہ [illegible] جو [illegible] ایک [illegible] العقیدہ [illegible]

عیسائی مورخ تھا، بوثوق تام کہتا ہے، کہ عرب تمام تر یعقوبی (جاکوبائیت) تھے، اس کی تاریخ کا عیسائی محشی جو بیروت کا ایک مشہور کیتھولک فاضل ہے، دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں، وہ کیتھولک تھے، کیونکہ کیتھولک رومیوں کے ساتھ ان کے تعلقات تھے، ڈریپر کا منشا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسطوری تھے، ہم کو حافظ کا یہ فیصلہ پسند ہے ع

بیا کاین داوریہا را بہ پیش داور اندازیم

(ایضاً ج ۲ ص ۱۸۹)

دین حنیف | عرب کے مذاہب میں عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ ساتھ سید صاحبؒ نے مجوسی اور صابی وغیرہ الفاظ سے بھی بحث کی ہے، اور آخر میں ملت حنیف پر روشنی ڈالی ہے، حنیف کا لفظ، حنف سے مشتق ہے، اور حنف کے معنی ہٹنے اور ٹیڑھے ہونے کے ہیں، حالانکہ اسلام، دین حق ہے، اس لیے اس کے معنی سیدھے کے ہونا چاہیے تھا، مستشرقین کو اعتراض کا عمدہ موقع ملا چنانچہ مارگولیوتھ لکھتے ہیں کہ:

"سریانی میں اس کے (حنیف) معنی کافر کے اور عبرانی میں منافق کے ہیں، مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پرواہ نہیں کی"

(لائف آف محمد، مارگولیوتھ بحوالہ ایضاً ص ۲۰۹)

مارگولیوتھ کا یہ بھی مشورہ بھی ہے کہ:

"مسلمان، قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں، یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف لیا گیا ہے"۔ (ایضاً ص ۲۰۹)

سید صاحبؒ نے اس علمی بددیانتی پر پہلے تو سخت رائے کا اظہار کیا کہ:

"یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف باایں ہمہ ادعائے وسعت بہرحال تنگ ہی، اس لیے اس کی ہم کو شکایت نہیں کہ مایۂ ناز فرنگ، نہ صرف آغاز تاریخ اسلام سے ناآشنا بلکہ آئین زبان عرب سے بھی آگاہ نہیں، دنیا میں کس نے اپنا امتیازی

لقب دشمن کے نام و خاندان پر رکھا ہے، اصل یہ ہے کہ نری عربی دانی اور بات ہے اور اسلامی واقفیت اور چیز ہے،

عشق بازاں دیگراند و عشق سازاں دیگراند　　آنچہ در فرہاد می بینم در پرویز نیست،

(ایضاً: ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

اہل عرب کے نزدیک حنیف، حضرت ابراہیمؑ کا لقب تھا، اس لیے ان کے مذہب کا نام ملتِ حنیف رکھا گیا، عرب کے بعض نیک دل لوگ جو عرب کے تمام موجودہ مذاہب بت پرستی، یہودیت اور عیسائیت کے مفاسد سے گھبرا کر تلاش مذہب میں نکلتے تھے۔ وہ آخر اسی آستانۂ دین حنیف پہ آکر تسلی اور اطمینان پاتے تھے۔ (ایضاً: ص ۲۰۹)

اس کے بعد سید صاحبؒ نے آٹھ صفحات پر حنیف کے لغوی معنی کی تحقیق کی ہے، اور زبان و قرآن کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے، کہ حق کے متلاشی اور دین ابراہیم کے متبعین کے لیے یہ لفظ عام طور سے رائج تھا، جہاں تک اس کے لغوی معنی کا معاملہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"حنیف، حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کے معنی مڑنے اور جھکنے کے ہیں، اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے، یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہو سکتا ہے، اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی تو حنف کے وہ معنی ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی و سریانی میں وہ مستعمل ہے، یعنی کافر و منافق، اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام ترک کرکے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس میں اہل عرب اسکو بولتے ہیں، یعنی دین دار اور خدا پرست، اس بنا پر اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی، اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، یعنی الحنیف للہ، خدا کی طرف جھکنے والا، اور الحنیف للدین، سچے مذہب

کی طرف جھکنے والا، کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور مطلق حنیف کے معنی بھی حنیف اللہ اور حنیف للدین کے سمجھے جانے لگے، چنانچہ قرآن مجید میں متعدد طرح سے اس کا استعمال ہوا، حُنَفَاءَ لِلّٰهِ اور مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ۔

(ایضاً: ص ۲۱۰)

اس انداز سے سید صاحبؒ نے مستشرقین کے اعتراض، بلکہ طنز کا مسکت جواب دے دیا، اور ان کے علمی تلف کی وسعت کو بھی ظاہر کر دیا،

آخر میں مذکورہ بالا بحث کے دوران، عرب میں شرک، بت پرستی اور دہریت کے بارہ میں ایک مفصل مضمون ہے، جس میں عرب کے بتوں اور ان کے ناموں کی لغوی و معنوی تحقیق ہے، سید صاحبؒ نے لات بت کی بحث کے موقع پر مستشرقین اور خصوصاً سیل اور مارگولیتھ کے اس الزام کا ذکر کیا ہے کہ:

"اللہ اور اللات ایک ہی لفظ کی دو صورتیں ہیں، اللہ مذکر دیوتا کے لیے قریش میں مستعمل تھا اور اللات جو دیوی اس لفظ اللہ کی قریش نے تانیث بنائی تھی۔" (ایضاً ص ۲۲۶)

سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"ان عقلمندوں سے پوچھنا چاہیے کہ اللہ کی تانیث، عربی قواعد کے مطابق اللات کیونکر ہو سکتی ہے، اس کی تانیث اگر ممکن ہو تو اللّٰہۃ ہونا چاہیے یا الآلہۃ، اللہ کی ہائے اصلی کیونکر تانیث سے ساقط ہو گئی، اگر ہمارا مشورہ مستحق قبول ہو تو اس زمانہ میں لفظ کی پیدائش کے لیے عرب کی خشک سرزمین کے بجائے ملک شام کا سرسبز علاقہ مناسب ہوگا، کیونکہ عرب کے اکثر دیوتا ملک شام ہی کے باشندے تھے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہیروڈوٹس مورخ نے مسیح سے پانسو برس پہلے عرب کے ایک دیوتا کا نام الیلات بتایا ہے، حالانکہ اس وقت قریش کا وجود نہیں تھا، اس لیے ان کی زبان کا لفظ بھی اس وقت موجود نہیں ہو سکتا۔" (ایضاً: ص ۲۲۷)

اس کے بعد انھوں نے اس لفظ کی لغوی و تاریخی تحقیق میں یہ ثابت کیا کہ لات لت سے مشتق ہے، جس کے معنی گھول لینے کے ہیں، (اردو میں اسی سے لتنا یا لت کرنا بنا ہے) واقعہ یہ ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا، جو زمانۂ حج میں ایک چٹان پر بیٹھ کر ستو گھول گھول کر حاجیوں کو پلاتا تھا، اس کے مرنے کے بعد لوگوں نے اسی چٹان کو پوجنا شروع کر دیا، اور اس کا نام لات یعنی گھولنے والا رکھا۔ (ایضاً: ص ۲۲۴)

اس کے علاوہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"قدیم سامی زبانوں میں خدا کے لیے ال یا ایل کا لفظ عام طور سے موجود تھا، علامت تانیث لگنے سے الیوت ہوگیا، جس کے معنی دیوی کے ہوں گے، عربوں نے جب اس لفظ کو اختیار کیا، تو اپنا الف لام تعریفی اس پر اضافہ کیا، اور پہلے الف کو اپنے قاعدہ کے مطابق جیسا کہ اللہ میں ہوا ہے، گرا کر اللوات بنا لیا، اور اس سے اللات ہوگیا، [illegible] نام نبطی کتبات میں الات کی صورت میں ملا ہے۔ (ایضاً: ص ۲۲۴)

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ کیا اس فیلالوجی کو ہمارے یورپین محققین پیش کر سکتے ہیں؟ لفظ اللہ کے متعلق مارگولیوتھ کی تحقیق یہ ہے کہ:

"یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا، اس لیے محمد (ﷺ) کی توحید پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوالیا۔" (ایضاً: [illegible])

اس اعتراض کی لغویت اور نہ ہونا کی، عبارت سے ہی ظاہر ہے [illegible] تحقیق کی میزان و معیار پر رکھتے تھے، اس لیے اس بے سروپا دعوے [illegible] ضروری تھا، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"یہ یورپ کے مشرقی تبحر علمی کی شرمناک مثال ہے۔" (ایضاً: ص ۲۲۵)

اور پھر جواب دیتے ہیں:

"پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں "حقیقی خدا" کے مفہوم کے لیے

کوئی لفظ موجود نہیں تھا، تم کہتے ہو کہ محمدؐ سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے،

بہتر ہے، لیکن کیا وہ اپنے خدا کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ بیان کرتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق، عرب میں بکثرت عیسائی شعراء پیدا ہوئے ہیں، ہاں سچ ہے، لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سنا؟ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کیے ہیں، وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں، ؟ سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل تو الالہ ہے، الہ تو صرف عربی میں نہیں بلکہ تمام سامی زبانوں میں خدا تعالیٰ ہی کے لیے مستعمل ہے، کم از کم الوہ اور الوہیم سے تو ناواقفیت نہیں ہوگی، قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بناکر پوجتے تھے کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں مجسمہ تھا۔ (ایضاً: ص ۲۲۸)

ہم یہیں اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، سید صاحبؒ نے بالقصد مستشرقین کے جواب نہیں دیئے، بلکہ ارض قرآن کی تحقیق میں اگر کسی مستشرق کی غلطی، غلط بیانی اور غلط اندیشی نظر آئی تو تسلسل مضمون کے ساتھ اس کا بھی جواب آگیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کی رایوں کی بنیاد پر ضرب پڑی ہے، اور اس کے بعد وہ ساری عمارت ہی ناقص اور کمزور ہو کر رہ گئی، جو انھوں نے اسلام اور تاریخ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بلند کی، مستشرقین کے اعتراضات کو سید صاحبؒ نے حوالوں کے ساتھ نقل کیا ہے، لیکن ہم نے اس مضمون میں صرف تاریخ ارض القرآن کے صفحات کے درج کردہ حوالوں کو دینا ہی مناسب سمجھا ہے۔۔

سر سید احمد خاں اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی، رفیق دار المصنفین

۱۸۵۷ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے برسر اقتدار ہوتے ہی، عیسائی مشنریوں نے سیاسی اقتدار سے فائدہ اٹھاکر، تبلیغ عیسائیت کا کام شروع کر دیا، تو ان کے مقابلہ میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا عنایت رسول چریاکوٹی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے بحث ومناظرہ اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ بڑی اہم خدمات انجام دیں، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہ تھا، ان عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پیہم حملے کرکے یورپ میں اور پھر ہندوستان میں بھی اسلام کے خلاف بہت سی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں، دوسری جانب یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طرح طرح کی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں، جن کو جدید اسلوب میں دور کرنے کی ضرورت تھی، مستشرقین بھی علمی انداز میں اسلام پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان الجھنوں کو دور کرنے اور مستشرقین کے اعتراضوں کا جواب دینے کے لیے جو لوگ ہندوستان میں آگے بڑھے ان میں سر سید احمد خاں مرحوم پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے زمانہ میں سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی تو یہ دیکھکر لوگوں کو سخت حیرت ہوئی کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، یہ کتاب عیسائی مشنریوں کی مدد کے لیے تیار کی گئی تھی، چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ

" پادری فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثے میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی، اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبرؐ کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے، جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہوں"۔

(خطبات احمدیہ: ص ۱۷)

سر ولیم میور اضلاع شمال مغرب (یوپی) کے لفٹنٹ گورنر تھے، جب کہ سرسید احمد خاں بنارس میں منصفی (جج اسمال کاز کورٹ) کے منصب پر تھے، سر ولیم میور اور دوسرے انگریز افسروں سے دوستانہ مراسم کے علاوہ وہ "اسباب بغاوت ہند" لکھ چکے تھے، جس سے وہ بدنام ہوئے کہ وہ انگریزوں کے وفادار ہیں، انھوں نے "احکام طعام اہل کتاب" لکھی، جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے معاشرتی روابط استوار کرنے کی ترغیب دی، اس لیے وہ "کرسٹان" سمجھے جانے لگے تھے، اور علماء کا ایک گروہ ان سے بہت بدظن ہو چکا تھا، لیکن سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" شائع ہوئی تو ان کی حمیت اسلامی بھڑک اٹھی، اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کو محسوس ہوا کہ اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادی عمدہ باتیں بھی سر ولیم میور کو بری، بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں، تو اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے وہ بے چین ہو گیے، وہ اکثر اس کتاب کا ذکر کرتے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے، کہ "اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں"۔ (حیات جاوید حصہ دوم ص ۱۲۰) ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے اسلامی کتب خانے برباد ہو چکے تھے، اور سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ یہاں دستیاب نہ تھیں، اس لیے سرسید کو ولایت جانے کا خیال ہوا، چنانچہ وہ بعض سرکاری عہدیداروں کے منع کرنے کے باوجود یورپ گیے، اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا، برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کی پرواہ نہیں کی، سیاسی مصلحتوں کو نظر انداز کیا، ان کے لڑکے سید محمود لندن تعلیم کے لیے بھیجے جانے والے تھے، ان کے سرکاری وظیفہ کا مسئلہ درپیش تھا، اس کا بھی خیال نہیں کیا، اور وہ سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کے لیے لندن پہنچ گیے، انڈیا آفس کے

کتب خانہ اور برٹش میوزیم کی لائبریری سے استفادہ کے علاوہ سیر و تاریخ کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں، وہاں سے منگوائیں، اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں، بہت گراں قدر قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں، اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ اسیز (Essays) یعنی خطبے لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے، اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر شائع کیا (حیات جاوید ص ۱۲۰) اس کتاب کی تالیف کے زمانہ میں اپنے جذبات اور مالی مشکلات کے بارے میں انگلستان سے مولوی سید مہدی علی خاں یعنی محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> "ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے، ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر اور بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دی ہیں" (حیات جاوید: ص ۱۲۱)

ایک اور خط میں یہ لکھتے ہیں کہ "مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا، ملنا جلنا سب بند ہے، آپ اس خط کے پہنچتے پر ...... کسی مہاجن سے میرے لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے، .... ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے ادھر لکھا ہے، اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو..... کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے، خدا پورا کرے"

ایک اور خط میں یہ لکھا ہے کہ میں شب و روز تحریر کتاب میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے، کہ دلّی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا

روپیہ کہاں سے آئے گا" (حیات جاوید: ص ۱۲۱)

خطبات احمدیہ کی جلد اوّل تمام ہوئی تو اس کی طباعت میں چار ہزار کے قریب لاگت آئی، کچھ روپیے ان کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کرکے روانہ کیے، اور کچھ انھوں نے دوسروں سے قرض لیے، یہاں تک کہ انگلستان سے واپسی کے وقت ان کے پاس زادِ راہ کے لیے کچھ نہ تھا، اور وہ نہایت پریشان تھے، اسی عرصہ میں ان کی صاحبزادی یعنی ہمشیرۂ حامد محمود کا انتقال ہوگیا، کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اخراجات نے اور زیادہ فکرمند بنا رکھا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ "جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعۂ کربلا سے کم نہ تھا ؎

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر (ایضاً: ص ۱۲۲)

وہ اس کتاب کی تالیف کو مذہبی فرائض میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری خیال کرتے تھے، حصہ اوّل کی تکمیل پر ایک خط میں اپنی کتاب کی غرض و غایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، نہایت محققانہ جواب ہیں، اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں" (حیات جاوید: ص ۱۲۳)

مستشرقین کی تردید میں خطبات احمدیہ کا امتیاز

لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل ریورنڈ ہوپر نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک موقع پر یہ کہا کہ:

"ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خاں نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے، وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا، جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں، تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے، ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے، ان کے ملکوں میں جاکر ہی

کی زبان میں وعظ کہتے، اور ان ہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے، میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برسوں میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو"۔

(حیات جاوید: ص ۱۲۴)

اس کتاب کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مناظرہ کے مخاصمانہ طریق کے بجائے دوستانہ اور غیر متعصبانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مخاطب کو خاموش کرنے کے لیے الزامی جواب دینے کے بجائے اس کو مطمئن کرنے کی راہ اپنائی گئی ہے، اور تحقیقی جوابات دیے گئے ہیں، چنانچہ کرنل گریہم نے سرسید کی لائف میں خطبات احمدیہ کے اس امتیاز کا اعتراف کیا ہے، ان کے خیال میں اس کتاب سے "مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب" ظاہر ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں، دین محمدی انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول دین ہے، اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں، اور ہر ایک چیز تعصب، منافرت اور تنگ دلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے، لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے، تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے، ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کی تحریروں کی مخالفت کی ہے، اور خوب چٹکیاں لی ہیں، اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب بہت سی باتوں میں سر ولیم کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے"۔ (حیات جاوید: ص ۱۲۶)

سر ولیم میور سے پہلے مستشرقین، اسلام کے روحانی اور الہامی پہلو پر اپنا زور تحقیق صرف کرتے تھے، لیکن اس نے تاریخی شہادتوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلامی تعلیمات، جدید دور کی شائستگی، تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف ہیں، اس نے مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو براہ راست اسلامی تعلیمات کا نتیجہ قرار دیا، (خطبات احمدیہ: ص ۲۳۷) یہ نکتہ چینی کا ایک نیا طریقہ تھا، جس میں غیر مستند

روایتوں، کمزور تاریخی داستانوں اور رطب ویابس واقعات سے جن کے بیان کرنے والے خواہ کم رتبہ اور غیر معتبر ہوں مدد لی گئی تھی، سرسید مرحوم نے دو طویل خطبوں میں مسلمانوں کی مذہبی کتابوں اور ان کی تفصیل بیان کی ہے، روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کیے ہیں، اور جو معیار انھوں نے معتبر اور غیر معتبر روایتوں کا قرار دیا ہے، ان کی تشریح کی ہے، جس سے سر ولیم میور کے استدلال کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو زمانۂ حال کی شائستگی یا دنیوی ترقیات میں مانع ہو، اور مسلمانوں کے اعمال و کردار جن کے نتائج وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جواب دہ خود مسلمان ہیں نہ کہ اسلام، انھوں نے سر ولیم میور کے مغالطوں کا نہایت معقول دلائل اور دلنشین پیرایے میں جواب دیا ہے، (خطبات احمدیہ: ص ۲۹۲)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت اس کی سادگی، عام فہم انداز بیان اور منصفانہ طریق استدلال ہے، وہ اپنے مخاطب کو جواب دیتے ہوئے اپنی شرافت، نرم خوئی اور ہمدردانہ لب ولہجہ کو برقرار رکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب کے مقدمہ ہی میں چند مستشرقین کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

> "میں ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں کا ذکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، جنھوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے، اگرچہ بعض مقامات میں انھوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۰)

انھوں نے اپنی کتاب میں مختلف موقعوں پر مستشرقین کے اقوال بھی اسلام کی حمایت میں نقل کیے ہیں،

خطبات احمدیہ کی ایک اور خصوصیت جس کا مولانا الطاف حسین حالی نے بھی حیات جاوید (ص ۱۶۷)

میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان خطبات میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو اسلام کے عقائد متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے، سوائے دو ایک مسئلوں کے جہاں بعض محققین نے بھی وہی رائے دی ہے، جس کو سرسید احمد خاں نے ترجیح دی ہے، مثلاً معراج کے واقعہ کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مسلک ہے، انھوں نے رویا پر محمول کیا ہے، اور شق صدر اور براق کی سواری کو بھی اسی رویا میں داخل کیا ہے، یا ایک آدھ بات اور، ورنہ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ تک سرسید مرحوم نے وہ بحثیں نہ کی تھیں جو ان کی تفسیر القرآن میں ملتی ہیں، اور جن کی وجہ سے ان کے بعض مذہبی خیالات پر اعتراضات کیے گئے، خطبات احمدیہ میں انھوں نے اسلام کی حمایت اور مختلف اعتراضوں کے جواب میں جمہور علماء ہی کے مسلک کی ترجمانی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کتاب کی افادیت بڑھ گئی، اور اس نے اگر ایک طرف مستشرقین کے گروہ کو اور صاف ذہن عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ اور مطمئن کیا، تو دوسری طرف تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اسلام کے بارہ میں مختلف غلط فہمیوں کے دور کرنے میں مدد دی،

مستشرقین کے اعتراضات اور ان کے جوابات

سرسید مرحوم نے مستشرقین کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے ہیں ان کے بارے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سلسلہ میں ان کی کوششیں خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں، انھوں نے اپنی اس کتاب میں سر ولیم میور کے علاوہ دوسرے مستشرقین کے خیالات کا بھی جا بجا تجزیہ کیا ہے، مستشرقین نے سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبی وابستگی کا انکار کیا ہے، وہ مکہ میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت سے بھی انکار کرتے ہیں، قیدار کی عدنان سے اور عدنان کی حضرت اسماعیلؑ سے نسبت خاندانی کو بھی تسلیم نہیں کرتے، اور اس بارے میں عربوں کی علم الانساب میں مہارت اور واقفیت کو مشکوک قرار دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ توراۃ میں جو پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، ان سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مراد نہیں ہے، سرسید مرحوم نے بائبل کے فارسی ترجمہ سے توراۃ کی پیشین گوئی نقل کی ہے، لیکن ہم یہاں

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور مطبوعہ ۱۹۵۸ء سے اردو ترجمہ درج کرتے ہیں:

"اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے، تب اس نے ابرہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پر ابرہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی، اور خدا نے ابرہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث برا نہ لگے جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے، تو اس کی بات مان کیونکہ اضحاق سے تیری نسل کا نام چلے گا اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی ایک قوم پیدا کروں گا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے، ٥ تب ابراہام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا، بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا، اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا، سو وہ چلی گئی، اور بیر سبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی ٥ اور جب مشک کا پانی ختم ہوگیا، تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ٥ اور آپ اس کے مقابل پر ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی، اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی، اور چلا چلا کر رونے لگی ٥ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی، اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے، اس کی آواز سن لی ہے، ٥ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا، اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال، کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا ٥ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑا ہوا، اور بیابان میں رہنے لگا، اور تیر انداز بنا ٥ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا، اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی ٥ (پیدایش باب ۲۱ ورس ۹ - ۲۱)

مذکورۂ بالا پیشین گوئی واضح طور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دے رہی ہے، اسی لئے سر ولیم میور اور بعض دیگر مستشرقین نے اس کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے، اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے نہ تھے۔ حضرت اسماعیلؑ یا ان کی اولاد مکہ میں آباد نہیں ہوئی، اور فاران سے حجاز کی وادی یا مکہ کو مراد لینا درست نہیں،

فاران | سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کو جواب دیتے ہوئے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ ؛

"عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکونی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بٹاورم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے، اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی (قوسین) میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے، اور وہ عبارت یہ ہے: "وسکن فی بریۃ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ امرأۃ من ارض مصر، (عربی ترجمہ توراۃ سامری) (خطبات احمدیہ، ص ۱۱۲)

اس کے بعد وہ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ "عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد ہے، تسلیم نہیں کرتے، اس کے تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کرلیں تو اس بات کو تسلیم کرنا بھی لازم آتا ہے کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے، بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبی ہونا مراد ہے"۔ (ایضاً: ص ۱۱۲)

فاران سے ایک قول کے مطابق وہ وسیع قطعۂ زمین مراد ہے، جو بیرشبع کی شمالی حد سے لیکر کوہ سینا تک چلا گیا ہے، اور فاران کے نام سے مشہور ہے، اس کے حدود اربعہ یہ ہیں: شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملاکر کل بیابان بنتا ہے، اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں، مثلاً شور، بیرشبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ، لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں :

"اس بیان کی تردید کے لیے ...... اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ ...... توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کردیں، کیونکہ ان سے صاف منکشف ہو جاتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے، اور گرد و نواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) تب بنی اسرائیل دشت سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا،

(گنتی باب ۱۰ ورس ۱۲) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا، اور بیابان فاران میں مقام کیا، تکرار واقعی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جداگانہ بیابان تھے،

(ب) اور چودھویں برس کدرلاعمر اور اس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائیم کو عستارات قرنیم میں اور زوزیوں کو ہام میں اور ایمیم کو سوی قریتیم میں اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے ۵ (پیدائش باب ۱۴ ورس ۵ تا ۶)
پس جب تک کہ بیابان فاران کو ایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جائے اس ورس کی عبارت مہمل ہو جاتی ہے۔ (خطبات احمدیہ: ص ۱۱۵)

مزید وضاحت کے لیے وہ توراۃ سے درج ذیل اقتباسات بھی پیش کرتے ہیں۔

(ج) اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو بنی اسرائیل کو دیتا ہوں حال دریافت کریں، ان کے باپ دادا کے ہر قبیلہ سے ایک آدمی بھیجنا جو ان میں سے کا رئیس ہو ۵ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشت فاران سے ایسے آدمی روانہ کیے جو بنی اسرائیل کے سردار تھے۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۱ تا ۳)

(د) اور وہ چلے اور موسیٰ اور ہارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اور ان کو اور ساری جماعت کو ساری کیفیت سنائی، اور اس ملک کا پھل ان کو دکھایا۔ (گنتی باب ۱۳ ورس ۲۶)

(ھ) اور اس نے کہا، خداوند سینا سے آیا، اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا، اور لاکھوں (فارسی ترجمہ: با ہزار ہزاراں) قدسیوں میں سے آیا اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔ (استثنا باب ۳۳ ورس ۲)

(و) خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے، سلاہ اس کا جلال آسمان پر چھا گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی۔ (حبقوق باب ۳ ورس ۲)

(ف) اور وہ مدیان سے نکل کر فاران میں آئے اور فاران سے لوگ ساتھ لے کر شاہ مصر فرعون کے پاس مصر میں گئے۔ (سلاطین اول باب ۱۱ درس ۱۸)

فاران کے بارے میں بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک کنواں بیر شبع کھودا تھا، اور فاران ایک ہی جگہ ہے، سرسید مرحوم نے اس قول کی تردید میں (گنتی باب ۱۳ درس ۲۶) کے علاوہ توراۃ کی یہ عبارت بھی پیش کی ہے:

" اور حوریوں کو ان کے کوہ شعیر میں مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے، پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی قادس پہنچے اور عمالیقیوں کے تمام ملک کو اور اموریوں کو جو حصیصون تمر میں رہتے تھے مارا۔ (پیدائش باب ۱۴ درس ۶، ۷)

وہ کہتے ہیں کہ (مذکورہ بالا آیات سے ہی) جب تک کہ قادس اور فاران دو جدا جگہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیے جائیں اس درس مذکورہ بالا کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ (ایضاً ص ۱۱۷)

فاران کے بارے میں تیسرا خیال مستشرقین کا بیان کردہ یہ ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین پیدائش میں آیا ہے، کہ حضرت اسماعیلؑ صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آکر ٹھہرے تھے، اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسماعیلؑ متوطن ہوئے تھے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسماعیلؑ وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر تکوین (پیدائش) میں آیا ہے، سرسید مرحوم نے مذکورہ بالا رائے کی بھی تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ "کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اسماعیلؑ نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی لیکن ریورنڈ مسٹر فارسٹر اسی مقام کو حضرت اسماعیلؑ کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں، اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں، مصنف موصوف نے سفر تکوین (پیدائش) باب ۲۵ درس ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے " اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر

پر ہے، جس سے اسور کو جاتے ہیں آباد تھی" سے استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ "خدائے تعالیٰ کے وعدے ہی میں ایفا ہو گیے تھے، جبکہ اسماعیلیوں کی آبادی سور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی"۔ اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے فرات پر قرار دیا ہے، اصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ درس ۲۹ میں مذکور ہے، نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۶ درجہ ۰۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۴ درجہ ۲۲ دقیقہ پر واقع ہے، اور اسی کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنہ سے ہو سکتی ہے، جو عرب کی جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے، واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے، جن کا نقشہ دو رشمر کا رطرٹ پولک سے ایم، اے نے مرتب کیا ہے، دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید میں "شور" کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے، جہاں صحرائے ایتام واقع ہے، اور یہ قطعی غلطی ہے، کیونکہ صحرائے "شور" سے توریت مقدس میں مراد تمام وہ وسیع میدان ہے، جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے"

اس کے بعد وہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں:

"اصل عربی توریت میں صرف دو نام ہیں، شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں، ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسیریا ہے، اس سے واضح ہے کہ بنی اسماعیل اس وسیع قطعے میں آباد ہوئے تھے، جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے، یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے، اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے، ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین، ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے، اگر کوئی شخص وہاں سے اسیریا کی جانب عزیمت کرے، اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے، جہاں لکھا ہے جو کہ سامنے مصر کے ہے، اگر تو اسیریا کی طرف روانہ ہو" یعنی مصر کے سامنے ہے، اگر ہم ایک خط مستقیم وہاں سے اسیریا تک کھینچیں۔

(خطبات احمدیہ: ص ۱۱۹)

انھوں نے کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع فاران کے بارے میں تفصیل سے یہ بتایا ہے، کہ حضرت موسیٰؑ کی کتب خمسہ میں ان کا کچھ بھی ذکر نہیں (۱۲۲) سینا سے بنی اسرائیل کا سفر مشرق کی جانب تھا، جس میں انھوں نے پہلی منزل تبعیرہ (گنتی باب ۱۱ درس ۳) میں کی، پھر قبروت ہتاواہ آئے، اور وہاں سے حصروت پہنچے (گنتی باب ۱۱ درس ۳۴، ۳۵) اور اس آخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے، (باب ۱۲ درس ۱۶) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے، جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے، اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا سفر شمالی اور مشرقی سمت میں تھا، یعنی قادیش کی طرف (باب ۱۳ درس ۲۶) اس لیے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰؑ نے کیا ہے، سینا کے مغربی جانب نہیں ہو سکتا، بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے عیسائی علماء نے پانچ مختلف راستے بتائے ہیں، جن کے اختلاف کی صورت میں

"اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے عرب تک چلا گیا ہے جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے، اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مورخ بھی اسی کے مؤید ہیں، تب حضرت موسیٰؑ کے کوچ کے تمام بیانوں کی تطبیق ہو جاتی ہے، اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۲۵)

توریت (پیدائش باب ۲۱ درس ۱۴-۱۵) سے یہ بات سمجھنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ہاجرہؓ بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں، اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا، ان کے پاس تھا، اور وہی ختم ہو گیا تھا، سر سید مرحوم کے نزدیک دو وجہ سے اس درس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں اوّل اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیمؑ نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا، اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصۂ دراز تک رہے تھے، ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنووں کا ہونا، حضرت ہاجرہؓ سے پوشیدہ نہ تھا، دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا، کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کے بنائے ہوئے کنویں نہیں تھے، بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کیے ہوئے بھی موجود تھے، (پیدائش باب ۲۶ درس ۱۸ تا ۲۲) سر سید مرحوم کے نزدیک اس عبارت کے صاف اور صریح معنی یہ ہیں کہ:

"مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہؑ بیابان بیرشبع میں پھرتی رہیں، مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا، کیونکہ بیرشبع کے اردگرد ۔۔۔۔ فقط ۔۔۔۔ ریتلا اور جھاڑیاں تھیں، ۔۔۔۔۔۔ اس لئے حضرت ہاجرہؑ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا، جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں ۔۔۔۔ لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی، کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت نایاب تھا، ۔۔۔۔۔۔ جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے، تو ان کے پاس پانی باقی نہیں رہا تھا، ۔۔۔۔۔۔ خانہ بدوش عرب پانی کے چشمے کو ۔۔۔۔۔۔ چھپا دیتے تھے ۔۔۔۔۔۔ جس وقت حضرت ہاجرہؑ مضطربانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا، توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جہاں لکھا ہے، "پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا، اور لڑکے کو پلایا" (پیدائش باب ۲۱ ورس ۱۹) ۔۔۔۔۔ بہرحال حضرت ہاجرہؑ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا، رہنا شروع کیا، جب اور لوگوں کو اس چشمے کی خبر ہوئی تو بنو جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب و جوار میں آکر آباد ہوئے" (خطبات احمدیہ: ص ۱۲۹)

سرسید مرحوم، بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی اولاد در اولاد کی مختلف نسلوں اور ان کی متعدد شاخوں سے بحث کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ تمام تلاش و تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی، اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار زمین حویلاہ سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں، اور اس طرح پر حضرت موسیٰؑ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے، جو سفر تکوین باب ۲۵ ورس ۱۸ میں مندرج ہے، کہ "وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے، جو سامنے مصر کے ہے، جب تو اسیریا کو روانہ ہو" (ایضاً: ص ۱۴۱)

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ

توراۃ کتاب پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۰ میں ہے "تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے، کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ

وارث نہ ہوگا"۔ کئی مستشرقین نے حضرت اسماعیلؑ کے نسب نامہ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ ظاہر ہے، اور یہودی بھی حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو لونڈی کہتے تھے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیلؑ کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں، اور حسد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیلؑ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں فروتر سمجھے جائیں، منسوب کرتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہؑ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے، جو صریحاً غلط اور تحریف کی حیثیت رکھتا ہے، چونکہ اس بحث کا نسب نامۂ نبوی سے بھی گہرا تعلق ہے، اس لیے سرسید مرحوم نے مولانا عنایت رسول چریاکوٹی کی تحقیقات پر مشتمل ایک نفیس بحث بھی درج کتاب کی ہے، چند اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ انھوں نے سفر اشعیا سے جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے، یہ نقل کیا ہے کہ بابل کا ایک باشندہ رقیون تنگ دست اور مفلس تھا جس نے مصر کی راہ لی، بادشاہ مصر نے اس کی قدردانی کی، اعیان سلطنت میں اس کا اثر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ بادشاہ ہوگیا، یہ پہلا شخص ہے، جس نے فرعون کا لقب اختیار کیا، پھر قحط سالی کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ اپنے گھروالوں کے ساتھ مصر گئے، تو اس نے حضرت سارہؑ سے نکاح کرنا چاہا، مگر پھر باز رہا اور اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی بیٹی ہاجرہؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دیدیا، رقیون عبرانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح حضرت ہاجرہؑ کا اصل عبرانی نام ہاغا ہے، جو اس بات کا قرینہ ہے کہ بادشاہ مصری النسب نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے قبیلہ سے نسبت رکھتا تھا، جن کے پاس سے حضرت ابراہیمؑ بڑے اعزاز اور سامان و ہدایا کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

(پیدائش باب ۱۳ ورس ۱-۶)

۲۔ مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہؑ کو بادشاہ مصر کی بیٹی لکھتے ہیں، چنانچہ ربی شلومو اسحاق نے کتاب پیدائش باب ۱۶، آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سرسید مرحوم نے اصل عبرانی تحریر اور اس کے عربی ترجمہ کے ساتھ درج ذیل اردو ترجمہ بھی تحریر کیا ہے:

"وہ فرعون کی بیٹی تھی، جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔"

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لونڈی میراث نہیں پاتی تھی، تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سارہؓ کو یہی اندیشہ تھا کہ حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ کے ساتھ میراث پائیں گے، چنانچہ انھوں نے ہاجرہؑ کو الگ کر دینے کی درخواست کی، اور انھوں نے ہاجرہؑ کو جو لونڈی کہا تو یہ غصہ اور ناراضگی کی وجہ سے تھا، جس سے دیگر تصریحات کی موجودگی میں استدلال کرنا درست نہیں، تورات میں اور دوسرے مقامات پر حضرت ہاجرہؑ کے لیے شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے معنی خادمہ اور قبیلہ کی عورت کے ہیں، تورات (سموئل باب ۲۵ آیت ۴۱) میں حضرت داؤدؑ کی بیوی کے بارے میں جو زوجہ شرعی تھیں، شفحہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا ترجمہ اگرچہ لونڈی کیا گیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ آزاد تھیں، اور یہ لفظ ان کے لیے خادمہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، (خطبات ۱۶۳ - ۱۷۵) سر سید مرحوم کے نزدیک:

"توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہؑ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے، نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر جو ہم نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لونڈی غلام دو طرح پر ہوتے تھے، بشرا (خریداری) سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے، جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے، اور شبوث حرب کہلاتے تھے یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے، جو خریدے جاتے تھے، اور ان کو مقتنت کنت کہتے تھے، یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے، یلید بایث ولید البیت یعنی خانہ زاد، مگر حضرت ہاجرہؑ ان باتوں سے پاک تھیں، پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں، ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔" (ایضاً: ص ۱۶۷)

عربوں کا علم الانساب اور اس کی اہمیت

حضرت ابراہیمؑ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی رشتہ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے مستشرقین نے عربوں کے علم الانساب پر بھی اعتراضات کیے ہیں، جن کو سر سید مرحوم نے "ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے" سے تعبیر کیا ہے، کہا گیا ہے کہ

"اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضروری نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایتیں خود ان قوموں میں بجنسہ چلی آتی ہے، .... یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے، کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جس کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے، ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۲۸)

سرسید مرحوم نے اپنے خیالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے بارے میں ہیں، وہ نہایت معتبر ہیں، کیونکہ "عرب اپنے آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بدرجۂ غایت پابند تھے، اور اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا جدا نام رکھتا تھا، اور اسی ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلے کو بخوبی جانتا تھا، اور اپنے حسب و نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا۔ لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کا ان کے حسب نسب کا جتانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا، انھوں نے اپنے اس بیان کی تائید میں ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی تحریر بھی پیش کی ہے، وہ اپنے جغرافیۂ عرب میں لکھتے ہیں کہ "عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو بیشک زبان زد خاص و عام ہے، تمام دلائل میں سب سے اوّل رکھنا مناسب ہے، کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصیتوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۳۷) پھر سرسید مرحوم یہ بیان کرتے ہیں کہ "ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے، ان کی رسوم کا علم مندرجۂ ذیل ذریعوں سے ہو سکتا ہے، میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب و نسب بآواز بلند بیان کرے، تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا، کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا، جب کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا، تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا، جو اب شرع میں بلفظ الدیۃ علی العاقلۃ مشہور ہے، اس قسم کے رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا، اور اسی بنا پر جزیرہ عرب کے مختلف اقوام پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر اعتماد

قائم ہوا، اور برقرار رہا۔ وہ اپنی طویل بحث کے اختتام (ایضاً، ص ۱۴۳) پہ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قول ذیل نقل کرتے ہیں کہ:

"محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابلِ اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو، مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق اور حج دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریحاً غیر ممکن ہے۔ خود عربوں کے ہاں زمانہ "نامعلوم" سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے، کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداءً حجاز میں آباد ہوئے تھے، اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے وجود کی اسی بنا پر تائید کی ہے کہ اسماعیل کی اولاد قیدار کے سلسلے سے تھی، ایسی قومی روایت کا ہونا جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایے کو پہنچ جاتا ہے، جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کے اسی حصۂ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے، اور دوسری جانب ارئانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیڈری، درانی، کدرون تائی، یا کدریتی کی موجودگی کے غیر مشتبہ اور ناقابلِ اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔" (جغرافیۂ تاریخی جلد ا صفحہ ۲۴۸)

اسلام کے ذریعہ تکمیلِ دین

اپنی کتاب کے تیسرے خطبہ میں سر سید مرحوم نے ان مختلف مذاہب کا ذکر کیا ہے، جو اسلام سے پہلے عرب میں موجود تھے، اور یہ بتایا ہے کہ اسلام مختلف معاملات میں کون کون مذاہب سے مشابہت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتہً اسلام نمودار ہوا، اور اس کو حیرت انگیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا، اور دفعتہً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر دیا۔" اس کے بعد انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اسلام نے عرب کے مختلف مذاہب میں کیا اصلاحات کیں، ان کی کن باتوں کو برقرار رکھا اور کن امور میں ان سے مخالفت کی، اس کے بعد عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ "اسلام درحقیقت اصول و عقائد متفرقہ منتشرہ مذاہب

سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے"۔ پیش کرنے کے بعد اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں کہ:

"یہ مشابہت اصول اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کے سب سے بڑی دلیل ہے، تمام چیزیں جن کا مبدأ ایک ہی غیر فانی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالےٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے، اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو مختلف اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں، مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے آپ کے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا، جنھوں نے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی، اور جنہوں نے اپنے با ایمان متبعین کے لیے بہا اور لازوال خدا کے دروازے کھول دیئے"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۲۲۳)

صدائے جنگ سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اسلام کے محاسن بھی بیان کیے ہیں، جس پر سرسید مرحوم نے یہ لکھ کر بجا طور پر ان کی تحسین کی ہے کہ "سر ولیم میور ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں، اور جب تک علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے"۔ اس کے بعد شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ سر ولیم میور کے خیالات نقل کیے ہیں، لیکن اس درمیان اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی"۔ کے جملہ پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"سر ولیم کی اس تحریر پر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا، بلکہ اس سچے وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے۔ جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا، اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں

تھیں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے، اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچی تھی، اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۲۲۶)

ایڈورڈ گبن | سرسید احمد مرحوم نے ایڈورڈ گبن کی تحریریں بھی اپنی تائید میں بڑی فراخدلی سے نقل کی ہیں لیکن وہ ان پر گرفت بھی کرتے جاتے ہیں، ایک جگہ وہ گبن کے اس جملہ پر چونک پڑے کہ "(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں" اس پر ان لفظوں میں تبصرہ کرتے ہیں:

"انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے، ان دیکھی، ان چھوئی، ان چکھی، ان سمجھی چیز کیونکر سمجھ میں آسکتی ہے، جس چیز کے لیے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہو، وہ کیونکر بیان ہو سکتی ہے، کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتلائی جا سکتی ہے، یہ تمام امور محالات سے ہیں، پس وحی یا الہام ان کو کیونکر بیان کر سکتا ہے، سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے: "لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے، اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے، اور کچھ نہیں بتا سکتا، سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہو سکتا ہے، نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر، اسی لیے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے، موسیٰ نے بھی فرمایا ہے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا، غلہ پیدا ہوگا، وبا نہ ہوگی، گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا، وبا پھیلے گی۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۲۹)

چند معاشرتی مسائل پر اعتراضات | سر ولیم میور نے اسلام کے چند معاشرتی مسائل پر بیا اعتراضات کیے ہیں، کہ مذہب اسلام سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا بلا قید جائز

اور غلام بنالینا وہ باتیں ہیں جو کل اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں، عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں، اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں، دوم یہ کہ مذہبی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ معدوم کر دی گئی ہے، تحمل کا نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا، سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اور اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۳۷)

سرسید مرحوم کے خیال میں عیسائی مصنفین مسلمانوں کی مخالفت میں سنجیدگی اور نیک نیتی کو برقرار نہیں رکھ سکے، اپنے عیب جیتی کے مستحکم ارادہ کی وجہ سے وہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے سکے کہ آب وہوا، مرد وعورت کی تعداد اور مختلف طبعی اسباب کا گہرا اثر معاشرتی حالات پر پڑتا ہے۔

تعدد ازدواج | سرسید احمد خاں کی نظر میں اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے، کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا مسلمانوں پر لازمی یا کچھ زیادہ کار ثواب کی بات ہے، حالانکہ یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کو مختلف اسباب طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو، اس کے بعد وہ قانون قدرت، باہمی معاشرت اور مذہب کی رو سے، مسئلہ ازدواج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پہلے ہم اس بات پر غور کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ دریافت کریں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا ہے، پس ہم قانون قدرت کی بے شمار نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، جن میں سے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتا ہے، برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مائیں ہوتی مقصود ہیں، ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں، اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں، وہ اکثر

بلکہ تقریباً سب اسی قسم کے ہیں، پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے، مگر (چونکہ) وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور عقول قدرت نے اس کو عطا کیے ہیں، ان کو احتیاط سے اور موقع بہ موقع بہ لحاظ امور طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور ملکی تاثیرات آب و ہوا کے کام میں لائے، پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے، ویسے ہی ایک سے زیادہ نہ ہونے کا قطعی التزام خلاف فطرت ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص ۲۳۹)

تعدد ازدواج کے معاشرتی پہلو کو سرسید نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، اسی بات کو توراۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا، اور وہ عورت ہے، جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو، اور مرد کے ساتھ شریک ہو کر اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ "بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو" مدد دے، مگر جب وہ کسی سبب سے ان قدرتی فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہو تو اس نقصان کے رفع کرنے کی تدبیر اس کے سوا اور کوئی نہیں، کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں بیویاں رکھنے کی اجازت ہو یا پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری سے نکاح کر لے یہ حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے تھا، چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو یہ حق ہے، مگر سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے اگر عورت کو پہلے قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے، اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا، اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا، تعلیم و تربیت کے ذریعہ اس ضرورت کا کم ہونا تو ممکن ہے، لیکن اس کا تمنا محالات سے ہے، اس لیے جہاں ضرورت ہو وہاں اس پر عمل پیرا نہ ہونے سے نقصانات ہوں گے، جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل

ہیں، (خطبات احمدیہ: ص ۲۴۱) سرسید مرحوم نے تعدد ازدواج کی تائید میں دو مستشرقین کی یہ آراء بھی نقل کی ہیں کہ:

"گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، ضرورت ہے کہ تعدد ازدواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔" (مسٹر مانٹیگو) "ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے، جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے، جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں، مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور دل مضبوط رہتا ہے، اگر یہ بات سچ ہے، تو بانیِ اسلام کے لیے اس بات کی کہ انھوں نے کئی بیویوں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی۔" (سر ڈبلیو او سلی)

لیکن ان مذکورۂ بالا تائیدی آراء سے سرسید کو کامل اتفاق نہیں، جس پر وہ ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

"افسوس ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازدواج پر صرف امور طبعی کے لحاظ سے نظر کی ہے، مگر اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امور طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی، بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کی علتوں اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو، جو عین مرضی آدمؑ و حواؑ کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۴۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب اور اس کے گرد و نواح میں نکاح و شادی سے متعلق بہت سی اخلاقی خرابیاں پائی جاتی تھیں، سرسید مرحوم کے بقول ایران میں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیے گئے تھے، اور رشتہ داری کا پاس و لحاظ نہیں تھا، یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسے ہی مباح تھی، جیسے باپ کو اس بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن، یہودیوں کے یہاں جو ایران کے گوشہ

مغرب میں بکثرت آباد تھے، تعدد ازدواج کی رسم کسی قید اور حد کے بغیر بے روک ٹوک جاری تھی، عرب یا ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں جاری تھیں، تعدد ازدواج کی کچھ انتہا نہ تھی، تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز درجہ یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں، عیسائیوں کا حال ان سب کے برعکس تھا، ان کے یہاں ایک بیوی کرنی بھی نیکی شمار نہ ہوتی، بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی، اور مرد و عورت دونوں کے لیے یہی نیکی کا کام تصور کیا جاتا، ایسے زمانہ میں جبکہ عقل و دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اور اخلاق و معاشرت اس قدر بگڑ چکی تھی، اسلام نے ایسا عمدہ قانون جاری کیا، جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے نہایت کامل عقل کامل کے بالکل مطابق، انسان کی تندرستی، بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔ (خطبات احمدیہ، ص ۲۴۴)

سرسید مرحوم نے مذہبی نقطۂ نظر سے بھی تعدد ازدواج کا جائزہ لیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس خوبی سے اسلام نے تعدد ازدواج کو روکا ہے، اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے، اور نہ عیسائی مذہب نے، یہودیوں کے یہاں بکثرت اور بلا تعیین تعدد ازدواج موجود ہے، عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی، چنانچہ مسٹر ہگنز کہتے ہیں کہ ”میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام پر ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کی نظیر پر جو خدا کی مرضی پر چلتے تھے، اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا، یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام کو قلمبند کرنے کے لیے تحریر کیا تھا کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی۔“ جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ”ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔“ (ایضاً ص ۲۴۵) اس کے بعد سرسید مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

”اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی

سے روکا ہے، اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے، اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے، ہم کو کچھ شبہہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو، اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بجا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے، جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے، اور وہ یقیناً انکو اس قسم کی سزا دے گا، جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہو گی، جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے، اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا، ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں، پس ایسے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑ کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔" (خطبات احمدیہ ملخصاً۔ ص ۲۴۹)

طلاق سر ولیم میور نے اسلام میں اجازت طلاق کے مسئلہ پر بھی اعتراض کیا ہے، جس کے جواب میں سرسید مرحوم اس بات کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت و تمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔" لیکن اس کے باوجود:

"اس بات سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے، اور وہ علاج طلاق ہے، بطور ایک علاج کے، ایسی حالت میں اس کی طرف رجوع کرنا جائز ہو سکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں، اور ایسے ترددات و تفکرات جو طلاق سے بھی زیادہ رنج دینے والے اور رنجشیں پیدا کرنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں، اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے ایسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے خلاف نہیں بلکہ اسکی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔" (ایضاً: ص ۲۵۱)

انھوں نے طلاق کے بارے میں یہودی اور عیسائی مذاہب کے طرز عمل کا بھی جائزہ لیکر یہ واضح کیا ہے کہ یہودیوں کے یہاں طلاق دینا، کسی شرط و قید کے بغیر مرد کے اختیار میں تھا، وہ جب چاہتا طلاق لکھ کر بیوی کو دیدیتا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے اور کسی حالت میں طلاق کو جائز نہیں رکھا، یہ ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی، اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں، تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے، اور جو رنج دہ امور، زن و شوہر میں واقع ہوں کہ تمام اندرونی مقاصد کی بربادی کا سبب بنتے ہیں، اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے، اس صورت میں تو زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔" چنانچہ جان ملٹن نے بائبل کی مختلف آیتوں سے طلاق کے جواز پر استدلال کیا ہے نہ کہ اس کی ممانعت پر جیسا کہ اس زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں، سرسید جان ملٹن کی یہ پوری بحث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

> "جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کے ورسوں (آیتوں) پر ڈالی ہے، وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے، کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق بطور معجون مفرح استعمال کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف ایک لاعلاج مرض کا علاج ہے، مگر زن و شوہر کا معاملہ ایسا نازک ہے کہ اگر اس میں بیماری پیدا ہو جائے تو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا، کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں ہے، اس لیے اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کیلئے ابتدا میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار پیدا ہوئی تھی۔" (خطبات ص ۲۶)

سرسید احمد خاں نے ان تعلیمات نبویؐ کو بھی نقل کیا ہے، جن میں مرد و عورت کی اخلاقی تربیت اور زن و شوہر میں یکجہتی اور محبت و انس کی ہدایات اور تدبیریں بتائی گئی ہیں، اور جن میں طلاق سے امکانی حد تک بچنے اور مجبوری کی صورت میں سوچ سمجھ کر مناسب وقفوں میں تدریج کے ساتھ تفریق کی اس کارروائی کو روبہ کار لانے کی ہدایت کی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے، مہربانی اور خاطر داری سے پیش

ان کی سختی اور بدمزاجی کو برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی، اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کو رد کرنے کے لیے ہیں، اپنی اس بحث کے اختتام پر وہ بڑی جرأت کے ساتھ لیکن ہمدردانہ لب و لہجہ میں یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

"اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن و شوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو، اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں، ور بغیر اس کے حالت معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو، وہ زن و شوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہو گی، ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے، پس ان کے افعال کی نفرین انہی پر ہونی چاہیئے نہ مذہب اسلام پر، جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے، وہ عقل، انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا، اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لیے اس کا جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۶۳)

غلامی سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے، جس کے جواب میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جن میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا یا اس زمانے کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۶۴)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈفری ہیگنز "انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ "سروس" یا "ڈولس" پایا جاتا ہے، اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے، وہاں اس کا ترجمہ "غلام" ہونا چاہیے۔ لفظ "سروس" کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں

خرید اگیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو، اور ”فریڈمین“ ہمارے اجرہ دار اور خدمتگار کے ہم معنی ہے لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جائے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے، جبکی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا، اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے (ایضاً ص ۲۶۵) گاڈفری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ ”مگر حضرت محمدؐ (جنھوں نے غلامی کے مٹانے کے لیے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے، حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو تم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کردیں تاکہ اپنے آپ کو آزاد کرلیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو، اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو“۔ گاڈفری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔ (ایضاً: ص ۲۶۷) لیکن سرسید مرحوم کا خیال ہے کہ:

”جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے پھر رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے (ایضاً) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہوجانے پر جو استدلال گاڈفری ہیگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے، خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف صاف فرمایا ہے کہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ) سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں ... اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہوسکتا، یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مرجاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے، کتابت کا جو ذکر گاڈفری ہیگنز صاحب نے کیا ہے، وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو، بلکہ اس کا کرنا واجب تھا، اور انکار کرنا قابلِ سزا تھا، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرینؒ نے جب حضرت انسؓ سے جب کتابت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار کیا، ابن سیرینؒ نے وہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے .... خط آزادی بمعاوضہ حضرت انسؓ سے لکھوا دیا....“ (ایضاً: ص ۲۶۹)

سرسید غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ روایت بھی درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں، تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں، اللہ نے ان کو تمہارا تابع کردیا ہے، پس جو شخص کہ اس کا

اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلا دے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہنا دے، اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان کو تھکا دیں، اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے تو خود ان کی مدد کرے (بخاری باب قول النبیؐ العبید اخوانکم، ص ۳۴۶) اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے، اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے، اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے، اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے، اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے، خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا، عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے۔ فاطمہؓ، پیغمبرؐ کی بیٹی، اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں، کبھی ان کا دست مبارک ہتھے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا، تاکہ دونوں کو برابر محنت پڑے، پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے، ایسی غلامی (اگر اسکو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی متصور ہے، پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی، قیاس کرنا غلطی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا، بلکہ انکی نسبت لونڈی و غلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے انکی حقارت نکلتی تھی منع فرمایا، اور نہایت شائستہ، مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی ... علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۶۹-۲۷۱)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زر معاوضہ لیے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا، وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے، اسکی وجہ کیا تھی، سرسید مرحوم اسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعۃً کیوں نہ آزاد کر دیا، تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے

پاس کچھ علاج نہیں ہے، مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں، اس قدر تو ضرور تسلی ہو گی کہ ان بدنصیبوں کی بُری حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے، اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے، اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں، اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، ہاں بلاشبہ جو سمجھ دار اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے، ان کی آزادی کا دفعۃً حکم دیدینا محالات عملی سے تھا، اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آیندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جاوے، اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے، پس یہی کام اسلام نے کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے، بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۷۲)

قرآن مجید کی آیت (فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا .... فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (سورۂ محمد ۴) کی تفسیر میں علماء نے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں، اہل کفر سے مقابلہ میں اگر کچھ قیدی ہاتھ آجائیں، تو بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں، اور بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے، اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے، اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک میں چلے جائیں، سرسید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند، معتبر اور صحیح ہے، کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دینے میں کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی ہے۔ (ایضاً: ص ۲۷۴) وہ سر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

"بقول مسٹر ہیگنز کے گو حضرت مسیحؑ نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو، مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ للعلمینؐ نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا، تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا، اور جو قدیم زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی، اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ نے بھی نہیں توڑا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا، دفعۃً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور مطوّل قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ "اَمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" مٹا دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست　　کتب خانۂ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں) کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانا ہے، اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے، ایک تو احسان رکھ کر چھوڑ دینے ہیں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دینے ہیں، جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کا بجا لانا واجب ہوتا ہے، یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں، پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے، ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیئے، رقّیت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے، ہاں یہ بات ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ملے، اس وقت تک اس کو قید رکھے، مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہی ہوگا، اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو در حقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہو گی، اور اسی لیے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہو گی" (خطبات احمدیہ: ص ۴۷-۲۷۳)

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا، اور اس وقت بھی بعض بعض ملکوں میں ان کے یہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے، سرسید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پس ماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس

"رواج" کی خبریں ملا کرتی تھیں، چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"[illegible] اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں زیادہ بہ نسبت عیسائی قوموں کے [illegible] ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم اس خطبے کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کو جاری کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے، وہ بحیثیت اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے، اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا، خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینے میں"۔ (ایضاً: ص ۲۷۵)

اسلام میں آزادیٔ رائے سر ولیم میور کے نزدیک "اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے"۔ مگر سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ سر ولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے، اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے،

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ، اپنے تاریخی مضامین سمیت، باوجود اس کے کہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں، وحی آسمانی ہیں، اور اس لیے سہو و خطا و غلطی سے بالاتر ہیں، اور ہر ایک انسان کو کسی تامل یا کسی حجت، یا اپنے قوائے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے،

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں، ایک وہ جو کتاب مقدس کے تمام و کمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو جو مسائل و احکام سے متعلق ہے، وحی سمجھتا ہے، اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا، مگر اس اختلاف سے قطع نظر، ان سب کے لیے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے، جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے، اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، وہ دو مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے، یہ ایک عجیب مسئلہ ہے، جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے، خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لیے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا، اور نہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسان

(جو حضرت عیسیٰ کے ۳۲۵ برس بعد ہوئی تھی، اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا) طے نہیں ہوا تھا، اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ پارسن اور دوسرے مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے، پس اگر نہایت عجیب و مشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا، اور کسی کے لیے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب و غریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا، بقول سرسید احمد خان:

"تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے بالکل برخلاف ہے، تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر، نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے، دلیل و عقل کو اس میں دخل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۷۷)

دوسرا مسئلہ فدیہ کا، یعنی حضرت عیسیٰ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے، اور یہ بات قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے جس سے معاملات مذہبی میں آزادیٔ رائے بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا، اس کے لیے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں، کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا، اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا، (ایضاً: ص ۲۷۷) بہر حال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادیٔ رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سرسید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

"مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے، بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادیٔ رائے اسلام نے دی ہے، وہ بے نظیر ہے، اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں۔۔۔۔ ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے، بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانشمند، بے تعصب معتقدوں

کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں، مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہیلر نے لکھا ہے کہ "اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے، مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے، اور اگر اب تک اس میں کچھ شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے"۔ (خطبات احمدیہ، ص ۲۷۹)

انھوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدی کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصبانہ رائے اور تحقیق کے بعد نامعتبر ٹھہرانے کا ہر شخص کو کلیتہً اختیار ہے، جو روایتیں کہ غور و فکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں، ان سب کو رد کر دینے کا کلیتہً مجاز ہے، قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں، مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید کے صحیح ہونے کو بھی اس کی سچائی ثابت ہونے پر ہی مانا ہے، مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے، اور جو ہدایت اس میں پاوے اس پر عمل کرے، اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے، مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے، یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت، وہ بھی عقل کی مداخلت کے بغیر، اندھا دھند اعتقاد اور بے عقلانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و ناسمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے، قرآن مجید میں سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے، اور اس کے بعد اس لازوال ہستی اور سچی راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے۔ پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے پر بیان کی ہیں، پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ (ایضاً ص ۲۸۸-۲۸۰ ملخصاً)

تلوار کی کاٹ اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے، مگر جیسا کہ سرسید مرحوم فرماتے ہیں؛

(یہ اعتراض، منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں، یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا وہ حق پوشی کی نظر سے دیدہ و دانستہ باندھے ہیں، اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے، اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا، یہ خیال کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے، قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے، جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ سیدھی راہ گمراہی سے علانیہ نکل گئی ہے"۔ (بقرہ: ۲۵۶)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں، جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا، اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے، اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے، مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہو جائے تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھا دیں، ..... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے، نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی، اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں، اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا، اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا"۔

(ایضاً: ص ۹۰ ـ ۲۸۸)

دوسرے مذہبوں کے لیے آزادی

ایک اعتراض یہ پیش کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے، چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لیے تھا، اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں، خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں، اور اپنے چال چلن اور عادات و عبادت و محبت و ہمدردی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلا دیں، اور اس کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں،

ایک ہی مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں، جیسا کہ مدینہ میں ہوا، دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے، کفار فرائض مذہبی کی ادائیگی پر معترض نہ ہوں، جیسا کہ ابتداءً مکہ میں تھا، یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے، یا کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر یہ تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو ملک میں رہنے، آمد و رفت رکھنے، ان کی جان و مال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائیگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے، تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائیگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے، اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

> "ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو، تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہونچائے، اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے"۔ (ایضاً: ص ۲۹۱)

سرسید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ "مسلمان فتحمندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی، اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا"، مگر وہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہم کو یہ تحقیق کرنی چاہیے، کہ انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہوگی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے؛ مگر وہ مسلمان فتحمند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے، دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے، اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی

بخشتے تھے، چیمبرزان سائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرفدار ہو، اسپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے جس میں یہ ہے کہ:

"اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے، کیونکہ ان سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان کے بادشاہوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا۔" (ایضاً: ص ۲۹۲)

مذکورۂ بالا اعتراض کے جواب میں سرسیدؒ نے ایک مسیحی عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ "کوئی بات ایسی عام نہیں ہے، جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت، یہ عجیب زعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لیے جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے، اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا، اس وجہ کہ وہ عیسائی نہ تھے، مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن واماں کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں، اور ان کے مذہب، ان کے پادریوں، ان کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے، جو لڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے، وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں دیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی، کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، یونانی اور حبشی اپنے فتحمندوں کی اطاعت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے، جب کبھی خلیفہ فتحیاب ہوتے تھے، اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے، تو فوراً ان کا رتبہ بالکل فتحمندوں کے برابر ہو جاتا تھا، ایک نہایت دانشمند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ "وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے، اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے۔" گاڈفری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلاوطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

"گرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول

نہیں کرتے تھے، مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب کچھ اور ہی تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آگئے تھے کہ نادان عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے، اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا، جن ملک کو خلیفہ فتح کرتے تھے، وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے، جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے، بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن و امان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیئے جاتے تھے، اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا۔ خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں پل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو، جیسے کہ عیسائیوں میں مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا، اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب جلا گیا ہو، نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا ہے" (الفناص) [295]

جزیہ کے بارے میں ہیگنز کے خیال کی تردید

ابھی مذکورۂ بالا اقتباس میں گاڈفری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملہ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ غیر رعایا کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں، چنانچہ سرسید احمد خاں مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مسٹر ہیگنز نے یہاں غلطی کی ہے، کافروں سے جو مفتوح ہو جاتے ہیں، اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے، جزیہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن و امان کے بحال رہنے کے گورنمنٹ کے مقصد اور غرض میں کوئی خدمت بجا نہیں لاتے، بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ امن کی ذمہ داری ہوتی ہے، ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے، بلکہ خلیفہ کو ملکی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہی چاہے لے،

چاہے نہ لے، پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے، نہ مذہب سے، مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔" (ایضاً: ص ۲۹۴ حاشیہ)

اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرزِ عمل

اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے، لیکن اس کے برخلاف عیسائیوں کا طرزِ عمل بڑا افسوسناک رہا ہے، چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب "اپالوجی" میں لکھا ہے کہ "نائسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے یعنی خون ریزی اور بربادی، ان احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے قریباً دو سو برس تک ترکوں پر کیے تھے، اور جن میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے، کہ نان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیرووں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا۔ وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا، اور چالیس برس تک اور دوسری بہت سی خوں ریزیوں کا ہونا، فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل نفریں ہے کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری بے انتہا بدعتوں اور ان بتیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے۔ زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی وارداتیں، تیرہ، چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک نیرو یا ایک کیلیگولا سے بڑھ کر تھے۔ اور آخرکار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا، اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے، ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا (ایضاً: ص ۲۹۷)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس کے بارے

نیا سرسیدؒ نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں، ان سے خلفاء نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی، ... . ملک عرب میں جو حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے اور بت پرست حوان کو نہ مانتے تھے، شرعاً نیست و نابود کیے جا سکتے تھے، مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتحمندوں نے اس مرتاض اور آباد ملک کے ہندوؤں کو چھوڑ دیا۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۹۸)

وہ ایک دوسرے مصنف کے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شایع ہوا تھا، یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

"اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہونچائی، کوئی مذہبی عدالت، مخالف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی، اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو جاری کرنا چاہا مگر ان کو بہ زور جاری نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتحمندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے، اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں، جو ہر ایک فتحمند نے ابتداء سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں"۔ یہی مصنف مزید یہ بھی لکھتا ہے کہ "فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں"۔ اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔" (ایضاً: ص ۲۹۹)

مندرجۂ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں کہ:

"اب دیکھو کہ بہت سے طرفدار، فیاض طبع، عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں سر ولیم میور کے ہیں

بے سند دعوے ہے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے کتنی مختلف ہیں۔"

(خطبات احمدیہ : ص ۳۰۰)

سرسید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان وسیع تر فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہونچے۔ اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گیے تھے، ان کی تکمیل کی۔ اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے، جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا، اسلام نے ان خداپرست لوگوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا، اور ان کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا اعلان کیا، اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹیوں، حضرت اسحٰقؑ، حضرت ہودؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، اور حضرت ہارونؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ وغیرہ کی ان کے ہاں، باوجود نبی ماننے، مذہبی رہنما تسلیم کرنے اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر پیش کی جاتی تھی جیسے کہ وہ مجرم جن کو وہ اکمس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں، یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں، یہ صرف اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے، یہود عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کے منکر، مخالف اور دشمن تھے، جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی، جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے، اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی، ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے، جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں، درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا، تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا، اور آخر کار وہ عظیم الشان اصلاح کر پر قادر ہوا، جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین شکل سے آزاد کر دیا، ہم کو یقین ہے کہ اگر "لوتھر مقدس" اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے، اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ

نے بھی تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے، اور آخر اس نبی آخر الزماں صلعم پہ یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا، پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے (والدین ایضاً)

کچھ مذہبی کتابوں کے بارے میں

ابتدائے عہد اسلام تدوینِ علوم کا دور تھا، جس میں ہر طرح کے علوم و فنون کی تدوین ہوئی کچھ لوگوں نے ثقہ راویوں کے بیانات قلمبند کیے، کچھ نے ثقہ اور غیر ثقہ، صادق و کاذب ہر طرح کے راویوں سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر دیں، اور ان کے راویوں کا ذکر بھی درج کتاب کر دیا، کچھ مصنفین کی غرض نہ تو کسی قصے کی تصدیق تھی، اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقعہ کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے، اس کو لکھ لیں، اور ایک جگہ جمع کر دیں، اور ان قصوں کی صحت یا عدم صحت کی چھان بین پڑھنے والے کی جاں فشانی اور تحقیق و رائے پر چھوڑ دیں، بعد کے علماء نے متن اور راویوں پر نظر کر کے صحیح، ضعیف اور موضوع روایتوں کے الگ الگ مجموعے تیار کیے، اور راویوں کے حالات میں مفصل کتابیں تحریر کیں، جس کی وجہ سے اب صحیح اور غلط کی تمیز کا کام آسان ہو گیا، اور یہ واضح ہو گیا کہ کون سی کتابیں اور کون کون سے راوی معتبر ہیں، اور کون غیر معتبر، روایت کے قبول کرنے کے بارے میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں، ان میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا ضرور لحاظ ہونا چاہیے، راوی نے صاف اور صریح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی، سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا صلعم تک غیر منقطع (یعنی مسلسل) ہو، پیغمبر خدا صلعم سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقویٰ اور تدین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں، ہر راوی کو اپنے اسبق راوی سے زیادہ حدیثیں پہونچی ہوں، ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو، تاکہ یہ امر متیقن ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا، اور دوسروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا، وہ قرآن مجید میں درج احکام یا قرآن مجید سے معلوم ہونے والے مذہبی عقائد یا مستند حدیث کے مضمون سے متناقض (مخالف) نہ ہو، اس میں عجائب و غرائب، دور از عقل بیان نہ ہوں، بلکہ مفہوم حدیث ایسا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو، کوئی حدیث

جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدۂ مذہبی کی بنیاد بن سکتی ہے لیکن اگر وہ حدیث ایک ہی شخص کی روایت ہے تو مفید یقین (یعنی عقیدہ کی بنیاد) نہیں ہو سکتی، بلکہ افادۂ ظن کرتی ہے"۔(خطبات احمدیہ: ص ۳۵۴)

اسی بنا پر علمائے اسلام نے احادیث کی قسمیں، ان کے درجات، قبول کی شرطیں، کتب احادیث کی تفصیل، ان کے درجہ و معیار کی وضاحت، راویوں کی قسمیں، ان کے تفصیلی حالات، سب ہی پر کام کیا ہے اور حق اور ناحق، صحیح اور غلط کی تمیز، قرآنی احکام، قرآنی عقائد، مستند احادیث اور غیر معتبر روایات پر اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ اب مسلم اور غیر مسلم محقق کے لیے اصلیت کا پتہ لگانا کچھ بھی دشوار نہیں، مگر مستشرقین رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتے، اور نہ ہی راویوں کے حالات اور روایت کے معیار سے کچھ غرض رکھتے ہیں، بلکہ وہ بقول سرسید مرحوم:

"ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں یورپین مصنفوں نے اس قدر محتاطانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے، جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے، بلکہ برخلاف اس کے بغض اور تعصب کی وجہ سے انہوں نے دیدہ و دانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے، جس کی شعاعیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، اور اس طرح پر انھوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ "کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ، جو ارادۃً نہیں دیکھتے"۔ (ایضاً ص ۲۲)

مقدس جھوٹ | غلط روایات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں علمائے اسلام اور علمائے مسیحیت یا مستشرقین کے درمیان ایک بنیادی فرق سرسید مرحوم کے نزدیک یہ بھی ہے کہ:

"علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو بھی اپنے مذہب کے تقاضہ میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے، اور اس لیے انہوں نے جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو، گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادے سے انھوں نے ایسا کیا ہو، جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی، مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے

باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔" (ایضاً ص ۴۰۔۴۳)

سرسید مرحوم نے اس بارے میں خود سر ولیم میور کی اردو کتاب "تاریخ دین مسیحی" سے یہ تصریح نقل کی ہے "دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے تو انہی کے بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں، آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے مطابق طریقۂ مذکور تسلیم ہوا، اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی، نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا، پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں، جو اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں، اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقے کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجراء کرتے تھے کہ اس حیلہ سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں گے، اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں، سو اسی طرح مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے، کتاب لکھ کے کسی حواری، یا خادم حواری، یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے، ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا، اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا، یہ بات بہت ہی خلاف حق اور الزام شدید کے قابل تھی"، (تاریخ دین مسیحی حصہ دوم باب ۱۳، مؤلفہ سر ولیم میور) اسی سلسلہ میں سرسید نے موشیم کی کتاب "تاریخ مذہبی" سے یہ عبارت بھی درج کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ "میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا ...... مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس قصور سے مبرا نہ تھے صریح انکار نہیں ہو سکتا"، (ایکلیزیاسٹکل ہسٹری باب ۳ ص ۷، مطبوعہ سنہ ۱۸۶۰ء) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حضرت مسیح کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں، ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شاید برے نہ تھے، بلکہ وہ وہمی، سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے، اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات حواریان مقدس کے نام سے سارے جہان میں مشہور کی گئیں"، (کتاب مذکور حصۂ دوم باب ۲ ص ۳۶)

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے معیار اور رتبہ سے عیسائی عالموں کی ناواقفیت

دوسرے مذہب والوں یا حکیموں اور فلسفیوں کے مقابلہ میں "مقدس جھوٹ" کا اثر مستشرقین پر بھی پڑا، جو ان کے لیے کوئی مستحسن بات نہ تھی، اس سے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی، سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجۂ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں، اور درایت کے تو نام سے بھی وہ واقف نہیں ہیں، وہ جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گیے، اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ ان کی یہ مایۂ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گزرتی ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جو ان کی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے، ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرف اوقات پر افسوس کرتے ہیں"۔ (خطبات ص۳۵۶)

ڈاکٹر اسپرنگر

ڈاکٹر اسپرنگر کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ "اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے، اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا ہو اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو، اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو"۔ (خطبات: ص ۳۵۷)

روایتوں پر سر ولیم میور کے اعتراضات

تاریخ اور سیرت کے بارے میں دور اوّل کے مسلمانوں کی روایتوں پر سر ولیم میور نے بڑی تفصیل سے اعتراضات کیے ہیں، اور سر سید مرحوم نے ان کے جوابات بھی بڑی وضاحت سے دیئے ہیں، اس بارے میں انھوں نے پہلے تو سر ولیم میور کے طرز فکر پر ان الفاظ میں شکوہ کیا ہے کہ:

"ہم افسوس کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہی ان کے دل

میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی لوگوں کی محض بناوٹ اور ایجاد ہیں، انھوں نے شروع ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں، وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے، جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشا ہوتا ہے یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے۔" (خطبات: ص ۳۵۸)

سر ولیم میور نے ایک بات یہ کہی ہے کہ" ان روایات ہی نے استداد زمانہ کی وجہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا، ان کے پیروؤں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ محمدؐ کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں، جس سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں، جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کا کوئی اندازہ سر دست موجود نہ ہوتا تو حافظہ کی قوت کو واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی۔"

مذکورۂ بالا اعتراض میں اصل نکتہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کی روایتوں کی تعظیم اور احترام و توقیر جو زمانہ ما بعد کے لوگوں میں تھی، وہ سر ولیم میور کے الفاظ میں" امتداد ایام کا اثر تھا" جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود پیدا ہوا ہوگا، سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں زیادہ نیک اور پرہیز گار شخص کا کیا حال ہوگا، اگر اس کی ہر بات اور عمل کو دغا بازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کر سکے اس کے اوپر عائد کریں۔" (خطبات)

وہ سر ولیم میور سے یہ سوال کرتے ہیں کہ" حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات، ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا، ان کا" ید بیضا"" دریا کا خون کی مانند ہو جانا"" مینڈکوں کی وبا"، اور دوسرے معجزات جو ان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے، بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا، من و سلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدائے تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا، خدائے تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا، اور ان کو" میری منتخب قوم" کے خطاب سے سرفراز کرنا، اور اس قدر برکتیں ان کو

عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو "میرا پہلوٹا بیٹا" کہہ کر ممتاز کرنا، کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے، نہیں کہہ سکتے، جن کو اس نبی علیہ السلام کے سرگرم پیروؤں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو، جنھوں نے "مشکلانہ تعظیم" اور "شائقانہ تکریم" کے سبب امتداد زمانہ میں اپنے نبی کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا ہے؟ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰ پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی (جو دراصل سر ولیم میور ہی کے طریق استدلال اور زبان اور اسلوب بیان کے مطابق ہوگی) کہ "ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبے سے عروج حاصل ہوا، اور زمانہ ان کے پیروؤں سے ان کو جس قدر دور کرتا گیا، اس عجیب و غریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں سے (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام و سلام رکھتا تھا، زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا، دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل ہیں، اور وہ ایسے سامانوں سے گھرے ہوئے اور آراستہ ہیں جو انسان کے امکان سے باہر ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے عقیدت مند اور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا، جن میں حضرت عیسیٰ کی کراماتی پیدائش اور ان کا (عیسائیوں کے خیال میں) از سر نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا، یعنی حسب قانون "وحدت فی التثلیث" اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے،

سیرت و تاریخ کے ابتدائی راوی یعنی صحابۂ کرام اپنے کردار اور بلندیٔ اخلاق میں ممتاز ترین افراد تھے، اسی لیے سرسید مرحوم بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "عقل و فہم کی تعلیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع ہے جنھوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو، البتہ اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر مصنف کو یہ لازم ہے کہ جب دوسروں کی تحریروں اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کر لے۔" (ایضاً: ص ۲۶۰ - ۲۵۹)

سرسیدؒ صاف اور واضح الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف ملتفت اور مصروف کر دیا تھا، وہ امرِ حق کو مانتے تھے، اور اس جہانِ فانی کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے، وہ ایماندار، صادق القول اور نیک طینت تھے، اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے اس غرض سے کہ احادیث نبوی کا ایک مجموعہ تیار ہو جائے، دور دراز کا سفر اختیار کیے تھے، انہوں نے حکامِ وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کو بے شمار دقتیں پیش آئیں، اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بمشکل خیال میں آ سکتی ہیں، مگر اس کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی، اور ان کو انجام تک پہونچایا، جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو مذہبی جذب اور مخلصانہ طریقوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی، اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہو سکتے، کہ ان کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب کریں، اور اس طرح کے بے بنیاد بیان پر کہ "وہ محض بناوٹی بیانات ہیں" ان تصنیفات کی بے جا تحقیر کریں"۔ (خطبات: ص ۳۶۱)

کیا حدیثیں سیاسی ضرورت کی وجہ سے سامنے آئیں؟

سر ولیم میور کا یہ بھی خیال ہے کہ "ترقی پذیر سلطنت کی ضرورتیں، قرآن کے مجموعۂ سیاست میں ایجاد اور اضافہ کا سبب بنیں، جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادگی اور محدود نظامِ تمدن کے لیے کافی تھیں، ان کی اولاد کی روز افزوں ضرورتوں کیلئے اب ناکافی ہو گئیں"۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے محدود اور معراء (؟) گئے تھے اور صرف اصولی احکام و مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے"، لیکن بقول سرسید احمد خاں:

"اس بیان میں سر ولیم میور نے دو طرح کی غلطیاں کی ہیں، ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت یا مجموعۂ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا، یہ لوگ محض دین کی طرف

متوجہ تھے، انھوں نے احادیث نبوی کو صرف دینی اغراض سے جمع کیا تھا، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جب کہ مسلمانوں نے امور سیاست کو الہامی سمجھا ہو، خود جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہ رض سے صلاح لیتے تھے، اور اس کے مطابق کاربند ہوتے تھے، قرآن مجید اور نیز پیغمبر خدا نے سیاست اور انتظام مدن کے سبھی معاملات کو چند اصول عام کے بعد بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے، اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کرکے وہ کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں، پس مسلمانوں کو اور انکی اولاد کو اپنی روز افزوں ضرورتوں میں قرآن کی تکمیل کیلیے حدیثوں کو تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، ہاں بلاشبہہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے، اسی طرح کی کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی، اور یہ اس محبت اور عشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبر کے ساتھ رکھتے ہیں، اور اسی لیے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے، پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی، مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین معنی میں بیان کیا ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۲)

انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ "کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا، ہم علانیہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نکال دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو، اس کے برعکس ہم یہ بات اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثنا، ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفاء کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے، اس زمانہ کے خلفاء، جناب پیغمبر خدا کے خلیفہ نہ تھے بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے، کیونکہ سلسلۂ خلافت (یعنی پیغمبر خدا کے جانشین خلفاء کا زمانہ) جناب رسالتمآب

کی وفات کے تین ۳۰ برس بعد ختم ہو گیا۔ (خطبات احمدیہ: ص ۳۶۴)

سر ولیم میور کا واقدی سے استناد

سرسیدؒ فرماتے ہیں کہ "سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں"، پھر چند سطروں کے بعد وہ واقدی سے استناد پر گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ سر ولیم میور کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں، حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے، نیز اپنے عقیدے کے مطابق ان کو لازم تھا کہ اوّل احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت معترض ہوتے۔ تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اس ضروری امر میں کوتاہی پائی جاتی ہے، مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوشگواری سے ہضم کر جاتے ہیں اور دوسروں کی نسبت عجیب و غریب پیرائے میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۶۵)

مسلمانوں میں جو لغو، غیر معتبر اور موضوع روایتیں پیدا ہوئیں، ان کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ اکثر کتابیں صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں، اور ان کی صحت اور وجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول و قواعد اور سخت معیار مقرر کیے گیے ہیں، اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھہرائے گیے ہیں۔ لیکن اس موقع پر سرسیدؒ اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹی روایتوں کے باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے، مذہب عیسوی میں دینی کتب کے نام سے جو روزانہ ہر کلیسا میں پڑھی جاتیں، بے شمار رسالوں اور موضوع کتابوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، جن کی وجہ سے ان کے دیندار حلقوں میں بے انتہا مناقشے اور قضیے پیدا ہو گیے، قسطنطین اعظم

نے دین عیسوی قبول کیا، تو اس نے سنہ ۳۲۵ء میں مجلس نیس (نیسیا) منعقد کی، جس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ صحیح اور موضوع انجیلوں میں تمیز کی جائے، بقول والٹیر عیسائیان سابق پر اس لیے نفریں کی گئی کہ انھوں نے عیسیٰؑ کے نام پر چند اشعار گھڑ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے، اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جب کہ اس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا، حضرت مریمؑ کے خطوط، سنیقا کی جانب سے پلوس کے نام خطوط، پلاط کے خطوط اور افعال مصنوعی اناجیل، جھوٹے معجزات اور دوسری ہزاروں جعل سازیوں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے تھے، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی،

مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے سنہ ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی، الوہیت مسیحؑ کا وہ مسئلہ طے ہوا جس نے کلیسائے نصاریٰ میں ہلچل ڈال دی تھی، اس مجلس میں اٹھارہ[۱۸] بشپ اور دو[۲] ہزار پادریوں نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت سے انکار کیا، اور اس پر دلیلیں دیں، لیکن سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیحؑ خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں، خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں، ایریس جو اٹھارہ بشپہائے معترضین میں سے ایک تھا، فرقہ یونیٹیرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے منکر تھے، وہ بے دینی کے اسی الزام کی وجہ سے جلاوطن کر دیا گیا، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قسطنطنیہ بلا لیا گیا، جہاں اس کے عقیدہ کو بالاتری حاصل ہوئی، اور تمام مملکت روم میں اس نے رواج پایا، جبکہ اثناسیوس مذہب فرقۂ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا، اس کے خلاف سخت جدوجہد کی، اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں یہ بھی تحریر کیا گیا ہے کہ آباے کلیسا توریت اور انجیل کے صحیح اور غیر صحیح صحیفوں کے انتخاب و تصحیح میں نہایت حیران اور ششدر ہوئے، چنانچہ ان سب کو بلا امتیاز و تمیز ایک قربان گاہ پر رکھ دیا، اور کہا جاتا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے، زمین پر گر پڑے،

دوسری مجلس سنہ ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی، جن میں روح القدس کے بارے میں ان امور کی تشریح کی گئی جن کو مجلس نیس میں غیر منفصل رہنے دیا گیا تھا، اب اس موقع پر یہ عقیدہ

قرار پایا کہ روح القدس وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے، اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے، ۱۳۸۴ء میں تیسری عام مجلس نے جو مقام افسیس ہوئی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریمؑ ام اللہ (مادر الٰہ) تھیں، خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰؑ میں دو صفتیں تھیں، اور ایک وجود، نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ عظیم تفرقہ اور اختلاف واقع ہوا جس کے بعد شہر روم میں پوپ کے عہدہ کے لیے تقریباً انتیس[29] خونریز جنگیں ہوئیں (خطبات احمدیہ: ص ۶۸-۳۶۵)

سر ولیم میور، تورات و انجیل کی مذکورۂ بالا ناگفتہ بہ صورت حال سے نظریں بچا کر اسلامی روایات کو اسی سطح پر لانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، چنانچہ انھوں نے بعض یورپین اہل تحقیق کی یہ رائے درج کی ہے کہ وہ بخاری کی درج کردہ روایات میں سے نصف کو لائق اعتناء نہیں سمجھتے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے ان روایات سے استدلال نہیں کیا ہے جن کو خود انھوں نے بھی معتبر مانا ہے، بلکہ بقول سرسید:

> "یورپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے اوّل ہیں، بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی، مولود نامہ، معراج نامہ اور دوسری ان کتابوں پر مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں، جن میں بیہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے" (ایضاً: ص ۳۶۹)

سر ولیم میور کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "جامعین حدیث نے اگرچہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے، معتبر روایتوں کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کو نہیں برتا" کیونکہ جمع روایات کا کام شروع ہوا تو اوّل یہ کوشش ہوئی کہ معتبر راویوں کی تحقیق کر کے ان کی روایتوں کو قلمبند کر لیا جائے، قرآن و حدیث کے مقصد اور اصول و کلیات کی روشنی میں بھی غلط اور نامعتبر روایتوں کی تمیز کا کام کیا گیا، چنانچہ بہت سے علمائے محققین ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے، اور اس کیلئے قواعد بھی منضبط کیے ہیں، اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں، اور مضامین حدیث کے لحاظ سے، حدیث کے اعتبار و عدم اعتبار کو پرکھنے کے لیے ایک مستقل فن کی بنیاد رکھی جسے فن درایت کہا جاتا ہے، ہر ایک

مسلمان کے اختیار میں ہے کہ ان اصول درایت سے جس کتاب کی حدیث پر چاہے معتبر اور نامعتبر ہونے کے بارے میں روشنی حاصل کرے" (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۱)

اوائل عمر سے متعلق روایتوں پر اعتراض

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی عمر سے متعلق روایتوں پر بھی سر ولیم میور نے بے سروپا اعتراض کیے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صاحب کے اس زمانے کے حالات جن لوگوں نے بیان کیے ہیں، وہ لوگ آپ صلعم سے عمر میں یا تو چھوٹے تھے یا برابر، اس لیے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات، یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے، اور آپ صلعم کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کیے ہوں گے، مگر

"بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے پہلے یہ فرض کر لیا ہے، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ "روایت کی سب سے پہلے ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا" مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں، اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی، دوم یہ کہ موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کر لیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی، یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے، یہ امر تاریخی واقعہ کے خلاف ہے، اور صحابہ بھی بہ لحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود دیکھا اور ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر، اور دوں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو، اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں"

(ایضاً: ص ۳۷۲)

سرسید یہ بھی وضاحت کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا، شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، سراسر انحراف ہے، گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کو [illegible] ہوتا ہے، اور جن سے کسی واقعہ کے صدق یا کذب

کا فیصلہ ہوسکتا ہے، صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کے بارے میں کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق کرے فوراً تسلیم کر لیا جاتا ہے، اور دوسری صورت میں راویوں کی کثرت اور تواتر سے اس کی صحت معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جناب پیغمبر خدا کے زمانہ کے واقعات کی تصدیق کے لیے یہی صورت لازم اور ممکن ہے کہ انسان نے اپنی عقلی صلاحیتوں کے ذریعہ کسی مذہب کا لحاظ کیے بغیر جو سچے اور مسلمہ قوانین شہادت مرتب کیے ہیں ان ہی کی روشنی میں گواہوں کے بیان صدق کا امتحان کریں،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوائل عمر میں جو واقعات پیش آئے، سر ولیم میور کے نزدیک "ان کے بارے میں کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی"۔ اس اصول کو سر ولیم میور، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے ابتدائی عرصہ تک وسعت دیتے ہیں، جب کہ آپ نے علانیہ دعوائے نبوت کیا، شرک سے مخالفت فرمائی، اور باشندگان مکہ سے لڑائی کے حالات پیدا ہوئے، وہ اپنے بیان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب کہ انھوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے، لیکن بقول سرسید:

"سر ولیم میور کا یہ فرضی اصول جو انھوں نے اپنی ذہانت سے ایجاد کیا ہے، اگر مان لیا جائے تو حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اس سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پہلے دیکھنے میں آئی تھی کیا کیا جائے گا، کیا ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی، اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا؟ ...... ہم کو آنحضرتؐ کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرتؐ کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو، مگر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے باب میں ایسا نہیں ہے، ان دونوں کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے، ہم کو کس طرح یہ یقین ہوسکتا ہے کہ وہ نامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا، جس کو تمام دنیا حضرت موسیٰؑ کہتی ہے، اور ہم کو کس طرح ان

بات کا مکمل یقین ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ جس کو ہم کلمۃ اللہ اور روح اللہ اور عیسائی اسکو ابن اللہ کے ناموں سے مخاطب کرتے ہیں، اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا، داؤد کی نسل سے تھا، اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، تا دونوں اور جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی بھی محال اور غیر ممکن چیز کا ثابت کرنا۔"

(خطبات احمدیہ باب ص ۵۵)

مسلمان تو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور کا اصول خود ان کے حق میں سخت مضر ہے جس سے ان کی اپنی مذہبی بنیادیں ہل جاتی ہیں، پھر یہ اصول شہادت کے مسلمہ قوانین کے بھی برخلاف ہے، جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی واقعات کا تعلق ہے تو "بہت سے برسوں کے گذرنے کے بعد" ان کی روایت کا افسانہ بھی ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے، اس لیے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غیر مشہور زمانۂ حیات کو اس قدر وقت نہیں گذرا تھا، فرمانۂ روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے، جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کی پیدائش، ان کا بچپن، ان کا لڑکپن، اور ان کی نوجوانی دیکھی، اور گو بقول سر ولیم میور "ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر خدا کی زندگی کے حالات کو بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا" تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دید باتوں کو بھول گیے ہوں، برخلاف اس کے جب کہ ایک بے کس یتیم بچہ، ایک ایسا شخص جس کی نسبت تمام باشندگان مکہ میں سب سے کم یہ گمان ہو سکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں، اور ایسا غیر مشہور شخص وہ چال چلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو، اور جو اس کے خاندان، اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ ہر شخص جو اس سے قرابت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانے کے حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا ... اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ

کرے گا، جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں، اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ کے گواہ ہوں۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۳۷۶)

لیکن سر ولیم میور اس دور سے متعلق کسی بھی طرح کی "صراحت کو بادشاہت کی ایک بڑی علامت" تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہ اصول واضح طور پر مسلمہ قانون شہادت کے خلاف ہے، اور وہ نتیجہ جو انھوں نے عیسائیوں کی تحقیق کے قانون کو روایات اسلام پر جاری کرکے حاصل کیا ہے، یہ ہے کہ بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا، جن میں گزرے ہوئے بیان، پیشگوئی ہوئے کلام کی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں، لیکن بقول سرسید، سر ولیم میور کا یہ اصول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا، اور جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے، جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور بوجہ امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں، تو اس بنا پر جو شبہ ہوتا ہے، راوی کی نسبت ہوتا ہے، کیونکہ اس کو تفصیل نہ یاد رہی، نہ کہ مضمون روایت کے بارے میں، کیونکہ اس کا صحیح ہونا غیر ممکن نہیں، اور اسی لیے الٹا نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جامعین روایت کے نزدیک، قواعد کی روشنی میں راوی کا چال چلن ہر طرح درست ثابت ہو، اس کے حافظہ پر اعتماد ہو، اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کے صحیح تسلیم کر لینے میں کچھ تامل و شبہہ باقی نہیں رہتا۔ (ایضاً: ص ۳۷۸)

دور نبوت کے اہل کفر کے بارے میں

مکہ کے دور نبوت، بلکہ فتح مکہ سے پہلے تک کے زمانۂ نبوت کو بھی سر ولیم نے اپنے قیاس و تخمین کا نشانہ بنایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ کے کفار یا تو ایمان لا چکے تھے یا وہاں سے نکال دیے گئے تھے، اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا جو ان کے بارے میں یک طرفہ بیانات بے بنیاد اتہامات اور مبالغہ آمیز الزامات کی تردید کرتا، اور چونکہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی، اور اسی وجہ سے اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے، اور مورخین ہمیشہ اس شہادت پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے، لیکن سر ولیم کا یہ اعتراض نہ صرف یہ کہ بے بنیاد ہوائی ہے، بلکہ اس سے خود ان کے مسلمہ عقائد اور اصولوں کی بھی نفی لازم آتی ہے، بقول سرسید:

"صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابعین پر بالخصوص صادق آتا ہے
خصوصاً اس زمانے پر جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو
نیست و نابود کر دیا تھا، اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب
قبول کر لیا تھا۔ مگر ہم اس امر کو ان کتاب کے [illegible]
ہیں، اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ تمام انسانی ارادی اور [illegible] کے کل آثار
یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں، لاکھوں خلق
اشخاص کے سینوں سے یکلخت محو ہو گئے ہوں، اور وہ سب یک دل و یک زبان ہو کر بدترین
افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں، یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو
ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں، اور جن کو ان سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ یہی امر
یعنی ان واقعات کے گواہان معائنہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات
میں غلط بیانی کے عدم امکان کا ثبوت ہے۔" (خطبات احمدیہ، ص [illegible])

راویوں کا الزام سر ولیم اپنے تعصب اور جوش میں عجیب و غریب باتیں فرماتے چلے گئے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ "محمد صاحب کی صحبت میں راوی کی ہوس نے بار پایا۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ شرافت و عزت وابستہ تھی، اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کا سبب تھی، اور اس نے محمد صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے تعلق پیدا کرنے اور وحی میں مذکور ہونے کا سب سے بڑی کشش الحصول عزت کا امکان پیدا کر دیا تھا، جو خلاف فطرت واقعات کے ایجاد کیا جانے کا باعث ہوئی، اور روایات میں غلط بیانی کا سبب بنی"۔ اس موقع پر سرسید کا جواب پڑھنے کے لائق ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جب کوئی مصنف اپنے خیالی رائے اور تعصب کی وجہ سے ایسی رائے قائم کرے تو
اس میں کچھ چارہ نہیں، یہ کس طرح خیال میں آسکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانے کے
معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں، اور جن کے دلوں کے اندر سچی محبت ہو، اور ان
میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر خدا صلعم کی سنت کی پیروی ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہے

اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ابدی گمراہی کا موجب ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور قواعد سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی، فریب دہی اور ریاکاری میں یکلخت مبتلا ہو گئے ہوں، خلاصہ یہ کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں، اگر تم کسی مذہب کو لو، ہندو مذہب کو، بدھ مذہب کو، دیگر مشرک مذاہب کو، یہودی مذہب کو، عیسوی مذہب کو اور اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک، پروٹسٹنٹ، یونی ٹیرن، ٹرینیٹیرین ویزلینز، بپٹسٹ، جمپرز، مورمنز وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی، صداقت، دیانت داری، راست بازی، سرگرمی، راسخ الاعتقادی اور جاں نثاری کو پاؤ گے، اور اپنے نبی کے احکام اور اپنے مذاہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے، ہم کو اپنے اس بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے ہزاروں مثالوں میں سے صرف ایک ہی مثال دینا ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ جب زید بن ثابتؓ سے حضرت ابوبکرؓ نے قرآن کے منتشر اجزاء کو ایک جگہ جمع کرنے کے لیے فرمایا تو کچھ عرصہ تک زید بن ثابتؓ خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے، اور پھر جب ہوش و حواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے جوش میں سوال کیا کہ ایسے کام کو جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا، آپ کیونکر جسارت کرتے ہیں، اس طرح کی ہزاروں مثالوں کی موجودگی میں یہ بات کس طرح ذہن میں آسکتی ہے کہ لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے، اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے، فوراً ہی (سر ولیم کی بیان کردہ) برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر دیا ہو، اور ایسے ایسے گناہ عظیم ان سے سرزد ہوئے ہوں" (خطبات: ص ۳۸۱)

موضوع روایات کو خارج کیے جانے کی وجہ | راویوں کے عدم اعتبار یا بہت سی روایتوں کے بالکل ہی بے اصل ہونے

کی وجہ سے محدثین نے اپنی کتابوں میں بہت سی روایتوں کو درج نہیں کیا، یا ان کو موضوع اور [illegible] قرار دے کر نظر انداز کر دیا ہے، سر ولیم میور نے ان کے بارے میں بھی اپنے قیاسی گھوڑے دوڑائے ہیں، اور تعصب کی وجہ سے ان روایتوں کے خارج کیے جانے کی عجیب ۔ ۔ ۔ توجیہ کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں، اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوتی"، پھر وہ کہتے ہیں کہ اس معاملہ کو کسی قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گزشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئیں، کچھ پتہ نہیں معلوم ہوتا۔

سرسید نے میور کے "ایک طول طویل بیان کا خلاصہ" درج کرنے کے بعد تفصیل کے ساتھ اس کا جائزہ لیا ہے، ان کے خیال میں سر ولیم میور کے مذکورۂ بالا بیان سے "صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے، بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے، اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے، جو اپنے بیانات، اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے، اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذہب کی باتوں پر اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی طرح پر مضرت پہونچی ہو، نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے، اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں گے، جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذہب کے بارے میں استعمال کیا کرتے تھے، سر ولیم میور کہتے ہیں کہ "روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں، کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں، عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں، کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوتی"، مگر اس کے جواب میں سرسید فرماتے ہیں:

"یہ کیسا غلط بیان اور یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں، گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقعہ ہے، اور شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا، اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ صرف اس قدر کہہ کر ہی اس کو طے کرنا چاہتے ہیں کہ "اس کو کامل طور سے ثابت کرنا ۔۔۔ غیر ممکن

ہے، کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کو جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیا اس طرح پر دلیل لانا تعصب کا اثر نہیں ہے، جبکہ سر ولیم میور کا یہ بیان صحیح بھی نہیں ہے کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تشہیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے، مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ خود قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں، اُن میں کوئی بات خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی، رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلاط واقع ہوئے تھے، ہم تسلیم کرتے ہیں، مگر ہم ان سے وہ بے جا اسباب منسوب کرنے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں، اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں۔" (خطبات: ص ۳۸۴)

ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ سر ولیم کی ہم نوائی

ان مستشرقین نے ایک اور بے اصل قصہ کو خوب خوب ہوا دی ہے، جو کسی معتبر سند کے بغیر ایک کتاب مواہب لدنیہ میں درج ہو گیا، مگر مستشرقین کو روایت کے معیار یا اس کی صحت کے امکان سے کچھ بحث نہیں ہوتی، وہ اپنے تعصب کی وجہ سے ایسی روایت کو کسی تحقیق اور چھان بین کے بغیر ہی اچک لیتے ہیں، اور سادہ لوح عوام کو فریب دینے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر اسپرنگر سورۃ والنجم کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "محمد صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی، اور ان کو تسلیم کر لیا، اور جب وہ سجدہ میں گیے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا۔" اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ سے منسوب کرتے ہیں، سر ولیم میور نے اس قصہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے، جس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے۔" وہ اس کیلیے واقدی اور طبری کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں۔

مواہب لدنیہ کے مؤلف نے اس "مضمون" سے متعلق تمام مختلف روایتوں اور علماء کے خیالات کو یکجا جمع کر دیا ہے، جس کو سرسید نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، اس روایت کا خاص اور اہم جزء یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بتوں کی تعریف میں "تلك الغرانيق العُلى وان شفاعتهن لترتجى" کا فقرہ منسوب کیا گیا ہے، اور یہ روایت خود صاحب مواہب لدنیہ کے الفاظ میں تین سندوں سے مروی ہے، جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہونچا، پھر مواہب لدنیہ کے مؤلف نے بھی

کہتے ہیں کہ "جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ الفاظ نہیں فرمائے تھے تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی" (خطبات احمدیہ: ص ۹۶ — ۲۹۵) مواہب لدنیہ کے مؤلف کو بھی اس روایت کے کئی سلسلوں کو دیکھ کر غلط فہمی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا خیال ہے کہ "جو لوگ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچتا ہو تسلیم نہیں کرتے، وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کر لیں گے"، مگر سرسید نے مواہب لدنیہ کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں اس کی تردید کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ بیان اس کا محض غلط ہے جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں، اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف روایتوں کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد سلسلے ہیں، اور مرسل روایتیں یعنی جن کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا ہو گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو، سند اور اعتبار کے قابل نہیں جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو، مزید یہ کہ وہ روایت قرآن مجید کی مخالف نہ ہو، لیکن جب کوئی روایت مذکورہ بالا روایت کی طرح قرآن مجید کے احکام کے خلاف ہو، اور جب کہ وہ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تمام حالات کے خلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں، اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصولوں سے اتفاق نہ رکھتی ہو، پھر ایسی مشتبہ اور مختلف ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے، اور یہ کہ وہ الفاظ واقع نہ ہوا ہو، تو ایسی روایت از روئے عقل و انصاف کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے، جن میں اس روایت کو داخل کرنے کی مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے، وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا نہایت صاف اقرار کرتے ہیں، اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔" (خطبات: ص ۲۹۵)

اصل واقعہ جیسا کہ سرسید نے وضاحت کی ہے یہ ہے کہ "جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک

ایسا زمانہ گذرا ہے جب آپ مکہ میں تشریف رکھتے تھے، کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے، اور اپنے وحشیانہ بغض سے ہر نئے ڈھنگ سے آنحضرتؐ کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے، وہ جناب پیغمبر خداؐ کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی [illegible] کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، نماز پڑھنے کے وقت تنگ کرتے، اور جب آپ خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان فرماتے تو مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے، پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ [illegible] ہوتا ہے، وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم پڑھ رہے تھے، تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی اور یہ کہا: "وتلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترتجیٰ"۔ اور جب پیغمبر خداؐ نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی اپنے بتوں کو سجدہ کیا، مشرکین میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا، کچھ عجب نہیں کہ مشرکین یہ سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا، مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خداؐ نے وہ جملہ نہیں کہا (جیسا کہ خود صاحب مواہب لدنیہ نے نقل کیا ہے) اور اس لیے مشرکین آنحضرتؐ سے اور زیادہ دشمنی پر آمادہ ہو گئے، اس وقت کے مسلمان ہرگز یہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ فرمایا ہو، اور کہنے والا بھی متعین اور واضح نہیں ہوا، اس لیے انہوں نے کہا یہ بات شیطان نے کہی تھی، اس کے بعد جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت آئی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا، جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو، انھوں نے کہا کہ پیغمبرؐ ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے، کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے، مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر خداؐ نے وہ لفظ کہے تھے، باایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب رسول خداؐ کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی طرح پر بھی پیغمبر خداؐ کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا، کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے، کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو، بلکہ کسی نے صحابہؓ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے یہی بے سروپا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری، واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ: ص ۹۸-۳۹۶)

سر ولیم میور کے خیال میں روایت کے معتبر ہونے کے لیے ایک عجیب قاعدہ

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "جب کسی روایت میں محمد صاحب کی تحقیر کے کلمات ہوں مثلاً بعد ہجرت اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو، یا کار خیر میں ناکام ہونا یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشائے اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی دلیلیں قوی ہیں، کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں ایجاد کر لی جائیں، یا ایجاد ہو کر محمد صاحب کے متبعین میں رواج پا سکیں۔"

مگر سرسید کے خیال میں "درحقیقت کسی روایت کی صحت کو ثابت کرنے کا یہ ایک عجیب طرز ہے" وہ فرماتے ہیں کہ "کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور معتبر مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے وضع کیا، یا اسلام کے نام پر گھڑ لیا تھا، اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں، اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں، یا وہ کسی کی غلطی سے بعض مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں، اور جن کی نسبت علما نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں، اور اصل میں یہودیوں نے اور بعض عیسائیوں نے اس قسم کی بے ہودہ روایتیں اور قصے آنحضرت کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ ہمیشہ مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں، اختراع کر لی تھیں، اس لیے ان مذکورہ بالا وجوہ سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا ان کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتی، تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ "قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات بنالی جائیں یا گھڑ لیے جانے کے بعد متبعین محمد صاحب میں رواج پا سکیں" ان کی یہی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ (خطبات: ص ۳۹۹)

سر ولیم میور نے اسلامی روایات میں اختراع اور جعل سازی ثابت کرنے کے لیے مضحکہ خیز طریقے اختیار کیے ہیں، ان میں سے ایک کا نام انھوں نے "تاویل آمیز اختراع" رکھا ہے، اور پھر اس کی مثالیں بھی ذکر کرتے ہیں، مثلاً ابن [illegible] کے بقول، جبرئیل گویا تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب خدا سے دعا کیا کرتے تھے، اور خدا سے ان کی دعا کا نام بھی بتاتے ہیں، بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے یہ جستجو [illegible] امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی

میں لگا رکھا تھا، بلکہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد وہ بال جن پر رنگ، جو میسر ہوتا تھا، لگا دیا تھا، اور بعض[20] گواہ جن کو واقفیت کے بہی ذرائع حاصل تھے، بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر صاحب نے کبھی خضاب نہیں کیا اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آ سکتے تھے۔"

(خطباتِ احمدیہ، ص ۴۰۰)

لیکن خضاب کے بارے میں راویوں کے اس اختلاف سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ بیان واقعہ میں کسی جعل سے کام لیا گیا ہے جبکہ معمولی غور و فکر سے اختلاف کی اصلیت اور واقعہ کی اصلیت سمجھ میں آ سکتی ہے؟ چنانچہ سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ:

"اس میں شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال نہایت تھوڑے تھے، بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ جناب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی اور سر مبارک میں صرف سترہ[17] بال سفید تھے۔ آنحضرت نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں لگایا، جو لوگ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے ان کا یہی بیان ہے، اور چونکہ بال سفید ہونے سے پہلے اکثر بھورے ہو جاتے ہیں اس لیے جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا تو یہ خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں، اور ان ہی بھورے بالوں سے استدلال کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خضاب لگانا بیان کیا، خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے، بلکہ ان چیزوں کا ذکر ہے جس کو پیغمبر صاحب غسل کے وقت اپنے سر پر مل لیتے تھے، بس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف مذکورہ بالا سبب سے تھا اور یہ خود بخود ہو گیا، اس کو دیدہ و دانستہ بنایا ہوا یا وضع کیا ہوا نہیں کہا جا سکتا، ان کو یا اس قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے، مثلاً آنحضرت کا سیاہ بالوں والا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔" (ایضاً: ص ۴۰۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگشتری مبارک کے بارے میں بھی سر ولیم میور نے یہی طریقِ استدلال اختیار کیا ہے، ان کے خیال میں یہ خاتمِ نبوت کے بارے میں عقیدہ یا خاندان کا کوئی مفاد یا سیاسی تقاضوں کی وجہ سے

جانبداری کے رجحانات پیدا ہوتے لیکن پھر بھی اس سے متعلق روایتوں میں جو تناقض ہے، سر ولیم میور کے نزدیک وہ صرف جعل اور اختراع کا نتیجہ ہے "ایک فریق یہ کہتا ہے کہ پیغمبر صاحبؐ نے اپنے مراسلات پر مہر لگانے کی ضرورت کی وجہ سے خالص چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی، دوسرے فریق کا یہ کہنا ہے کہ خالد بن سعید نے اپنے لیے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی، اور محمد صاحبؐ نے اس انگوٹھی کو پسند کرکے اپنے پاس رہنے دیا، ایک تیسری روایت یہ ہے کہ اس انگشتری کو عمرو بن سعید حبش سے لائے تھے، چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ بن جبل نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں کھدوایا تھا، اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ محمد صاحبؐ اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے، اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ الٹے ہاتھ میں، کچھ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رہتا تھا، اور بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف رکھتے تھے، بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر "صَدَقَ اللّٰہ" نقش تھا، اور دوسری روایتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "محمد رسول اللّٰہ" نقش تھا، سر ولیم کے بقول "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ محمد صاحبؐ کی وفات کے بعد انگشتری کو ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی زیب انگشت کیا تھا، اور عثمانؓ کے ہاتھ سے چاہِ عریس میں گر پڑی تھی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ پیغمبر صاحبؐ یا ان کے خلفائے راشدین نے کوئی بھی انگشتری نہیں پہنی تھی، (ایضاً: ص ۴۰۲) سر ولیم میور نے روایات میں تضاد ثابت کرکے جس پُرفریب طریقے سے اصل حقیقت ہی کو مشتبہ بنانے کی کوشش کی ہے، اس سے ان کی زنگ خوردہ طبیعت کا راز فاش ہو جاتا ہے، جس پر سر سید احمد خاں یہ تبصرہ کرتے ہیں:

"(سر ولیم میور نے) جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے، وہ نہایت افسوس کے قابل ہے، یہ بیان سر ولیم میور کا کہ "یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں"، محض غلط ہے، اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے، وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی

کی انگوٹھی خیال کیا ہو، یا چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول والی انگوٹھی علیحدہ ہو، کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ بن جبل والی انگوٹھی پر "صدق اللہ" اور جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر محمد رسول اللہ کندہ ہو، کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو، اور کبھی الٹے ہاتھ میں اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف، اس انگوٹھی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے، جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی، سر ولیم میور نے چونکہ غلطی سے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق خیال کیا ہے، اس لیے اپنی دلیل میں کسی تفصیل کے بغیر یہ بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی، حالانکہ وہ صرف وہی انگشتری تھی جس پر "محمد رسول اللہ" کندہ تھا، پس ان روایتوں میں کوئی تضاد نہیں، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی خیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ جس سے وہ حجت و برہان کی صراط مستقیم سے منحرف ہو گیے، اور اسلام سے متعلق ہر چیز کو جو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو وہ شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل ہو گیے، اور ان کو وہ جعل سازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ کہہ کر بدنام کرتے ہیں، سر ولیم میور کو ان کی تجربہ کاری کی وجہ سے اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا، کہ وہ بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل و ثبوت نہ ہو ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کا باعث ہوتے ہیں، جس کی حمایت کی (ان کے پادریوں کی جانب سے) ان سے توقع کی گئی ہو" (خطبات احمدیہ، ص ۴۰۳-۴۰۴)

اسلامی روایات میں عیسائیوں کے "مقدس جھوٹ" کی تلاش،

عیسائیوں کے یہاں مذہبی روایات کا زیادہ تر دار و مدار اس "مقدس جھوٹ" پر ہے، جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے، اور اس کے کچھ شواہد کا تذکرہ آیندہ صفحات میں بھی کیا جائے گا، تعجب کی بات یہ ہے کہ سر ولیم میور نے اسلامی روایات

میں بھی "مقدس جھوٹ" کی جستجو ہے، اور اس بارے میں انھوں نے اسلامی روایات کو ان کے اصل مفہوم سے ہٹا کر اپنی مذہبی روایات کے معیار سے قریب تر لانے کی "سعادت" حاصل کی ہے، مگر قواعد تصنیف میں اس قدر انحراف کو دیکھ کر ہر صحیح الدماغ اور ذی ہوش شخص کو یقینی طور پر ملال ہوگا کہ وہ دین اسلام پر یہ الزام تراشی کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "مقدس جھوٹ" کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے، دینیات اسلام کی رو سے بعض حالتوں میں فریب روا ہے، خود پیغمبرؐ صاحب نے اپنے احکام کے ذریعہ اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے، کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے"۔ پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ عام عقیدہ یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے، کسی شخص کی جان بچانے کے لیے، صلح و اتفاق کرانے کے لیے، عورت کی ترغیب کے واسطے، اور سفر یا کسی خاص مہم کے موقع پر" سر ولیم ان چار موقعوں کیلئے اپنے خاص انداز میں مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، چنانچہ ان کے خیال میں" اوّل کی نسبت تو پیغمبرؐ صاحب کی صریح منظوری موجود ہے"، وہ لکھتے ہیں کہ" عمارؓ بن یاسر کو کفارِ مکّہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انھوں نے رہائی پائی، پیغمبرؐ صاحب نے اس فعل کو پسند کیا، اور فرمایا کہ" اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا"۔ (واقدی ۱/۲۲۷) ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا، اور جب تک کہ ان سے محمدؐ صاحب کی مذمّت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی، ان کو نہ چھوڑا، جب وہ پیغمبرؐ صاحب کے پاس آئے، اور انھوں نے حال پوچھا تو کہا کہ یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی، جب تک کہ میں نے آپ کی مذمّت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا، پیغمبرؐ صاحب نے پوچھا کہ تمہارے دل کا کیا حال ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے، تب محمدؐ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا، محمدؐ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ" عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے"۔

سر ولیم میور کی اس نکتہ چینی کے جواب میں سرسید کو، شکسپیر کا یہ قول یاد آگیا کہ" دیکھو کہ ایک سادہ قصہ کس طرح تم کو دھوکہ دیتا ہے" اس کے بعد وہ اس "نکتہ چینی" کا تجزیہ کرتے ہیں:

" اول تو ان روایتوں کی جن کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے، اور دوسرے

جن الفاظ میں موصوف نے اس مضمون کو بیان کیا ہے، وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں، سر ولیم اول موقع جھوٹ بولنے کے جواز کا کسی کی جان بچانا کہتے ہیں، اوّل تو یہی غلط ہے، جو روایتیں انھوں نے بیان کی ہیں، ان کے مطابق ان پر لازم تھا کہ "اپنی جان بچانا لکھتے" اور اس بے دھڑک اور جرأت آمیز بیان کے بجائے سر ولیم کو لازم تھا کہ تمام شرطیں قیدیں اور مواقع جو "سچ" سے اس طرح انحراف کو جائز ٹھہراتے ہیں، واضح کر دیتے جس فریب دہ اور عیب دار پوشاک میں سر ولیم میور نے اس مضمون کو آراستہ کیا ہے اگر وہ اتار لی جائے تو جائز، منصفانہ دلیل اور صحیح اصول و مقدمات کے ذریعہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ اگر اہل کفر بے رحم اور جفا کار لوگ جبر و اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی آدمی سے اس چیز کا انکار کرالیں جس کو وہ اپنے دل سے، اپنے ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس پر ایسی مصیبت میں بھی وہ یقین رکھتا ہو تو ایسے وقت میں "اپنے انکار" سے وہ سزائے ارتداد کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۴۰۵)

وہ عہد و پیمان جن کی تکمیل و توثیق ظلم اور جبر کے زور سے کی گئی ہو ان سے انحراف کا جواز سرسید کے الفاظ میں "فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ثابت ہوتا ہے، اس بادشاہ کو چارلس خامس جنگ پادیا (۱۵۲۵ء) میں قید کر کے ماڈرڈ کے ذلت آمیز صلح نامہ پر بزور منظوری حاصل کر کے دستخط کرا لیے تھے، بادشاہ فرانس نے اس قید سے چھوٹتے ہی زور و زبردستی کا عذر ظاہر کر کے اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے انکار کیا، اور پوپ کلیمنٹ سابع نے اس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔"

سرسیّد ظلم اور جبر سے لیے ہوئے "عہد و پیمان" کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ "آدمی کے افعال میں جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے، اور اس بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں، کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے اس کو اذیت دیگر اور قتل کی دھمکیوں کے بعد زبانی طور پر یا تحریر کی صورت میں حاصل کر لیے گئے ہوں، اسی قدر سزا کے مستحق ہوں گے، جیسے کہ اس آدمی کے کلمات اور حرکات جو کسی جبر اور زبردستی کے بغیر اس سے سرزد ہوئے

ہوں، سرسیّد نے اس موقع پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

"یہ اصول جس سے اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے، اور جو محض ایک بے خطا اصول اور قدرتی فطرت کا سچا نمونہ ہے، اور جس کو سر ولیم میور نے قابل اعتراض انداز اور خراب صورت میں پیش کیا ہے، قرآن مجید میں صاف اور سادہ طریقہ سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ "جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا ایمان لے آنے کے بعد، سوائے اس آدمی کے جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل، ایمان پر مطمئن ہو، اور جس نے کفر سے اپنے دل کو مطمئن کر لیا، تو ان پر خدا کا غصہ ہے، اور ان پر بڑا عذاب ہے (نحل ۱۰۸) اس آیت پر فقہا نے غور کیا ہے اور دو صورتیں بیان کی ہیں، اول عزیمت کی، یعنی آدمی اہل کفر کی طرف سے اذیتوں، تکلیفوں اور قتل کے خوف کے باوجود ظاہر میں بھی اسی سچ پر قائم رہے، جس پر وہ ایمان رکھتا ہے، دوم رخصت کی صورت یعنی ایسی صورت میں اس کو یہ اجازت ہے کہ اس ایمان کا انکار کر دے جس کی تصدیق اس کے دل میں موجود ہے، اور اس طرح وہ دشمنوں کی ایذا سے اپنے آپ کو بچا لے، یہ عجیب بات ہے کہ اس صاف اور سیدھی بات سے سر ولیم میور نے وہ "مقدس جھوٹ" ثابت کرنا چاہا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا، پھر انھوں نے اپنے مقصد اور مفہوم کے لیے یہ چند الفاظ "کسی کی جان بچانے کے لیے" کافی سمجھے، جو گمراہ کن ہیں، جب کہ قرآن میں بھی جو اپنی فصاحت اور اختصار میں بے مثل ہے، اس مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ایک پوری آیت درکار ہوتی ہے۔ (خطبات: ۴۰۷)

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور جس روایت سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے، اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے لیے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے، گو وہ کلمات جھوٹ ہوں"۔ مگر سرسید کے نزدیک:

"یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے، اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے

جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے، ہم بجنسہ اس کو درج کرتے ہیں، اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ام کلثوم رضی نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو آدمیوں کے درمیان صلح کرا دے، پس بھلی بات کہدے اور بھلائی پہونچا دے۔"

قاضی بیضاوی نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ "وہ اس کے پاس ایسی باتیں پہونچا دے جن کو سن کر وہ مان جائے اور اپنا شر کی باتوں کو چھوڑ دے۔"

سر ولیم میور کی عربی دانی کا خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ خود اصل حدیث پر غور کرتے، اور خود اس کا صحیح ترجمہ کرتے، انھوں نے کپتان ای۔ این میتھیو کے غلط ترجمۂ مشکوٰۃ کو اختیار کیا، اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ "گو وہ کلمات دروغ ہوں" اپنے ترجمے میں بڑھا دیئے، جبکہ وہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں،

"ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا لفظ بولتے ہیں، اس لیے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذّابوں میں نہیں، یعنی جو سزا ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے، اس سزا کا مستحق یہ آدمی نہ ہوگا جس نے صلح کی غرض سے صرف اچھی باتوں کا تذکرہ کیا ہو۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۰۸)

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ ہے کسی عورت کو ترغیب دینے میں یا سفر یا مہم میں، کسی عورت کو ترغیب دینے کے الفاظ بھی سخت گمراہ کن ہیں، جب کہ سر ولیم میور کی مراد "اپنی بیوی کو ترغیب دینے" اور اس کی دلداری کرنے سے ہے۔ وہ لکھتے

ہیں کہ تیسرے موقع کے لیے "ہمارے پاس ایک افسوسناک نظیر موجود ہے کہ محمد صاحبؐ نے ماریہ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی (دوسری) ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے کو معیوب نہ سمجھا"۔ اور چوتھے موقع کی مثال یہ دی ہے کہ پیغمبرؐ صاحب کا معمول تھا کہ "ترتیب مہمات کے وقت (تبوک کی مہم کو مستثنیٰ کر کے) اپنے اصل مدعا کو پوشیدہ رکھتے تھے، اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے"۔ سر سید نے ان دونوں موقعوں کی جو وضاحت کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے، وہ محض غلط ہے، کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں ہے، اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا، اور چونکہ بنیاد کے استحکام و ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے، پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو، کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو نام کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے، لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے اعلان جنگ نہ ہو جائے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکہ ہو، بلاشبہ اخلاق اور صداقت کے خلاف ہے، لیکن جب جنگ کا اعلان اور اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو، اور اس سے اپنے عزائم اور جنگی منصوبوں کو مخفی رکھنا صداقت کے خلاف نہیں ہے"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۴۰۹)

اسلامی روایات میں "مقدس جھوٹ" کی جستجو کے لیے سر ولیم میور نے جو جانفشانی کی ہے، سر سید احمد خان اسکی [illegible] بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے، مذہب اسلام پر عائد کرنا چاہتے ہیں، مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا، کیونکہ صدق حقیقی قرآن کا لب لباب اور جوہر ہے، اور سچائی اس کی ہر سطر میں نمایاں ہے"۔

جبکہ "مقدس جھوٹ" کا تصور قرآنی سچائی کے برخلاف ایک دوسری چیز ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جیساکہ تاریخ میں ہے، صاف صاف ثابت ہوتا ہے، ارکان مذہبی میں ایک رکن "مقدس جھوٹ" بھی تھا اور ہم کو تعجب ہے کہ مقدس پال حواری اس کو گناہ تو کیا سمجھتا، برائی نہیں جانتا تھا، اس بات کو عیسائی عالموں نے خود مقدس پال کے اس کلام سے ثابت کیا ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لیے میں گنہگار گنا جاتا ہوں" (پال کا خط رومیوں کو، باب ۳ درس ۷) سرسید تاریخی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا جو عیسائیوں میں رائج تھا، ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ "کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ" نامی کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "کلیسا کا شہرت یافتہ اور راست باز فرزند موشیم جس کی سند اور تسلیم شدہ سچائی پر پادریوں نے کبھی نہیں شبہہ کیا، وہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ پیروان افلاطون و فیثاغورث کا یہ اصول تھا کہ صدق و پرہیزگاری کی صفات کو ترقی دینے کی غرض سے دھوکہ دینا یا بوقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن ہے، حضرت عیسیٰؑ سے بہت پہلے ہی مصر کے یہودی پیروان افلاطون و فیثاغورث سے یہ اصول سیکھ چکے تھے جیساکہ بے شمار تحریروں سے کسی حجت اور اعتراض کے بغیر یہ بات ثابت ہو چکی ہے، عیسائیوں میں یہ غلطی دونوں راستوں سے در انداز ہوئی، چنانچہ ان کے یہاں نامی گرامی اشخاص کی طرف بے شمار کتابوں کو غلط طور پر منسوب کیے جانے سے یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی، موشیم کے بیان کے مطابق صرف دوسری صدی ہی میں بے شمار انجیلیں اور خطوط گڑھے گیے، اور دوسروں کی طرف غلط طریقہ سے منسوب کر دیے گیے، چوتھی صدی میں دینی مقاصد کی ترقی کے لیے دھوکہ اور مقدس جھوٹ پچھلے زمانوں سے بھی بڑھ گیا تھا، گسوبن نے یہ لکھا ہے کہ "دین عیسویؑ کے ابتدائی زمانہ میں مجھے یہ معلوم کرکے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی میں اپنی طرف سے باتیں ملا دینے کو ناموری سمجھتے تھے، صرف اس لیے کہ ان کے نئے عقیدوں کو عقلاء کفار (غیر مسیحی فضلاء) گوش دل سے سنیں گے، (کرسچین میتھالوجی ان فیلڈ، ص ۸۲-۸۰)

اسی کتاب میں یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ معلوم ہوتا کہ انجیل کی کوئی بات دین داروں یا ملکی حاکموں کے اغراض کے موافق نہیں ہے تو اس میں ضروری تبدیلیاں اور تحریفات کر لی جاتیں، اس کے علاوہ طرح طرح کے اور مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں جو رائج تھیں، ان کو بہت سے پادریوں نے جائز قرار دیا تھا، (ایضاً ص ۵۲) اسی کتاب میں یہ بھی صراحت

کی گئی ہے کہ "اول کی تین[۳] صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں، اور جو کچھ علم ہے وہ نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ ان روایتوں اور حکایتوں کے بیان کرنے والے جو اس زمانہ میں گذرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں، یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں، مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ ان سے بھی سبقت لے گیا، وہ خود فخریہ بیان کرتا ہے کہ "جس بات سے ہمارے دین کی عظمت اور نام آوری بڑھتی ہیں نے بیان کر دیا ہے، اور جو اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو، میں نے سب چھوڑ دیا ہے (ایضاً: ص ۴۶) مندرجہ بالا مثالوں کو نقل کرنے کے بعد سرسید نے مقدس جھوٹ کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

"دور اول کے عیسائی مورخین) کی تحریروں میں ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے، عیسائی خواہش اور خوف ایمانی کے درمیان غلبہ حاصل کرنے کی مضحکہ خیز کوششیں ..... اور انجیل کی بے شرمانہ تحریفات اور تصرفات کی مدد سے کلیسائے روم نے عجیب و غریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر پھیلا دیا تھا، جس نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا، انھوں نے اس مقولہ کی تلقین کی جو موشیم کے الفاظ میں یہ ہے کہ "دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں، کار ثواب ہے" کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس بے قیدا صول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمے کا دہانہ کھول دیا جس کا پانی ابتداً دین عیسوی کی سرزمین پر طوفان کی طرح چھا گیا، اور جس نے ان فریبوں اور باطنی صفات کو رواج دیا، جو اس زمانہ میں عیسائیان رومن کیتھولک کی بدنامی کا سبب ہیں، (دور اول کے یہ عیسائی مورخین) اور اول سے آخر تک ان کے سوانح نگار کفر آمیز منگی، عقیدہ میں خوش فہمی، تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے، لیکن اس کے باوجود پطرس حواری کے جانشینوں نے ایسے لوگوں کو پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں جگہ دی ہے،

سر ولیم میور کے لیے یہ مناسب تھا کہ مذکورہ بالا حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے اسلام پر مقدس جھوٹ کا الزام لگانے کی بجائے جائزہ لیتے کہ [illegible] وہ نہایت

درجہ کی سچائی اور راستبازی کا دین ہے اور اسی حیثیت سے اس کو یہ حق ہے کہ دوسرے دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے، اپنی فوقیت اور برتری کے لیے دعویدار ہو۔"

(خطبات احمدیہ، ص ۴۱۴)

اختلاف قراءت قرآن اور بائبل میں

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، جس طرح آسان ہو پڑھو" اختلاف قرأت، فن تجوید قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے سمجھنے میں عیسائی مصنفوں کو سخت دھوکہ ہوا، اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں) میں اختلاف قرات ہے، اسی طرح قرآن مجید میں بھی اختلاف قرات ہے، حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف ہیں، اور جو اسباب عہد عتیق اور عہد جدید میں مختلف قرأتوں کے پیش آتے ہیں، ان میں اور قرآن مجید کی قرارت سبعہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اگر ہم قرآن مجید کی قرأت سبعہ یا اختلاف قرأت کو ان ہی معنوں میں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے، تو یہ بات واضح طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اس قسم کا اختلاف قرات سرے سے پایا ہی نہیں جاتا، مسلمانوں میں اختلاف قرارت کی تمام صورتیں صحیح اور درست ہیں، لیکن بائبل کے اختلاف قراءت کی نوعیت بقول ریورنڈ مسٹر ہارن یہ ہے کہ دو یا زائد مختلف قرأتوں میں سے صرف ایک ہی قرارت صحیح ہوسکتی ہے، اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی۔" وہ عہد عتیق اور عہد جدید میں اختلاف قرأت کے درج ذیل اسباب بیان کرتے ہیں:

(۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) جن نسخوں سے نقل کیا گیا ہے ان میں پہلے سے سقم اور غلطیوں کا پایا جانا (۳) کسی معتبر سند کے بغیر کاتبوں کی طرف سے متن کی عبارت میں اصلاح کی خواہش (۴) وہ تحریفات جو کسی فرقہ کے حصول مدعا کے لیے قصداً کی گئی ہوں۔

بائبل میں اختلاف قراءت کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بھی قرآن کے اختلاف قرارت کی اصطلاح سے تعلق نہیں رکھتی، قرآن مجید میں اختلاف قرأت کی ایک صورت جو دور اول میں پائی گئی تھی وہ یہ تھی کہ لوگوں نے جتنا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، مختلف سورتیں یا آیتیں وہ اپنی بیاضوں

میں چمڑوں کے ٹکڑوں پر یا اور دوسری چیزوں پر بغیر کسی ترتیب کے لکھ لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ قرآن کی تلاوت کا رواج تھا، تراویح میں پورا قرآن پڑھا جاتا، قرآن کے حافظ موجود تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں کی ترتیب طے شدہ تھی، اس لیے حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں تمام صحابہ کی رائے سے حافظوں اور دوسری چیزوں کی مدد سے، حضرت زیدؓ بن ثابت کی نگرانی میں قرآن کو ایک جلد میں مرتب کر لیا گیا، اس لیے نامکمل بیاضوں کی وجہ سے جن میں ادھر ادھر بے ترتیب آیتیں لکھی ہوئی تھیں، قرآن کی سورتوں اور آیتوں میں ناواقفیت کی بنا پر اب بے ترتیبی کا امکان ختم ہو گیا، اور جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں زیدؓ بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تو اختلاف قرارت کی مذکورۂ بالا کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہ گیا،

دنیا کی ہر ایک زبان کی طرح عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی بعض لفظوں کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا تھا، قرآن کریم کی سات قراءتوں کا مطلب یہ ہے کہ ایسے الفاظ کو مختلف قبیلے اپنے اپنے تلفظ کے مطابق پڑھ سکتے ہیں، لیکن جہاں تک قرآن مجید کی کتابت کا تعلق ہے، تحریر کی حد تک الفاظ قرآن کے تلفظ کا یہ اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہو گیا ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں کہ :

"قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کامیابی ہوئی ہے، قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھا کرتے تھے، لیکن چونکہ عربی زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ دوسرے قبیلوں سے ادا نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اس اختلاف سے بالکل بچیا نہیں چھوٹا، مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے اگرچہ یہ اختلاف صرف قرآن مجید پڑھنے میں محسوس ہو گا نہ کہ اس کی املا میں، اور اسی لیے وہ اختلاف تحریر میں نہیں آسکتا، اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۴۳۵)

حاضر و غائب کے صیغوں یا اعراب و الواب کا اختلاف ... وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

منقول ہے، اور وہ چند ہی جگہوں میں ہے جس سے قرآن مجید کے اصلی مطلب یا احکام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑتا، اور قرآن مجید کے حاشیوں میں ان کو بھی ذکر کیا گیا ہے، اور تفسیروں میں ان پر پوری بحث موجود ہے، اس لیے:

> جیساکہ ہم بیان کر چکے ہیں، ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد پر کچھ اثر نہیں پڑتا، اور جو الزام عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے، اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کم بیش کرنے کا یا آیتوں کو چھپا ڈالنے کا عائد نہیں ہوسکتا، علم ادب کی یہ شاخ جو قرآن مجید کی عمدہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، اور جس کا نام علم تجوید ہے، اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور علماء نے شرح و بسط سے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔" (ایضاً، ص ۱۲۶)

ناسخ و منسوخ کے بارے میں حالات اور موقع و محل کی مناسبت سے احکام شریعت میں تبدیلی انبیائے کرام کے ذریعہ بحکم خداوندی ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہے، اس تبدیلی کو نسخ کہتے ہیں، حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ کہا جاتا ہے، فقہائے اسلام کے یہاں ناسخ و منسوخ کے مفہوم میں مزید وسعت پیدا کر دی گئی، مثلاً انھوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے، اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثنا، پایا جاتا تھا، تو انھوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا، حالانکہ یہ صرف فرضی اصطلاح ہے، اور بقول سرسید احمد خان فقہا نے یہ رائے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقوں کو آسان بنانے کے لیے اختیار کی ہے، مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے، لازم نہیں آتی،

قرآن مجید کی آیت نسخ اور فقہاء کی اصطلاح ناسخ و منسوخ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عیسائی عالموں نے دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے، اور ان کو صریح مغالطہ ہوا ہے، جس کا اندازہ درج ذیل جملوں سے ہوتا ہے:

"مرضیِ الٰہی کے دائمی اور کامل اندازے کے بجائے قرآنی آیات محمدؐ کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں، ہر وحی ان کی حکمتِ عملی یا خواہش کے مناسب ہے، اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول کے ذریعہ رفع ہو گیا کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیلی یا ترمیم ہو گئی ہے" (گبن)

"اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے، مگر مسلمان اس اجتماع ضدین میں تطبیق کی تا بہ امکان کوشش کرتے ہیں، تاہم مجبوراً ان کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ کم سے کم دو سو چھیس[۲۲] آیتیں منسوخ ہیں۔" (سر ولیم میور)

سرسید احمد خاں ناسخ و منسوخ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عیسائی عالموں نے ان لفظوں کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا، بیکار کر دیا ہے، مگر ان کا یہ خیال غلط ہے، مسلمانوں میں تو اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے، کہ خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے، یعنی اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم ہے اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ کے پہلے حکم میں کوئی نقص تھا جو بعد کو ظاہر ہوا اور پھر دوسرا حکم دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے کمالِ علمی میں نقص تھا، اور ایسا عقیدہ اسلام کی روح کے خلاف ہے اس لیے مسلمانوں میں ناسخ و منسوخ کا مطلب وہ نہیں ہے جو عیسائی علماء سمجھتے ہیں،

ناسخ و منسوخ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تبدیلی کی گئی، جس کی مثالیں بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا، لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور دوسری سے نکاح کر لے، اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی بیوی کو سوائے زنا کے طلاق نہیں دے سکتا، جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا، لیکن یہ قید لگائی کہ اگر کسی شدید ضرورت اور معقول وجہ کے بغیر طلاق دے گا تو خدا

ایک گناہ کا مرتکب ہوگا، ناسخ و منسوخ کی اس تشریح کی روشنی میں قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی، البتہ پہلی شریعتیں منسوخ ہوئیں، مگر اس مفہوم میں نہیں جو عیسائیوں کے یہاں جانا جاتا ہے، یعنی خدا کے علم میں تغیر یا نقص واقع نہیں ہوا، بلکہ نئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے نیا حکم دیا، اور پچھلی شریعت خدا کے علم میں پہلے زمانہ ہی کے لیے تھی، قرآن مجید کی آیت (مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ ...... مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا .... قَدِيْرٌ۔ بقرہ: آیت ۹۹ - ۱۰۰) سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس میں صاف طور پر اہل کتاب کا ذکر ہے، جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی و بیشی ہوگئی ہے۔ ان کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ہم جس آیت یعنی اہل کتاب کی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند بھیج دیتے ہیں،

ناسخ و منسوخ کے دوسرے معنی ایک فقہی اصطلاح کے طور پر ہیں، اور فقہاء کی اس اصطلاح کا اطلاق قرآن و حدیث پر بھی ہوتا ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں، جن کا تعلق ایک ہی معاملہ سے ہے، مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں، جب وہ حالت باقی نہیں رہتی تو اس حکم کی تعمیل واجب نہیں رہتی، اور دوسرا حکم جو تبدیل شدہ حالت کے مطابق ہو، نافذ ہوتا ہے، اگرچہ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ کہیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلی حالت پھر واپس آجائے تو اس کا حکم بھی دوبارہ نافذ کرنا ہوگا، نہ کہ دوسرا حکم، مثلاً جب شراب کی ممانعت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کو بھی جن کا خاص طور پر عربوں میں رواج تھا، ممنوع قرار دیا، مگر جب یہ حکم سب لوگوں کو معلوم ہوگیا، اور شراب پینے کا رواج ختم ہوگیا تو آپ نے ان پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی، اسی طرح جب مکہ میں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان محکوم تھے، تو مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب یہ مسلمان دوسرے ملک چلے گئے، تو اس وقت جہاد کے احکام دیے گئے، ان دونوں مثالوں میں پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہیں گے، یہ فقہاء کی اصطلاح ہے، لیکن اگر پہلے والے حالات

دو بارہ پیش آئیں تو وہ حکم بھی دو بارہ نافذ ہو جائے گا۔ جیسے فقہاء نے منسوخ کہا ہے، اور ناسخ پر عمل درآمد نہ ہوگا،

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحات ہیں، جو علماء نے مقرر کی ہیں۔ محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کے الفاظ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت استعمال نہیں کیے گئے۔ عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو سنا کہ قرآن مجید میں جھگڑا کرتے ہیں، تو فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا، (رد کیا) خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو، پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو، اس میں سے جو جانتے ہو کہو، اور جو نہ جانتے ہو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔ (مسند احمد وابن ماجہ) (خطبات احمدیہ: ص ۴۲۴-۴۲۳)

سر ولیم میور نے یہ جو لکھا ہے کہ "قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں" یہ محض بے بنیاد خیال ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ نزول قرآن کے دور اول میں کچھ لوگوں نے اپنی غلطی سے قرآن و حدیث میں تمیز نہ کی ہے، بہت سی حدیثوں کو غلطی سے قرآن کا جزء سمجھ لیا ہو، اور قرآن مجید میں وہ حصہ نہ پاکر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہو گئی ہیں، اور قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں، مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جن کو ہوا، خود اس کی غلطی ہے۔ (ایضاً: ص ۴۲۷)

سر ولیم میور نے آیتوں کے منسوخ ہونے کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے، وہ قواعد اسلام کی رو سے درست نہیں ہے، اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے۔ مثلاً ان کا بیان ہے کہ اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مقصد کے لیے تھا، جو عارضی حالات کی وجہ سے سامنے آیا، اور جن کی منسوخی ہمیشہ کے لیے بحال رہی، یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر صاحبؐ کے نزدیک اس قسم کی آیتوں سے ان کی عام نقلیت یا ان کو رائج کرنا مقصود تھا یا نہیں، قرینہ سے تو یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان حصوں کی حفاظت کی انھوں نے کوشش کی ہو۔"

سر ولیم کسی دلیل یا شہادت کے بغیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ ایسے حصے بھی شامل ہو گئے

ہیں، جن کی حیثیت عارضی تھی، یعنی وہ منسوخ ہو چکے ہیں، لیکن بقول سرسید احمد خاں، یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنیٰ نہ سمجھنے کے سبب یا غلط معنیٰ سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنیٰ عیسائی مصنف سمجھتے ہیں، ان معنوں میں قرآن مجید کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے، اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جائیں جس میں مسلمان فقہاء نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے، تب بھی کوئی آیت (عارضی مدت یا) محدود مقصد کے لیے قرآن مجید میں موجود نہ تھی، اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۶۹)

قرآن مجید اور حضرت عثمانؓ

مسٹر گاڈفری ہیگنز عموماً قرآن، اسلام اور سیرت رسولؐ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، مگر وہ اپنے اچھے خیالات کے باوجود ایک جگہ قرآن کے بلند اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ "یہ امر اس کے (یعنی قرآن مجید کے) مصنف کی لازوال نیک نامی کا سبب ہے، خواہ وہ محمدؐ عرب کے نامی پیغمبر ہوں، یا اس کے تیسرے خلیفہ عثمانؓ۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۶۳) یہ ایک ایسی رائے ہے جو قرآن کے بارے میں دانستہ طور پر غلط بیانی کہی جا سکتی ہے، اور غلط فہمی پھیلانے کے لیے لکھی گئی ہے، قرآن کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے، اور تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے۔ حضرت عثمانؓ کے پاس تلاوت کے لیے جو قرآن تھا وہ وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے اتارا گیا، اور جسے تمام صحابۂ رسولؐ کے اتفاق سے اور ان کی نگرانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق اسی ترتیب کے مطابق جو مسلمانوں میں پہلے سے معروف تھے، اور جس کو قرآن کے حافظ اپنے سینوں میں اسی کے مطابق پاتے تھے، ایک جلد میں اکٹھا کیا گیا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے اس کی نقلیں دنیائے اسلام میں بھجوا دی تھیں، اس لیے گاڈفری ہیگنز کا یہ الزام غلط بیانی کی ایک بڑی افسوسناک مثال ہے، پیغمبرؐ صاحب قرآن کے مصنف نہ تھے، مسیحی علماء قرآن کی الہامی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، مگر جو ان میں اہل انصاف ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو تورات و انجیل کا ہے، اور قرآن کی زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی زبان میں جو فرق ہے، قرآن کا جو دعویٰ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چالیس برس تک اس کے علوم و معارف سے

ناواقف رہنا، آپؐ کا امی ہونا، قرآن کی فصاحت، اس کا اسلوب بیان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا انداز تخاطب، یہ تمام باتیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرآن اپنے لفظ و معنی دونوں میں خدا کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ہے، مگر تعصب اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔ (خطبات: ص ۲۱-۲۴ وغیرہ)

قرآن کی فصاحت اور صحیفۂ ایوبؑ، گبن کا اعتراض

گبن نے اپنی تاریخ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ "قرآن کے بلند ترین خیالات صحیفۂ ایوبؑ شاندار سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں"۔ لیکن سرسید احمد خاں کے بقول گبن میں اس قدر علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیفۂ ایوبؑ کا باہمی فرق بتا سکیں:

> "ہم کسی اعتراض کا اندیشہ کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت میں بے مثل قرار دیا ہے، اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے فائق نہیں، نہ پہلے اور نہ اس کے بعد، لبید جیسا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور اس کی بلاغت کو انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا، مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ "سب سے اول اور سب سے آخر جو بھی خوبیاں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں" وہ ہر قسم کے اچھے اوصاف کا بانی ہے، بلکہ درا صل ہر قسم کے وصف اور خوبی کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے"۔ (ایضاً: ص ۲۶۲)

سرسید نے مسٹر سیل کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ "یہ بات مسلم ہے کہ قرآن، قریش کی زبان میں جو اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے، نہایت لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے، وہ بے شبہہ عربی زبان کا نمونہ ہے، اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا وہ لازوال معجزہ ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے، اور تمام دنیا کو اپنے بارے میں رب کی طرف سے ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے، اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان لائق لوگوں نے تعریف کی جن کا اس کام میں مبصر ہونا تسلیم کیا جاتا ہے جس کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ لبید بن ربیعہ کا ایک

قصیدہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں تھا، خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا، (جو عربوں میں کسی اعلیٰ تصنیفی کارنامہ کے لیے ایک بڑی عزت کی بات تھی) کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیف کو پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن چند دنوں کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی چند آیتیں کسی نے اس کے مقابلہ میں لگا دیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکوں میں تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور فوراً مذہب اسلام کو قبول کر لیا، اور اس نے یہ بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ (خطبات: ص ۵-۴۶۴)

قرآن مجید کے ساتھ ناشائستہ طرز عمل یورپ کی زبانوں میں عیسائیوں نے قرآن مجید کے جو ترجمے کیے، ڈاکٹر ہیگنز کا تبصرہ ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ: "اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح شایع ہوتا کہ ہر لفظ کو متین اور شائستہ معنی کے بجائے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت کا مضمون، جوڑ توڑ ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف کے سر معیوب معنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور کیا جا سکتا ہے، جس کے ساتھ یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی۔" (ایضاً: ص ۴۶۶)

مگر اسی کے ساتھ سرسید احمد خاں چند عیسائی مصنفوں خصوصاً مسٹر سیل کے ممنون ہیں جنھوں نے بڑی کوشش سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور اگرچہ وہ کہیں کہیں صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم ان کی کوشش قابل قدر ہے۔

بے سروپا حکایات ان عیسائی عالموں اور مستشرقوں نے عجیب عجیب خیالات جن کی کچھ بنا نہیں، قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں، چنانچہ ہمفری پریڈو ڈین آف نارورچ نے لکھا ہے کہ:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو سکھاتے تھے کہ اس کتاب کا اصلی نسخہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے، اور جبرئیل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں حسب موقع شایع کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، لایا کرتے ہیں۔"

لیکن بقول سرسید" یہ بیان ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے، جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گذرتا ہے تو وہ حیرت اور تعجب میں پڑجاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیونکر لکھا گیا" مشہور مورخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے، جو لکھتے ہیں کہ" وجود قرآن بقول آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے، اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے، اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پر لے آئے تھے" لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں" لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے، جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا" ڈین پریڈیڈو کی دلچسپ اور انوکھی باتیں جو بقول سرسید کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں، وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہیں، ان کا بیان ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی، اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوق رسالت تھا، اور ابوبکرؓ نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اول اس کو جمع کیا، کیونکہ جب مسیلمہ نے ان ہی کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں، اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے پیرؤوں میں شایع کی، اس وقت ابوبکرؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا"۔ مگر جیسا کہ سرسید نے تحریر کیا ہے کہ:

"(مذکورہ بالا) یہ چند مثالیں ان سیکڑوں بیہودہ باتوں میں سے ہیں جو عیسائی مصنفوں کی تمام تحریروں میں اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں، سر ولیم میور نے اپنے استدلالوں میں مسلمانوں کی مذہبی باتوں سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھوں نے بحث کے لیے صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں، یا ان کے مطلب اور مقصد کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔۔۔۔ سر ولیم اپنی کتاب کے حاشیہ میں مارکس ڈرلیس

سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "عبداللہ بن مسعودؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا، اور صبح کو اسے کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کے بارے میں پیغمبرؐ صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اُڑ گئی، اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزانی مضمون اور بڑھا دیا گیا کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا" ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا نام بھی معلوم نہیں گردشی کے کبوتر کی طرح بے بنیاد اور صریح ایجاد ہے، اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ "اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے، اور وہ بے شبہ ایک بناوٹ ہے"۔

(خطبات احمدیہ: ص ۴۶۸-۴۷۰)

سر ولیم میور کی "وحی کامل" سر ولیم میور نے ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" کی مسلمانوں کے مذہب میں استعمال کی ہے، اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے مطابق ہے، اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "وحی کامل سے میری مراد اس وحی سے ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخیر زمانہ میں موجود اور رواج پائی ہوئی تھی، جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو، لیکن سرسید فرماتے ہیں کہ:

"اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، شاید آیات محکم کا ترجمہ سر ولیم میور نے وحی کامل کیا ہو، لیکن آیات محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے کیے ہیں، لیکن اگر ہم ان کی اس اصطلاح کو تسلیم کریں، تو وحی کامل کا لفظ وحی کی اس کامل مقدار پر بولا جائے گا جو جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضایع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی"۔

(خطبات احمدیہ: ص ۴۷۰)

قرآنی آیتوں میں ربط اور ترتیب قرآن مجید کی ترتیب کے بارے میں سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ "قرآن جس طرح ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے، اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے، اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو ہمیشہ اسی تسلسل

کے ساتھ پڑھنے کے لیے فرمایا ہو، مضامین کی ابتر ملاوٹ، زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی، کسی جزء کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس آیت سے پہلے درج ہونا جو اس سے کافی عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھی، کسی حکم کا ایسے حکم کے بعد ہونا جس کی اس پہلے حکم سے تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو، یا کسی دلیل کا کسی ایسے درمیانی فقرہ کی وجہ سے منقطع ہو جانا جو اپنے مقصد اور مدعا میں اس سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی اور کامل ترتیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں مستعمل اور رائج تھی۔" سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کے کلام میں بے ربطی کے باوجود آیات قرآنی کی ترتیب اور ان کے درمیان باہمی ربط پر درج ذیل لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے:

"ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید ہے ایسی باقاعدہ ہے اور معنوی اعتبار سے اپنی طرز خاص میں اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے، بہت سی کتابیں آیتوں کے درمیان اس معنوی رشتہ و تعلق کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے درمیان موجود ہے، قرآن مجید کی عبارت میں ایسا ایجاز اور اختصار ہے کہ دو آیتوں کے باہمی تعلق کی جن کے معنی نظراً ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں، کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں گونجنے والی اور سامعہ خراش، ابتر، خام، بے ہودہ، مکرر بیانی، طول کلامی، الجھانے والی، خام اور مہمل" جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، معلوم ہوتی ہیں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ خدا کا کلام ہے، اور بجنسہ وہی الفاظ لکھ لیے گیے ہیں، کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے، تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف قصداً رکھتا ہے، مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے، وہ ایسا نہیں کرتا، عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے، اور نہ آیتوں کی شان نزول ان کے ذہن میں ہوتی ہے، اس لیے وہ کہہ

آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے اگر مسلمانوں کو ایسی دشواری نہیں ہوتی۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۴۷۱)

اس موقع پر سرسید افسوس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں، اگر وہ چند مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جا بجا بے ربطی ہو تو اس وقت ہم یقیناً موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیتوں کے درمیان باہمی علاقہ کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ (ایضاً: ص ۴۷۲)

تدوین قرآن | ترتیب قرآن تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق پہلے سے معلوم اور مشہور تھی۔ صحابۂ کرامؓ میں جو لوگ حافظ قرآن تھے ان کے سینوں میں قرآن مجید اسی ترتیب سے محفوظ تھا جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، پھر صحابۂ کرامؓ کے اجماع و اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نسخہ تیار کر لیا گیا، جس کی مختلف نقلیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام عالم میں تقسیم کروا دیں، سر ولیم میور نے قرآن مجید کی ترتیب، اس کی تدوین اور پھر اس کی نقلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کارروائیوں کو اپنی جا بلکہ سے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جن سے ان کے اعتراض و مقاصد بے نقاب ہو جاتے ہیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

"اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی، حفصہؓ کے گھر میں دستیاب ہوئی، اور غور و فکر کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی، اگر زید اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی، اس وجہ سے کہ وہ محاورۂ قریش سے واقف تھے، اور اس نئے مجموعہ کو اس طرح مکی زبان سے تطبیق دی جس میں کہ پیغمبرؐ صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔" (سر ولیم میور۔ خطبات احمدیہ: ص ۴۷۳)

سر سید احمد خاں نے مذکورۂ بالا اعتراض کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماخذ دریافت کرنے میں ہم نہایت حیرت زدہ ہیں، مسلمانوں

ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے۔ سر ولیم میور کے اعتراض میں یہ واضح طور پر قابل اعتراض ہیں، "نظر ثانی"، "اس طرح سے تطبیق دی"، اور "نیا مجموعہ"، کسی بھی قسم کی روایت سے ہم کو اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ زید بن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید میں کبھی نظر ثانی ہوئی ہو۔ حدیث میں اس کا تذکرہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: "نسخوها فی المصاحف" یعنی اس کی چند نقلیں انھوں نے کرلیں، مگر اس روایت میں کسی مخصوص نظر ثانی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، اس روایت میں یہ عبارت بھی ہے کہ "اذا اختلفتم انتم وزید بن ثابت فی شیء من القرآن" یعنی جب تم میں اور زید بن ثابت میں قرآن مجید کی کسی چیز میں اختلاف ہوجائے، یہاں لفظ اختلاف سے کئی مفہوم پیدا ہو سکتے تھے، لیکن روایت کے آئندہ لفظوں نے اسکی تعیین کردی ہے، چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فاکتبوہ بلسان قریش" یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لیے روایت میں لفظ اختلاف سے اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ مراد نہ تھی، بخاری کی روایت میں اس مراد کو اور زیادہ واضح کردیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ: "فی عربیة من عربیة القرآن" یعنی قرآن کے کسی لفظ کی ہیئت میں اختلاف ہو، اور جو تلفظ مد، ادغام اور نون تنوین سے متعلق باتیں ہیں جو عرب کے مختلف قبیلوں میں رائج ہیں، سر ولیم میور کا یہ جملہ کہ: "اور اس طرح سے مکی زبان سے تطبیق کردی" یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جامعین قرآن میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے پچھلی تحریریں میں کچھ تبدیلیاں کردیں، حالانکہ حدیث سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، جامعین سے اگرچہ یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم میں کچھ اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو، لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان میں در اصل کوئی اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ "انھوں نے مکی زبان سے تبدیل کردی" صحیح نہیں ہے۔

سر ولیم میور کی طرف سے "نیا مجموعہ" کا لفظ بھی محض غلط ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے عربی کے سات مختلف لہجوں میں نازل ہوا تھا، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس قسم کے خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں، تاکہ ایک ہی آیت قرآنی میں لفظوں میں اختلاف کی دقت رفع ہوجائے۔ بقول سر سید:

"یہ (مذکورۂ بالا) عبارت ایک ایسے طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، صاف باطنی اور راست بازی کے لیے ممتاز ہوں، دغا، فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا صحیح دلیل و برہان کے معینہ قوانین اور اخلاق و تہذیب کے تسلیم شدہ اصول کے خلاف ہے، ہم اس بات کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں، اور اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں مگر وہ ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ، پھر کیا سر ولیم میور اس بات سے بھی ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مَد یا بغیر مد کے، ادغام یا بغیر ادغام کے اور تنوین نون کے ساتھ یا بغیر نون کے پڑھنے سے جو عرب کے مختلف قبیلوں میں مختلف طریقے سے رائج تھے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے، لیکن لفظ یا معنیٰ میں کچھ فرق نہیں ہوتا، یا کوئی لفظ اپنے اصلی مادہ میں تبدیلی کے بغیر مختلف صورتوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ فاتحہ میں مَالِكِ کا لفظ ہے، جو قدیم طرز تحریر میں ملك لکھا جاتا تھا، اور اسے مَلِكِ، مَلَّاكِ، مَالِكِ بھی پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ عرب میں مختلف قبیلوں میں اس لفظ کے تلفظ میں فرق تھا، اور اس کے باوجود اس لفظ کے مادہ یا معنیٰ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، لیکن قریش کی زبان میں مَالِكِ کا تلفظ جاری تھا اس کا قرآن مجید میں قائم رکھنا کیونکر اعتراض کا مستحق ہو گیا،

سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں دراصل ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنی تھی جن کے لیے انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے، وہ یہ ہے کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو، اور ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، اس بات کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے، جو قرآن مجید میں موجود ہے، خدا فرماتا ہے" إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (ہم نے قرآن مجید کو اتارا ہے، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے) (خطبات: ص ۴۷۶)

سر ولیم میور نے عہد عثمانی میں قرآن مجید کی نقلیں کیے جانے کے واقعہ کی یہ عجیب توجیہ کی ہے کہ "اگر ابوبکرؓ کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو اس قدر جلد وہ کیونکر خراب ہو جاتا کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہو گیا" لیکن سرسید کہتے ہیں کہ :

> "ہم نہایت صاف طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت پڑی، اور نہ ہی اس میں نظر ثانی کی گئی تھی، بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں" (خطبات احمدیہ : ص ۴۷۶)

تبدیلیٔ آیات | سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کے واسطے کہ پیغمبر صاحبؐ ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں، بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے" وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دو مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، جو واقدی کی بیان کردہ ہیں خود سر ولیم میور کے بیان کے مطابق "ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُبی بن کعبؓ کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے، اُبی کی قرأت میں شامل بعض آیتوں کو ہم چھوڑ دیا کرتے ہیں کیونکہ اُبی کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صاحبؐ کو یہ فرماتے سنا ہے، اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبر صاحبؐ نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں، مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے اُبی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں" ۔ سرسید نے اس روایت پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے :

> "جو کچھ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے سراسر خلاف ہے، اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو اُبیؓ کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے، اصل حدیث (بخاری کتاب التفسیر عن ابن عباسؓ) یہ ہے (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں اُبیؓ بڑے قاری ہیں، اور علیؓ بڑے قاضی ہیں، اور ہم لوگ اُبیؓ کا قول چھوڑ دیتے ہیں، بات یہ ہے کہ اُبیؓ کہتے ہیں کہ میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: "مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا"۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ بعض آیات قرآنی کو

جن کو اُبی پڑھا کرتے تھے، چھوڑ دیا کرتے تھے، یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات مستنبط کرنے سے متعلق ہے، اُبی قرآن مجید کی ہر آیت سے حکم کا استخراج کرتے تھے، اور جملہ احکام کو صحیح خیال کرتے تھے، ان کی رائے میں ظاہر آیات سے جو معنیٰ یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیات پر نظر رکھنا ضروری نہیں، جیسا کہ اہل ظواہر کا مسلک ہے، لیکن حضرت علی مرتضیٰ رضی کی رائے اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اس پر حضرت عمر رض نے کہا کہ اُبی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ہیں، اور حضرت علی رض ہم سب سے بڑے قاضی یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام و قوانین مستنبط کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُبی رض کے قول کو یعنی جو حکم انھوں نے قرآن سے نکالے ہیں چھوڑ دیتے ہیں، اور حضرت علی رض سے اتفاق کرتے ہیں، ہماری اس تشریح کی تصدیق، دوسری باتوں کے علاوہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بخاری رح نے جو مسلمانوں میں نہایت نامور، مقدس اور مستند محدثین میں سے ہیں، اس حدیث کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ احکام ناسخ و منسوخ سے بحث کی گئی ہے، نہ کہ اس جگہ جہاں کہ انھوں نے مختلف قراءتوں کو بیان کیا ہے، بخاری رح نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں قاریوں کے باہمی اختلاف کی بحث (باب القراء) میں بھی بیان کیا ہے، اور اس میں قرأت کے بجائے "لحن" کا لفظ ہے، جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ حضرت عمر رض نے حضرت علی رض کے لحن کو یعنی قرأت کے طریق کو اُبی رض کے لحن پر ترجیح دی، بہرحال سر ولیم میور نے یہ معنیٰ جو نکالے ہیں کہ "حضرت عمر رض نے کہا کہ ہم بعض آیتوں کو جو اُبی رض کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" یہ محض زبردستی کی ایک بات ہے، (روایت کے الفاظ میں اس معنیٰ کی کوئی گنجایش نہیں") (خطبات: ص ۸۰ - ۷۷۴)

سر ولیم میور، واقدی سے ایک اور روایت یہ نقل کرتے ہیں کہ "ابن عباس رض نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ رض بن مسعود کا پڑھنا پسند ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبریل ع سے پڑھوایا کرتے تھے، اور اپنی وفات کے سال اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا، اور عبداللہ رض بن مسعود دونوں مرتبہ حاضر تھے، اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوئی تھی اس کا مشاہدہ کیا تھا" مگر جیسا کہ سرسید احمد خاں نے صراحت کی ہے کہ

"اس روایت کے آخری ٹکڑے کی کوئی معتبر سند نہیں ہے، اور نہ ہی ہم اس کو کسی مستند اور معتبر حدیث میں پاتے ہیں، اور اگر واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو شک رہے گا، تب بھی وہ اعتبار کے لائق نہیں ہے، کیونکہ تمام نامعتبر اور بے سند روایتیں جو واقدی میں ہیں، کچھ زیادہ اعتبار کی مستحق نہیں ہیں، اور اگر ہم اتمام حجت کی غرض سے اس کی اصلیت تسلیم کر لیں تو بھی سر ولیم میور کا یہ قیاس کہ "قرآن مجید میں شاید" بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں، مگر بعد میں منسوخ ہو گئی ہوں، یا بدل دی گئی ہوں، (ایک ایسا قیاس جو "شاید" کے سہارے قائم ہے) کیونکر ثابت ہو سکتا ہے، باقی رہی یہ آیت کہ "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا" اس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ اس میں شریعت یہود کے منسوخ کیے جانے کا ذکر ہے، آیات قرآنی کے نسخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ (خطبات احمدیہ: ص ۴۸۱)

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیوں میں قرآن مجید سے بعض آیتوں کا اخراج یا بعض آیتوں کا اندراج نہ کیے جانے کے بارہ میں دو ایک اور روایتوں سے بھی استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "بیر معونہ پر ستر مسلمان شہید ہوئے تو محمد صاحبؐ نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں پیغام کے پہونچنے کا دعویٰ کیا، جس کو راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح نقل کیا ہے کہ "بلغوا قومنا عنا انا لقینا ربنا فرضی عنا و رضینا عنہ (واقدی) تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی"۔ لیکن سر سید کے نزدیک:

> " اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے، مزید برآں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ "تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے، اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی" محض بے بنیاد ہے، اور کسی مستند اور معتبر روایت میں پایا نہیں جاتا، اور اگر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھ لیا تھا، اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی"۔ (ص ۴۸۲)

دوسری روایت جو سر ولیم میور نے نقل کی ہے، احکام زنا سے متعلق ہے، اور اس میں اہل مدینہ سے گفتگو کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "... واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ یہ کہدیں گے کہ

عمرؓ نے ایک نئی بات قرآن میں درج کر دی تو میں قرآن میں یہ آیت درج کر دیتا، کیونکہ میں نے اس آیت کو پڑھا ہے کہ والشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ (واقدی) مذکورہ بالا روایت پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید نے یہ رائے دی ہے کہ: اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے غلط بیانی اور غلط نمائی ہے، اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ "والشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ" اصل حدیث میں نہیں ہے، اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے، کہ کبھی مسلمانوں نے اس کو قرآنی آیت سمجھا ہو، دوسرے اس فقرے کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ عرب تو کجا، کوئی عجمی ادنیٰ درجہ کا عربی داں بھی اس کو نہ کہے گا چہ جائے کہ وہ خدا کا کلام ہو ..... ہاں البتہ مسلم شریف (باب حد الزنا) میں اس قدر ضرور ہے کہ "فکان مما انزل اللّٰہ علیہ آیۃ الرجم" یعنی ان چیزوں میں سے جو اللّٰہ تعالیٰ نے نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم پر اتاریں رجم کا حکم تھا، اس حدیث کے ترجمہ میں آیت اور کتاب کے لفظ کا ترجمہ "حکم" کرنا چاہیے، اس بارے میں ہم بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں، کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں "حکم" کے معنی میں استعمال کیے گیے ہیں۔

سورۂ نساء کی آیت ۱۹ میں بیان کیا گیا ہے کہ "ان کو اپنے مکانوں سے باہر نہ جانے دو، یہاں تک کہ موت ان کو ٹھکانے لگائے، یا اللّٰہ تعالیٰ ان کے لیے کوئی سبیل نکال دے۔" اس آیت کے اخیر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے جو مسلم کی حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ شادی شدہ کو بجرم زنا سو درّے لگانا چاہیے، اور سنگسار کر دینا چاہیے، اور غیر شادی شدہ کو سو درّے لگانا اور ایک سال کے لیے جلا وطن کر دینا چاہیے، کچھ عجب نہیں کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھ لیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے حدیث مسلم کے مطابق سنگسار کرنے کی تھی، اور اس لیے جب وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا، اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو، مگر واقدی کا روایت کردہ ٹکڑا محض بے اصل ہے، اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام محققین مسلمان (ایسی روایتوں کو مہمل تصور کرتے ہیں، اور اسلام ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے،

خطبات احمدیہ ص ۴۸۰-۴۸۲)

اسی بحث کے سلسلہ میں سر ولیم میور تیسری روایت وہ بیان کرتے ہیں، جو سورۂ [illegible] کے بارہ میں تھی، اور جو قرآن میں درج ہونے سے رہ گئی، چوتھی مثال کے طور پر سر ولیم میور نے عبداللہ ابن مسعود کے اس قصّے کو پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک رات کو میں نے اپنے اوراق میں سے ایک آیت کو غائب پایا، پانچویں مثال میں وہ اس آیت کا ذکر کرتے ہیں جو مکہ کے معبودان مجازی کے بارہ میں تھی، لیکن ان مثالوں پر یہاں بحث کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ بقول سرسید احمد خان "ہم (سر ولیم میور کے) نہایت شکر گذار ہیں کہ انھوں نے خود یہ بات کہہ کر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں، اس جھگڑے کو چکا دیا ہے، پس ہم کو مغز مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی، (خطبات احمدیہ: ص ۹۲ - ۴۹۱)

خانہ کعبہ کی تاریخی حیثیت | سر ولیم میور اور بعض دوسرے مستشرقین نے خانہ کعبہ کی قدیم تاریخی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ بات تاریخی حقایق سے چشم پوشی کے مترادف ہے، قرآن مجید میں اگرچہ تعمیر کعبہ کے زمانہ کا تعین نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس میں کعبہ کی دو صفتوں کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے، "بیت العتیق" (نہایت پرانا اور قدیم گھر) اور "اَوَّلُ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ" (سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے خدا کی عبادت کرنے کے لیے بنایا گیا ہے) سرسید احمد خان کے نزدیک قرآن مجید کے مذکورۂ بالا بیان کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے، ان کے بقول :

"اس کے ثبوت کے لیے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں، اور جن کو ان لوگوں نے لکھا ہے جن کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا، ہم ایسے واقعات سے استدلال کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں، یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہیں، .... یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے ۱۲ بارہ بیٹے تھے، دوسرا بیٹا قیدار جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا، ریورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں، اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصّہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے، یہ بات بھی بخوبی ثابت ہے کہ یورنیس، بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں، گیڈری، گڈرونا

اور کدریتی سے قیداری اور قیدری مراد ہے، چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اوّل: ص ۲۴۸ میں کیا گیا ہے، پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھے، رورنڈ گاڑی پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶-۷ ۲ درجہ عرض شمالی، ۷ ۳-۸ ۳ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۹۷)

گبن نے کعبہ کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ "کعبہ کی قدامت صحیح طور پر سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے، ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تھمیوبت اور سیبین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے، جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام اہل عرب تسلیم کرتے تھے، اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کو تمام عرب تسلیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیم زمانہ (ابراہیمؑ کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیئے۔" (خطبات ص ۵۰۶) لیکن سر ولیم میور نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا، وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے ہے، کیونکر قیاس ہو سکتا ہے۔"

مگر سر سید احمد خان اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ:

"ہم سمجھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے، جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ملتا ہے، اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پہلے اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ اور وہ تمام مراسم جو کعبہ سے متعلق ہیں، ان کا ابراہیمؑ سے تعلق ہے اس کی اصلیت اور صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنو جرہم نے اور تمام عرب کی مختلف قوموں نے اس کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے منسوب کیا تھا، عرب ایک بت پرست قوم تھی، اور ابراہیمؑ بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا، اس لیے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے نفرت کرتیں، اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیمؑ و اسماعیل سے منسوب نہ کرتیں، باوجود اس مغایرت اور منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم

کرنا کہ کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے تعلق ہے، یہ بات واضح طور پر اور علانیہ اس کی صحت اور اصلیت کی دلیل ہے، نہ کہ اس کے برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے، اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لیے دلیل ہے نہ کہ ہمارے مخالف کے لیے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۵۰۷)

عرب کے مورث اعلیٰ

سر ولیم میور کے اعتراضات کی اصل حیثیت سرسید کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" میں کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا، انکار کیا ہے، اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو ان کے دل میں آئی حقیقت واقعہ قرار دیا ہے، مثلاً انھوں نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ مکہ کے قریب اسماعیلؑ کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے، سب بناوٹ اور قصہ اور ہر قسم کی تاریخی سچائی سے خالی ہے، مگر بقول سرسید مرحوم:

"اس بات کے کہنے سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بیان کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل مذہب اور اپنی رسموں میں یقطان اور اسماعیلؑ سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی، اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور باہم سخت عداوت رکھتے تھے، اور روزانہ جنگی اور باہم لڑائیاں کرتے تھے، اس ایک بات پر متفق ہو گئے تھے، عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے، ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا، ان تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں، کیونکہ ایسے موقع پر ثبوت کے مقابلہ میں صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے، یونان کے مورخ اور جغرافیہ کے ماہرین، حجاز میں اسماعیلؑ کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں، یونانی مورخوں نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیلؑ کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں، ان سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں؟ (خطبات احمدیہ: ص ۵۰۹)

عرب کی مذہبی رسموں کا حضرت ابراہیمؑ سے تعلق

سرسید کے الفاظ میں سر ولیم میور از راہ خود پسندی یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اس عقیدہ باطل (یعنی حضرت ابراہیمؑ سے نسبی رشتہ کے خیال) کے کسی ابتدا

(رسموں) میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہو، حجر اسود کا بوسہ دینا، کعبہ کے گرد طواف کرنا، مکہ اور عرفات اور منیٰ میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان کے خیالات اور اصول سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں ہے، جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہونچیں، یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مقامی نوعیت کی تھیں، یا ان کا بت پرستی کے اس سرچشمہ سے جو جزیرۂ عرب کے جنوب میں جاری تھیں، تعلق تھا، اور وہاں سے بنا جرہم یا بنی قطورہ، یا ازدایت یا کوئی اور قوم جو یمن سے منتقل ہو کر مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی۔"

مگر سر ولیم میور کے یہ خیالات دلیل اور ثبوت کے بغیر سچائی سے انحراف کی ایک افسوسناک مثال ہیں، اس پر سرسید نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیمؑ یا بنی اسرائیلؑ کی تمام رسمیات سے جو اُن کے ہاں جاری تھیں، یک لخت چشم پوشی کر لی ہے، ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔"

سر ولیم میور کی ذکر کردہ رسمیات جن کو وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد میں گم پاتے ہیں، وہ سرسید کی بائبل سے نقل کردہ شہادتوں کی بنا پر اس بات کا پتہ دیتی ہیں، کہ ان کی اصل حضرت ابراہیمؑ اور ان کے خانوادہ میں موجود تھی، جن کی عربوں نے ایک قیمتی وراثت سمجھ کر حفاظت کی، چنانچہ جیسا کہ سرسید مرحوم نے تحریر فرمایا ہے "حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ بناتے تھے، (پیدائش باب ۱۲، آیت ۷، ۸، اور باب ۱۳، آیت ۱۸، باب ۲۶، آیت ۲۵، باب ۲۸، آیت ۱، ۱۹، ۲۲، کتاب خروج باب ۲۰، آیت ۲۵، باب ۲۴، آیت ۴) حجر اسود کو بوسہ دینے کا اس جگہ سر ولیم میور نے جو ذکر کیا ہے، اس سے ایک عام مقصد بیان کرنا معلوم ہوتا ہے، یعنی پتھر کی تعظیم، مگر انھوں نے ان پتھروں کی اس تعظیم کو فراموش کر دیا، جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور موسیٰؑ کرتے تھے، یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے، خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے، یعقوبؑ نے اس پر تیل ڈالا، (دیکھو بائبل کی کتاب پیدائش

باب ۲۸، آیت ۱۹) یہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انتہائی تعظیم تھی، یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانۂ خدا ہوگی، (پیدایش باب ۲۸، آیت ۲۲) خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تاکہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے، (خروج باب ۲۰، آیت ۲۶) اب کون سا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے، جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت اولاد ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا، جس کے سبب سر ولیم میور، حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ ہو) اولاد ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں،

ایک گھر خدا کے لیے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسا کہ کعبہ ہے، اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے، تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰؑ) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا، (خروج باب ۲۰ آیت ۲۴)، کتاب اوّل تاریخ الایام باب ۲۱، آیت ۲۹) اور وہ کون تھا (یعنی داؤدؑ) جنھوں نے خرمن گاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کے لیے مول لیا اور پتھر، لکڑی، لوہا اور پیتل اس کے بنانے کے لیے جمع کیا (کتاب اول، تاریخ الایام باب ۲۲) اور وہ کون تھا (یعنی سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمن گاہِ ارنان یبوسی میں نہایت عالی شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا، (کتاب دوم، تاریخ الایام، باب ۴) ان شواہد کی روشنی میں کعبہ کی تعمیر اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیمؑ کی طرف منسوب نہ کرنا، بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے،

مکّہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے، سر ولیم میور کے لیے اس رسم کے بارے میں ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا، جبکہ وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے پہلے یہ ثابت کر لیتے کہ ابراہیمؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ نے جو مذبح یا بیت اللہ بنایا تھا ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے، کیونکہ توریت سے موسیٰؑ سے پیشتر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لیے ان گھروں کا بنانا تو معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا، اور ہمارے لیے اس بات کے یقین کرنے کا جائز قرینہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا یہی طریقہ تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے، اور اسمٰعیلؑ کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو ابتدا تک قائم رکھا ہے، ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں

خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا (اس کے اردگرد جو کچھ ہوتا ہے اس سے مقصود خدا کی ذات ہوتی ہے، نہ کعبہ کی عمارت) پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ (کی عمارت) کا حج ہوتا ہے،

عرفات کی رسم کا بھی ابراہیمؑ اور ان کی اولاد سے تعلق رہا ہے، ہزاروں جگہ توراۃ میں آیا ہے کہ خدا ابراہیمؑ کو مرئی ہوا (یعنی ان کو دیدار الٰہی ہوا) خدا اسحاقؑ کو مرئی ہوا، خدا یعقوبؑ کو مرئی ہوا، خدا موسیٰؑ کو مرئی ہوا، پس ٹھیک ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں، جس پہاڑ پر (مکہ کے قریب) خدا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو مرئی ہوا، اسی پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے، معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا، جو یہ کہا کہ اس کو ابراہیمی رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے جو دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، یہ خاص امر ابراہیمؑ کی نسل میں ملتا ہے۔ یہاں ہم اس بات پر کہ خدا کیونکر دکھائی دے سکتا ہے بحث کرنا نہیں چاہتے، اور ان الفاظ کے مطلب و مراد سے یہاں کوئی بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات (عرفان الٰہی یا دیدار خداوندی) کا استعمال بجز خاندان ابراہیمی کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا، اور اسی لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ابراہیمؑ سے ثابت ہوتا ہے، یہی جگہ ہے جہاں کی حاضری کو حج کہتے ہیں، پہاڑ تلے کا میدان ہے جس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں، اس کی تسبیح کرتے ہیں، اس قدوس کو قدوس قدوس کہہ کر یاد کرتے ہیں، اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے، جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے، اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ موسیٰؑ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے، پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں میں پائی جاتی ہے، یا خاص ابراہیمؑ کے یہاں۔

منیٰ کا مقام بھی صرف قربانی کے لیے ہے، اس کے علاوہ وہاں کوئی دوسری رسم نہیں ہوتی، تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری ہوئی ہے، جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی، اور اسی قربانی کی وجہ سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا، منیٰ اور خانۂ کعبہ نہایت قریب ہیں، اور اسی لیے قربانی نذر کرنے کے لیے منیٰ کی جگہ مقرر کی گئی، ابراہیمؑ، یعقوبؑ، اسحٰقؑ اور موسیٰؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ کی قربانی اور اسلام میں قربانی کے درمیان یہ فرق ضرور ہے کہ ان کے یہاں قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے، اس خیال سے کہ خدا کو اس کی

خوشبو پسند آتی تھی، مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کی جاتی ہے، تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں، سر ولیم میور اگر اسی وجہ سے منیٰ کی رسموں کو بت پرستی کی رسمیں تصور کرتے ہیں، تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے، کیونکہ ہر ذی عقل قربانی کے مذکورۂ بالا طریقوں کے مقابلہ میں اسلام کی قربانی کے طریقہ کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا،

اسلام نے کسی ملک کو مقدس نہیں ٹھہرایا، البتہ اس مقدس جگہ کو جو خاص طور پر خدا کی پرستش کے لئے مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی، مقدس ٹھہرایا گیا ہے، یہ بھی ابراہیم کا طریقہ تھا، اور ان کی اولاد میں برابر چلا آرہا تھا، جہاں انھوں نے خانۂ خدا یا مذبح بنایا اس جگہ کو مقدس سمجھتے تھے، موسیٰ کو خدا نے کہا کہ سینا پہاڑ کے لیے حد ٹھہرا اور اس کو مقدس کر، (خروج باب ۱۹، آیت ۲۳) خدا کا یہ بھی حکم ہے "اور میرے مقدس کی تعظیم کرنا" (سفر یوحنا باب ۲۶، آیت ۲) اسی طرح بیت المقدس کو بھی مقدس ٹھہرایا گیا، اسی طرح اسلام میں بھی خانہ کعبہ کے لیے جب سے وہ بنا ایک حد مقرر کی گئی، جو حرم کہلاتی ہے، اور اس کو خدا کے مقدس نام کے ادب کے لیے جس کے نام پر وہ ایک جگہ بنائی گئی مقدس ٹھہرایا، یہ بھی اس بات کا ایک نہایت واضح ثبوت ہے کہ بیت اللہ کو مقدس ٹھہرانا، خاص طور پر ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ بت پرستوں کی رسم سے، (خطبات احمدیہ: ص ۱۳۴ – ۵۰۹)

سرسید، سر ولیم میور کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کو مقدس قرار دینے کی رسم کا تعلق دور جاہلیت سے تھا، یہ حج کے مہینے تھے، اور اہل عرب نے آپس میں مقرر کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی، تاکہ لوگ بے خطر ہو کر مکہ آئیں اور حج کر سکیں، مگر بقول سرسید:

"سر ولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی ان کو مقدس مانا ہے حالانکہ مذہب اسلام نے ان کی تقدیس کو رد کر دیا ہے، اور کوئی مہینہ اسلام میں اس طرح مقدس نہیں رہا ہے، اسلام نے یہ کہا ہے کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے گئے ہیں ان میں تم لڑائی کی ابتداء مت کرو، لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو، خدائے تعالیٰ سورۂ توبہ میں فرماتا ہے: (اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ... کافۃ) کہ ان چار مہینوں کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ سال کے سب

بارہ مہینوں میں مت لڑو، اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں، پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں، شہر حرم (چار محترم مہینے) نہیں مانے جاتے بلکہ بارہ کے بارہ مہینے ایک سے ہیں۔" (خطبات احمدیہ ص ۱۵۵)

صابی مذہب سے تعلق سر ولیم میور یہ بھی لکھتے ہیں کہ عرب کے خاص طریقے سیبین ازم (صابی مذہب) اور بت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی، اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا، لیکن اس اعتراض کے جواب میں سرسید یہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں رائج تھے، ان میں بہت کچھ رسمیں بت پرستی کی شامل ہو گئی تھیں، مثلاً صابئین کا مذہب، اس میں کفر و شرک اور کواکب کی پرستش داخل ہو گئی تھی مگر جو خاص باتیں ابراہیمؑ کے مذہب کی ان میں پائی جاتی تھیں ان کو بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب فرماتے ہیں، یہی ان کی غلطی ہے، خانہ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسماعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں، سیبین ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا، پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور عرب کا دستور بیان کرتے ہیں، (حالانکہ وہ پرستش نہیں بلکہ تعظیم ہے، اور گزشتہ صفحات میں بائبل سے اسکی نظیریں بھی پیش کی جا چکی ہیں) ابراہیمؑ کا طریقہ تھا، یہ طریقہ خاص ابراہیمؑ سے پیدا ہوا، اور یعقوبؑ و اسحٰقؑ اور اسمٰعیلؑ و موسیٰؑ نے اس کی پیروی کی، جو ان گھڑے اور ننگے پتھروں کو (موجودہ بائبل کی پیش کردہ شہادتوں کے مطابق) ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے، اور ان پر تیل چڑھاتے تھے، خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے، (جس کی ذمہ داری موجودہ بائبل پر ہے، اور اس کی روشنی میں جو کچھ چاہو ان کی نسبت کہو، مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا، بلکہ خاص عرب کے بت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور .... بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔"

سرسید نے اس بحث کو تمام کرتے ہوئے مکہ کی تاریخ اور نسب نامہ نبوی پر بڑی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ اظہار خیال ہے، اور اس بارے میں سر ولیم میور کے طول طویل بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے

یہ لکھا ہے کہ:

"ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصّوں کے بعد سر ولیم میور نے مکّہ کی ابتدا اور مکّہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے، اور ہر ایک بات کو بے دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد...... اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں، مگر وہ باتیں نہ تاریخی واقعات ہیں، نہ عرب کی مقامی روایتیں اور نہ کتاب مقدس (بائبل) کی سچی باتیں، بلکہ صرف سر ولیم میور کے عجیب و غریب کام کرنے والے خیال کی ایجاد ہیں، اس وجہ سے ہم ان کو ذکر کرنا بے فائدہ سمجھتے ہیں۔" (خطبات احمدیہ، ص ۵۱۷)

نسب نامۂ نبوی | نسب نامۂ نبوی پر سر سید احمد خان کی تحقیق یہ ہے کہ اسمٰعیلؑ (بن ابراہیمؑ) ۱۹۱۰ قبل مسیح پیدا ہوئے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۵۷۰ بعد مسیح پیدا ہوئے، دونوں میں ۲۴۸۰ برس کا فاصلہ ہے اور اسمٰعیلؑ سے آنحضرتؐ تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گذری ہیں، جو علوم طبیعی کی تحقیقات کی روشنی میں ازروئے حساب بالکل صحیح ہے، یعنی ایک صدی میں تقریباً تین پشتیں، آنحضرتؐ کے ایک جد بعید عدنان اور حضرت اسمٰعیلؑ کے درمیان بیہقی نے دس، ابن ہشام نے ایک نسخہ کے مطابق نو اور ایک اور نسخہ کے مطابق گیارہ پشتیں، اور ابن الاعرابی نے نو پشتوں کا ذکر کیا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عدنان کے درمیان سر ولیم میور کے مطابق اٹھارہ پشتیں گذری ہیں، (دیکھیے لائف آف محمدؐ: ج ۱ ص ۱۹۴) مگر سر سید نے اس بارہ میں اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے کہ:

"سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے شبہ پڑا ہے، (مگر) عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں...... عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا، مگر پہلے معد کا، نہ کہ دوسرے معد کا، جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے...... یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان ہمارے مرتبہ شجرہ میں اکیسویں نمبر پر ہے، جو عموماً تسلیم کیا گیا ہے، مگر عدنان سے آگے مورخوں میں اختلاف ہے، (جس کی بنیاد مذہبی نہیں، بلکہ تاریخی ہے)...... سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک، خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے، اور عدنان

سے آگے یہودیوں سے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۵۶۸-۵۷۰)

مگر مورخوں نے عدنان سے اوپر شجرۂ نسب کی جستجو میں اگر یہود کی تاریخی روایتوں کی طرف رجوع کرلیا تو اس میں مذہب اسلام کے لیے عیب کی کیا بات پیدا ہوگئی، سرسید فرماتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا کہ "میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیلؑ میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا (توراۃ) کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسماعیلؑ کی نسلیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اسماعیلؑ تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد یاد ہوں، اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ (شجرۂ نسب) ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں، یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیانبی کی تحریروں سے، وہ تو اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا، سو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت پورا ہوا، تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں، یا کسی اور ملک کے، مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے، اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم، قریش، اسماعیلؑ بن ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں، محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "اَبِیکُمْ اِبْرَاھِیْمَ" (تمہارے جد ابراہیمؑ ہیں) جس کو سب نے تسلیم کیا۔ اور کون ایسا شخص ہے جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۵۷۰)

معراج جسمانی پر اعتراضات کا دفاع

سرسید احمد خاں اگرچہ معراج بصورت رؤیا کے قائل ہیں، جیسا کہ بعض صحابہ کرامؓ، اور بعد کے علماء و اہل تحقیق میں سے ایک طبقہ کی رائے ہے، مگر وہ مستشرقین کی طرف سے معراج جسمانی پر کیے جانے والے اعتراضات کو بھی صحیح نہیں سمجھتے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"اب ہم بفرض اتمام حجت (معراج جسمانی کو) واقعی تسلیم کر لیتے ہیں، اور یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے یہاں ایک خاص امر دینی ہے، اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا پر مذہب اسلام پر طعن کرتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر شور مچاتے ہیں، جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں، کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ حضرت الیاسؑ آسمان پر انسانی جسم و شکل کے ساتھ موت کا مزہ چکھے بغیر ایک آتشیں گاڑی میں ایک آندھی کے ذریعہ اٹھائے گئے ہیں، اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیحؑ مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گیے، اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے، یعنی خود اپنے ہی دست راست کی طرف، کیونکہ وہ خود خدا تھے، (متی باب ۲۸، آیت ۷، مرقس باب ۱۶، آیت ۱۹)

اس لیے ہم تمام عیسائیوں کو درج ذیل احکام کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ "تو اس ذرّہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے، اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا، تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرّہ نکلوا لے جبکہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں سے شہتیر تو نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں ذرّہ نکالنے کے لیے صاف نظر آنے لگے گا"۔ (لوقا: باب ۶، آیت ۴۲-۴۱)

ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر چلے جانے کے قصے کو نہایت شاعرانہ رنگین بیانی سے نظم کیا ہے، جس کا ترجمہ سرسید کے الفاظ میں یہ ہے کہ "اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی، اور اس کے پیچھے دس ہزار جنگوں کی سریلی آوازیں تھیں، جو زمزمہ ہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں، زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی، تمام افلاک و بروج سے صدائے بازگشت آرہی تھی، سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لیے ٹھہر گیے تھے، جبکہ یہ نورانی جلوس شادکامی کے طنطنہ کے ساتھ عالم بالا کو روانہ ہوا، انھوں نے یہ نغمہ گایا: اے لازوال دروازو! کھل جاؤ! اے آسمانو! اپنے دروازوں کو وا کرو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہونچا کر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے اندر لے لو، اور اب خدا تعالیٰ کی نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ فرمائے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولی الاجنحہ اور رحمت آسمانی

دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔" (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۰-۳۷۱)

سرسید کی طرف سے اس جواب کی روشنی، معراج جسمانی مذہبی نقطۂ نظر سے اہل مذاہب کے لیے قابل فہم ہے اور واقعات معراج میں کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس کے بارہ میں وہ اپنے مذہبی اعتقاد و تصور کو برقرار رکھتے ہوئے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ناممکن ہے یا عالم واقعات میں ایسا نہیں ہو سکتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے متعلق کچھ روایتیں تو وہ ہیں جو قابل اعتماد نہیں، اور نہ ہی وہ مذہبی روایتیں سمجھی جا سکتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی، اور مسلمانوں کو نمایاں فتوحات حاصل ہوتی گئیں، اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی، اور وہاں کے قدیم آتش کدے برباد ہو گیے، اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ آگیا، ان واقعات کو جو بعد میں پیش آئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن سے منسوب کر دیا گیا، ان کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں اور بھی روایتیں کتب سیر میں مذکور ہیں، اگرچہ سرسید کے بقول "ان کی صحت کے لیے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے، مگر ان کے غلط ہونے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے"، مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبد المطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی، عبد المطلب فوراً وہاں آئے، اور آنحضرت صلعم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر کعبہ میں لے گیے، اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ عبد المطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے طرز کے مطابق ہے اور اس سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے، مگر جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے کہ:

"ہم کو اس بات سے کہ عبد المطلب نے جو دعا مانگی تھی، وہ مسلمانوں کے طرز پر تھی، کچھ تعجب نہیں، کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی، اس بات کا ایک بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبد المطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبد اللہ رکھا تھا، جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۲۱۸)

حضرت حلیمہ کی تربیت، اور قرآن کی زبان

شرفائے مکہ کا دستور تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے

کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے، اپنے بچوں کو جب وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے، دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے باہر بھیج دیا کرتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا، وہ اپنے گھر لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لاکر آپ کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں، دو برس بعد آپ کا دودھ چھڑایا گیا، اور حضرت حلیمہ آپ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں، مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی (گرم) آب و ہوا آپ کو موافق نہ ہوگی، پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا، اور وہ ان کو اپنے ساتھ لے گئیں، اور ہر چھٹے مہینے لاکر آپ کو ملا جاتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا، اس لیے حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور ان کے خاوند حارث، دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ، انیسہ اور حذیمہ عرف عثمان دودھ شریک بھائی بہن ہوئے، عربوں میں قریش اور خصوصاً یہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لیے مشہور تھی، اور اسی سبب سے جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور مؤثر ترین فصیح و بلیغ تھے، عرب فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے، اور جو شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا اس کو نظر حقارت سے دیکھتے، اور ذلیل سمجھتے خواہ وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

مگر بنی سعد میں چار برس تک کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کو، سر ولیم میور قرآن مجید کی فصاحت کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جزیرہ نمائے عرب کی خوشنما زبان کے خالص ترین نمونہ کے مطابق بن گئی تھی، ..... جب ان کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی، تو ایک خالص زبان اور ایک دلفریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا۔" (یعنی آپ قرآن مجید جیسی فصیح و بلیغ چیز پیش کرنے میں کامیاب ہو گیے) مگر کیا قرآن مجید جیسا کلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنی سعد میں پرورش کا نتیجہ ہے؟ اور کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام، اسی انداز کا ہوتا تھا، جیسا کہ ہم قرآن مجید کی سورتوں میں دیکھتے ہیں؟ سرسید نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں، جس میں یقین کیا جاتا ہے کہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ

محفوظ ہیں، جیسے دعائیں وغیرہ، تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز کلام (اپنی بلندی اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے باوصف) فصحائے عرب کے طرز کلام جیسا ہے، لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے، اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے، اور ہم دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے، اور دوسرا کلام ربانی"

(خطبات احمدیہ، ص ۲۱)

عہد طفولیت کے واقعات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک چھ برس کی ہوئی، حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیزوں سے ملانے کے لیے مدینہ منورہ لے گئیں، کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں، اور پھر مکہ معظمہ کو واپس ہوئیں، مگر راستہ میں ابواء کے مقام پر وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پہنچے تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی، اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے، اس دوران میں اور دادا کے انتقال کے بعد بھی، بارہ برس کی عمر تک، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند واقعات کو، سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں قابل اعتراض ٹھہرایا ہے، مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا، اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا، دودھ شریک بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا، اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا، سر ولیم میور نے جس مقصد سے یہ واقعات بیان کیے ہیں، ان پر سرسید نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے:

"اگرچہ ان باتوں کی اور اس قسم کی اور باتوں کی جو سر ولیم میور نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے، لیکن اگرچہ یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں، تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں کہ جو بچپن میں انسانی فطرت کے مطابق ہوا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے، اور نہ خدا کے بیٹے، انھوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ، پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں"۔ (ایضاً: ص ۲۷۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آٹھویں برس آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی[۸۲] برس کی عمر میں وفات پائی،

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "جب آنحضرتؐ جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گیے، تو لوگوں نے آپ کو روتے ہوئے دیکھا" لیکن بقول سرسید:

" یہ ایک ایسی بات ہے جس سے سر ولیم میور کی خواہش کے برخلاف ہمیں کچھ تعجب نہیں، بلکہ اگر نہ روتے تو ہمیں نہایت تعجب ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کم عمر تھے، اور ایسے موقعوں پہ آنسوؤں کا نکلنا، اور رنج کے وقت دل میں نرمی اور گداز کا ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم کی طرف سے انسان کے دل کی تسلّی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی، جو خدا نے انسان میں پیدا کی ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۲۲۷)

سر ولیم میور اور مولود ناموں کی روایات، بعض مولود ناموں میں (جن کے لکھنے والے بھی زیادہ تر کم پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں) فکر و تخیّل سے کام لے کر محض خوش گمانی سے شاعرانہ انداز میں جو کہانیاں لکھ دی گئی ہیں، سر ولیم میور نے ان کا بھی سہارا لے کر اسلام پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی ہے، چنانچہ سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ ولادت میں حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز کو سن کر ڈر جانا، یا ایک سفید مرغ کا اچانک نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کو اپنے اضطراب میں تسکین پانا یا حضرت آمنہ کے لیے ایک خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا فرشتوں کی آواز آنی یا بغیر اس کے کسی شخص کا دکھائی دینا، یا اس کے چلنے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لیے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا، بہشت کے پرندوں کا چہچہانا، بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا، یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں، جو غالباً سر ولیم میور نے کسی مولود نامہ سے اخذ کیے ہیں، اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہوگا، سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے خیالات ہیں، جو انھوں نے اپنے مضامین کو آراستہ کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق بڑھانے کے لیے بیان کی ہیں، جیسا کہ اس قسم کے واقعات بیان کرنے میں شاعروں کا خصوصاً مشرقی شاعروں کا دستور ہے، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اس قسم کے خیالات نظم کیے ہیں بیان کیے ہیں، چنانچہ ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ انہی خیالات سے بھری ہوئی ہے، اس لیے نہایت

افسوس کی بات ہے، کہ ایک عیسائی عالم اپنے یہاں کے اسی قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے، اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو مذہبی روایتوں کی حیثیت دے کر یہ فیصلہ کرے کہ وہ سب راویوں کی ایجاد ہیں، شاعروں نے اپنی محبت کے جوش میں اور عقیدت کے طور پر اپنے شاعرانہ انداز میں اور بھی واقعات بیان کیے ہیں، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا، اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی، کلمہ پڑھا، تین نورانی فرشتے آسمان سے اترے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمردکا لگن، اور تیسرے کے پاس رومال تھا، انھوں نے آنحضرت کو سات مرتبہ غسل دیا، اور آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے یہ واقعات شاعرانہ اظہار خیال کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن سر ولیم میور نے ان کو بھی مذہبی روایات کے طور پر بیان کیا ہے، جو کہ نہایت ہی غلط بات ہے"۔ (خطبات: ص ۲۷-۲۲۶)

ایک بیجا تنقید سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی راویوں کی ایجاد قرار دیا ہے، جس کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور قانون فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں" اس اعتراض پر سرسید احمد خاں نے اپنے تعجب کا اظہار کیا ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"یہ بات نہ معجزہ سے تعلق رکھتی ہے نہ عجائبات سے، بلکہ اس کا تعلق فطرت کی نیرنگیوں سے ہے، جس کی اور بھی نظیریں بتلائی جاسکتی ہیں، مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں تذکیر و تانیث دونوں کی علامتیں ہوں، ایسے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کی طرف سے کہیں کہیں دوسرے طریق اپنانے میں کوئی عجیب بات نہیں ہے، اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں اس لیے معجزہ یا عجائبات کا نام لیے بغیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مختون پیدا ہونا قابل فہم اور قرین قیاس ہے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ختنہ کی رسم بڑی پابندی سے جاری تھی، اور ضروری قرار پاگئی تھی، اور عرب دور جاہلیت میں بھی اس کے ترک کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف ترین روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا، (جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ پیدائشی طور پر آپ کے مختون ہونے کی

روایت درست ہے، اس کو راویوں کی ایجاد کہکر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، (خطبات: ص ۲۸۰)

مہر نبوت | مہر نبوت کے بارے میں سر ولیم میور کہتے ہیں کہ:

"صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں لکھی ہوئی تھی"

لیکن سرسید کے خیال میں "تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود سا تھا، اور اس پہ بال تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی عزت اور تعظیم کی جاتی تھی، اس لیے اس کو مہر نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہوگا بعض لوگوں، کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے، تمام علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے، پس کیا ایک عیسائی عالم کے لیے یہ بات نازیبا نہیں کہ وہ مسلمانوں پر ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام رکھا جس سے وہ خود انکار کرتے ہوں، شمائل ترمذی کے حاشیہ باجوری میں لکھا ہے، کہ "یہ جو روایت ہے کہ اس پر چھپنے کے جیسے یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند، یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا، اور اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا، یا یہ لکھا ہوا تھا "انت منصور" (انت منصور) ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ عسقلانی نے کہا ہے، اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر محمد رسول اللہ کے الفاظ لکھے ہوتے تھے، اس کو ہاتھ کی مہر اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے، دھوکا ہو گیا ہے، کیونکہ وہ عبارت، ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی، نہ کہ "پشت کے غدود پر"

اس لیے باجوری اور عسقلانی کی تحقیق کے مطابق یہ بات صاف طور پر ثابت ہے کہ جو روایتیں سر ولیم میور نے بیان کی ہیں علمائے اسلام نے ان کو رد کیا ہے، شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیے ان کے باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی، اور کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس کا علاج کر دوں، کیونکہ میں طبیب ہوں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم رفیق ہو، اور اللہ طبیب ہے"

اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے، وہ کیا چیز تھی، اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانہ کے مسلمان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے، اس کو کیا سمجھتے تھے، پس سر ولیم میور نے جو اس کو عجائبات اسلام کے طور پر بیان کیا ہے یہ محض ایک بیجا امر ہے۔ (ایضاً: ص ۳۰ ۔ ۲۷۰)

چند اور واقعات | سر ولیم میور نے اور روایتیں بھی درج کی ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے، اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی، لیکن جیسا کہ سرسید احمد خاں نے

وضاحت کی ہے کہ:

"اس طرح کی باتوں کو خود علمائے اسلام نے غیر صحیح اور نامعتبر قرار دیا ہے، سر ولیم میور ان کو مذہبی روایتیں کہکر بیان کرتے ہیں، تو دراصل وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح اسلام کی بے وقعتی ظاہر کریں"۔

لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہیے، کہ عام بے پڑھے لوگوں میں جو باتیں مشہور ہوجاتی ہیں، وہ مذہب نہیں بن جاتیں بلکہ بے سند ہونے کی وجہ سے وہ نامعتبر ٹھہرائی جایا کرتی ہیں،

وہ یہ روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کردیا، لیکن شرح السنہ میں بیان کی ہوئی یہ روایت اس طرح نہیں ہے، جس طرح کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے، شرح السنہ میں عرباض بن ساریہ سے منقول ہے کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیمؑ کی، بشارت ہوں عیسیٰؑ کی، اور اپنی ماں کا خواب ہوں (رویا امی) انھوں نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا کہ ان سے ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہوگئے"۔

پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور پیدا ہونے کا ذکر ہے ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت آمنہ نے ایک ایسا خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تو تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے، اور نہ ہی فطرت انسانی سے بعید"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۲۳۲)

فرشتہ کے ذریعہ "احمد" نام کی تلقین،

سر ولیم میور نے واقدی کا ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "حمد" کے مادے سے جو نام مشتق ہوتے ہیں وہ عرب میں رائج تھے، مگر "احمد" نام عرب میں بہت کم ہوتا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا پانچ آدمی اور بھی گذرے ہیں جن کا نام "محمد" تھا، واقدی کے حوالہ سے وہ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنھوں نے یہود، نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا کہ عنقریب عرب میں ایک نبی اس نام کا ہونے والا ہے، اور اکثر لوگ اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھا کرتے تھے، اور ہر ایک امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخر الزماں ہونے کی عزت حاصل کرے گا"، مگر سر سید کا خیال یہ ہے کہ:

"اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے یہ کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سرولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے؟ اگر توریت مقدس کی یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسمٰعیل رکھنا" (پیدائش باب ۱۶، آیت ۱۱) اور یہ آیت "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارہ تیری بی بی کے بیشک ایک لڑکا پیدا ہوگا، اور اس کا نام اسحاق رکھنا" (پیدائش باب ۱۷، آیت ۱۹) اور انجیل کی یہ آیت "اور اس کے (مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا، اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے، کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا" (متی باب ۱، آیت ۲۰) صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو وہ کس بنا پر اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور اس نے اس لڑکے کا جو پیدا ہونے والا تھا احمد نام رکھنے کے لیے کہا،

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت یہ ہے کہ (بائبل کے) عہد عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے، اور انجیل میں احمد کے نام سے، اس لیے ان بشارتوں کے پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جائے، کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے، (خطبات، ص ۳۴۷)

سرولیم میور کے خیال میں "انجیل یوحنا کے یونانی ترجمہ میں پیریکلی ٹوس تھا، جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں، لیکن کسی جاہل یا متعفنی راہب نے اس کو پیریکلیوٹوس کر دیا" جس کے معنی "احمد" (تعریف کیا ہوا) ہیں، اگر بقول سرسید انجیل کا صحیح لفظ پیریکلیوتوس "ہی ہے، جس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس کی عربی شکل فارقلیط پائی جاتی ہے، (اصل یونانی نسخہ کی عدم موجودگی میں، ظاہر ہے کہ عربوں کی روایت ہی قابل ترجیح ہوگی جو فارقلیط کا لفظ استعمال کرتے تھے جو پیریکلیوٹوس کی عربی شکل ہے، اور اس لفظ کے بارہ میں تاریخ کی یہ قدیم ترین شہادت بتلاتی ہے کہ یونانی نسخہ میں پیریکلی ٹوس نہ تھا، جس کا ترجمہ تسلی دہندہ کیا جاتا ہے،

سرولیم میور کا یہ دعویٰ کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گذرے ہیں، سرسید کے نزدیک بے فائدہ ہے، اس لیے کہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں

ہوا، انھوں نے تو اس بات کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی، کہ اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گذرے ہیں، مگر:

"یہ بات کسی طرح بائبل کے عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر اثر انداز نہیں ہوسکتی" کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اس لڑکے کے نبی ہونے کے لالچ میں کیوں نہ رکھا ہو، مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدائے تعالیٰ کو نبی آخرالزماں بنانا منظور تھا، ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے جب ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے تھے، اور وہ ایسے کام ہیں، جو تمام جہاں کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جب ہم اس روحانی کیف وسرور کو دیکھتے ہیں، جو دین حق کا طفیل ہے، اور جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں عام کیا تھا، اور جو آئندہ نسلوں میں اپنے ورثہ کے طور پر آپ نے پیدا کیا، اور جب ہم سچائی اور پاکبازی پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرت ؐ نے رائج کیا اور جو زمانہ کی گردشوں کے بعد بھی کامل اور بے عیب رہی ہیں، اور ابدالآباد تک اصلی حالت پر اسی طرح رہیں گی، تو ہم کو اس بات کا کامل یقین ہو جاتا ہے، کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے، جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے، صلی اللہ علیہ وسلم، (خطبات احمدیہ: ص ۳۷۶)

اسپرنگر کی عجیب وغریب دریافت

مستشرقین نے ہر جگہ "عیب" کی دریافت کی ہے، چنانچہ حضرت آمنہ کا خواب میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا، ان کے نزدیک صرع یعنی مرگی جیسے مرض کا ثبوت فراہم کر دیتا ہے، جب کہ فرشتوں کو دیکھ کر خوف محسوس کرنا، سرسید کے نزدیک "کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف، اس واقعہ سے تو مزید اس بات کی تائید ہو جاتی ہے، کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے خواب میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا، سرسید فرماتے ہیں کہ:

"اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمانداری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کو ضعف دماغ اور صرع کی بیماری تھی، جب کہ حضرت سارہ

اور حضرت مریم نے جو (بائبل کی تصریح کے مطابق) فرشتوں کو دیکھا تھا، اس کو صرع کی بیماری قرار نہیں دیتے۔" (خطبات: ص ۲۳۶)

حضرت حلیمہ کے گھر میں برکت،

حضرت حلیمہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں اپنے گھر پرورش کے لیے لے گئیں، تو کئی طرح سے برکتیں ظاہر ہوئیں، مثلاً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اب بچہ کو خوب سیر ہو کر دودھ پلا سکتی ہیں، بلکہ اس قدر کہ وہ ان کے اپنے بچہ کے لیے بھی کافی ہو جائے گا، اونٹنی کا دودھ بھی بڑھ گیا، وہ بچہ کو لے کر چلیں، تو سواری کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی، اور مویشی بھی فربہ ہوتے چلے گئے، اور کثرت سے دودھ دینے لگے، سر ولیم میور نے یہ اور اس طرح کے کئی واقعات غالباً تعجب انگیز سمجھ کر نقل کیے ہیں، لیکن اس موقع پر سرسید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ "یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے، لیکن ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے"۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایسی باتوں کو عیسائی عالم بطور دور از قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں، تو بلاشبہ ہم کو تعجب ہوتا ہے کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا، کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے" (پیدائش باب ۳۰، آیت ۲۷) اور عیسائی عالم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا، اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے، اور جب سے میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے، (پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۰) اور اسی طرح پیدائش باب ۳۰، آیت ۳۷ سے ۴۲ تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو حضرت یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا، تو کیا وجہ ہے کہ اگر خدا نے حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت دی ہو تو اس کو دور از قیاس قرار دے کر تعجب انگیز طور پر بیان کیا جائے"۔ (خطبات: ص ۲۳۷)

حیات رسولؐ میں کسی مرض کی جستجو

سر ولیم میور اور کئی دوسرے مستشرقین کی دماغی صحت کا یہ حال ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیرت انگیز سیرت طیبہ، اعلیٰ کارناموں، اور عظیم صفات کی اصل وجہ اور حقیقی سرچشمہ، اس بیماری کو قرار دیتے ہیں جو صرع یعنی مرگی کے نام سے موسوم ہے اور اس طرح وہ دراصل اپنی سیاہ باطنی، اندھی عصبیت اور اپنی کوتاہ فہمی

.... یا بددیانتی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں،

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ ابن ہشام اور دیگر متاخرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو یہ گمان ہوا کہ لڑکے کو ایک عارضہ (Fit) ہوگیا ہے، سر ولیم میور نے فٹ کا انگریزی لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یکبارگی حملے کے ہیں، جس سے بدن کپکپانے لگے یا غشی طاری ہو جائے، اس سے موصوف نے غالباً صرع (مرگی) مراد لی ہے، مگر سر سید فرماتے ہیں کہ:

"ہمارے پاس سیرت ابن ہشام موجود ہے جو ڈاکٹر فرڈیننڈ وسن فینٹ کی نگرانی میں ۱۸۵۸ء میں گاٹجن میں چھپی ہے، اس کتاب سے ہم وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

قالت و قال لی ابوہ یا حلیمة لقد خشیت ان یکون هذا الغلام قد اصیب فالحقیه باهله، یعنی حلیمہ نے کہا کہ اس کے باپ (دودھ شریک باپ) اور حلیمہ کے شوہر نے کہا کہ اے حلیمہ! مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہوگیا ہے، اس لیے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے، مگر جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا، اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور فرمایا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہوگیا ہے، (یعنی تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو گمان ہوگیا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔"

سر ولیم میور نے ایک غلطی تو یہ کی ہے کہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱ (حاشیہ) پر لفظ "اصیب" کو "امیب" لکھا ہے، دوسری غلطی یہ کی ہے کہ اس سے وہ (Fit) یعنی مرگی جیسی بیماری مراد لیتے ہیں کہا ایک دو کے سوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری لکھنے والے تمام عیسائی مصنفین یہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع (مرگی) کی بیماری لاحق تھی، بہت تلاش کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ خام خیالی عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوئی، ایک تو ان کے مذہبی توہمات کی وجہ سے اور دوم عربی عبارت کے لاطینی میں غلط ترجمہ ہو جانے کی وجہ سے۔"

ڈاکٹر پوکاک نے تاریخ ابوالفداء کا لیٹن میں ترجمہ کیا، جو ۱۷۲۳ء میں آکسفورڈ میں شایع ہوا، اس میں

فَالْحِقِیہِ کو "بالحَاتِیۃِ" بنا دیا گیا، اور چونکہ اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکا تھا، اس لیے ترجمہ میں اس کو چھوڑ دیا گیا، اور "اصیب" جس کے صرف بیماری کے ہیں، اس کے لیے لیٹن میں جو الفاظ درج ہوئے، اس میں یہ ترجمہ کر دیا گیا کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے، اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری مراد لی ہے، حالانکہ یہاں صحیح ترجمہ یہ تھا کہ "مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے، پس اس کو اس کے گھر والوں کے یہاں پہونچا دو۔"

عرب ان تمام بیماریوں کو جن کا سبب معلوم نہ ہوتا، خبیث روحوں اور شیطان کا اثر سمجھتے تھے، عیسائی مصنفوں نے اپنے وہمی ذہن سے یہ سمجھ لیا کہ یہ بیماری صرع تھی، حالانکہ عرب صرع ہی کو نہیں، بلکہ ہر ایک پیچیدہ بیماری کو شیطان کا اثر سمجھتے تھے، لیکن ایک عیسائی مورخ گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بیماری سے متعلق لکھا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے۔" سرسید احمد خاں نے صرع کے بارے میں پہلے تو طبی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں سانس رک جانے اور اعصاب میں تشنج پیدا ہو جانے کی وجہ سے بے اختیار ہو کر شدت سے اعصاب پھڑکنے لگیں، اور کبھی سانس بالکل ہی بند ہو جائے، اس بیماری میں مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے، بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے، اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی، مردہ دلی اسے کاروبار سے معذور کر دیتی ہے، بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے، تمام جسم میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، اس کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، ایسے مریض کے ذہن میں اپنی کمزوری کا یقین جم جاتا ہے، اور اسے مشقت طلب کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے، اس تفصیل کے بعد، سرسید نے نہایت وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ:

> "کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا، کہ مذکورۂ بالا اثرات میں سے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا، بلکہ اس کے برخلاف سب اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے، خود سر ولیم میور کہتے ہیں کہ دو برس کی عمر میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھڑایا، اور ان کے گھر لے گئیں، آمنہ اپنے لڑکے کو تندرست اور قوی ہیکل دیکھ کر جو آپ سے دوگنی عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتی تھی، اس قدر خوش ہوئیں کہ

"حلیمہ سے کہا کہ اس کو پھر لے جا" لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مضبوط، تندرست اور قوی تھے، بہت تیز چلا کرتے، اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے، تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اور ان سب کو انھوں نے کمال صبر و استقلال سے برداشت کیا، انھوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی مثال نہیں پائی جاتی، علم الٰہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قایم کیا جن کا ہمسر جہاں سے معدوم ہے، انھوں نے قانون تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پر پہنچا دیا، جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا، ان کے ذریعہ انسانوں کی بہبود اور رفاہ کے لیے وہ ملکی و مالی، دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا، جو اپنی نوعیت کا یکتا و بے نظیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرۂ عرب کو فتح کیا، اور مختلف قبیلوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان مضبوط اور طاقتور قوم بنا دیا، جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے بڑے حصہ کو معمولی عرصہ میں مفتوح و مسخر کر لیا۔ کیا یہ خیال عقل و انصاف کی رو سے درست ہوگا کہ ایسے نمایاں کارنامے ایک لاچار اور ناتواں، صرع کی بیماری میں مبتلا شخص سے وجود میں آئے ہوں گے، ایسے نمایاں کارنامے اسی شخص کے ذریعہ عمل میں آسکتے ہیں، جس کی روحانی و جسمانی قوتیں صحیح و سالم ہوں، اور جس کو تائید ربانی حاصل ہو۔"

(خطبات احمدیہ: ص ۴۵۷-۴۳۸)

سر ولیم میور کہتے ہیں کہ حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سر پر سایہ فگن دیکھ کر گھبرائیں اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لیے روانہ ہوئیں" تعجب کی بات یہ ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے، اور سر ولیم کو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کا خیال آگیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اگر کبھی بادل کا ٹکڑا سایہ دار آگیا ہو تو یہ بات ناممکن نہیں، البتہ یہ خیال کہ آپ پر ہمیشہ بادل سایہ کیے رہتے تو اس کی کوئی سند نہیں، ورنہ اکثر صحابہ اس کا ذکر کرتے، اور مستند حدیثوں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا،

ایک مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے وقت جو کیفیت طاری ہوتی تھی،، سر ولیم میور اُسے بھی "صرع" کی بیماری کا اثر ثابت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں، جس پر سر سید احمد خاں نے اس طرح اظہار

خیال فرمایا ہے:

"ہم سر ولیم میور کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرعی دوروں نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا، اور اُن کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا، تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر آدمی مصروع جانتا ہو، اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے اور جو شخص اپنی قوم کی بت پرستی کو مٹانے کے لیے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ اسکی اس بیماری سے واقف ہوں، لیکن اس کے باوجود اس کے عزیز و اقارب اور عرب کے تمام بڑے بڑے لوگ اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں، اور اپنے آبائی مذہب اور قدیم رسموں کو چھوڑ کر اس شخص کے قول فعل پر کامل ایمان لے آئیں، (خطبات: ص ۴۷۷)

اہل کفر کے لیے دعائے مغفرت

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی مخالفت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے حکموں کی سختی اور شدت کی ایک عجیب مثال ہے"۔ مگر سر سید فرماتے ہیں کہ" ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں، اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں، بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گیے ہوں کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے، بلکہ یہ بات زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لیے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے، مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے، تو "رحم دل" عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے لیے جو اگرچہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں، مگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں، کیسا نرم فیاضانہ اور رحم دلی کا سلوک کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امیدیں پوری نہیں ہوئیں، بلکہ سر سید کے اپنے الفاظ میں:

"ہماری توقع کے خلاف" رحم دل "عیسائی مذہب میں غیر عیسائیوں کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اتھینیسین خطبہ میں جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں متعین دنوں میں پڑھا جاتا ہے، اور تمام اہل کلیسا کے اتفاق سے منظور ہوا ہے، ان سب

عقیدوں کو بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر فرض ہے، صاف طور پر یہ لکھا گیا ہے کہ یہ عیسوی عقیدہ ہے جس پر عقیدہ رکھے بغیر کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا۔" تو جب کہ "رحم دل" عیسوی مذہب کے مطابق ایسا شخص نجات کا حق نہیں ہے اور اس لیے کسی کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے، تو عیسوی مذہب کو اس بارہ میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟" (خطبات: ص ۲۴۹)

سامان خورد و نوش میں برکت

سر ولیم میور اپنی کتاب میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے، تو تمام خاندان کے لوگ اپنے کفایت شعار کھانے سے (فارغ ہونے پر بھی) بھوکے ہی اٹھتے تھے، لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا"

پھر سر ولیم میور اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ اس بات کو عروج پذیر نبی کی بڑائی اور عظمت خیال کیا جاتا، لیکن سر ولیم میور نے اس موقع پر بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے اپنی مذہبی روایات کو نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ سرسید احمد فرماتے ہیں کہ:

"ہم کو تعجب ہے کہ عیسائی ایسی روایتوں کو اعتراض کی نیت سے نقل کرتے ہیں (حالانکہ) ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ وہ متی باب ۱۴، آیت ۲۰، ۱۹ کے اس بیان کو مانتے ہیں کہ (حضرت مسیحؑ نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں، اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی، اور ان کو توڑا اور اپنے حواریوں کو دیں، اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں، اور ان سب نے پیٹ بھر کے کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گیے اٹھا لیا۔"

آنحضرتؐ کے سفر شام سے نبوت کا تعلق

سر ولیم میور نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام سے متعلق ایک روایت یہ نقل کی ہے کہ:

"جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے، تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کے درمیان اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ آپ کے سر پر ایک بادل سایہ کیے ہوئے چلتا تھا، اور درختوں کی شاخیں آپ کے اوپر دھوپ روکنے کے لیے جھک جاتی تھیں، اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے اور مہر نبوت کو معلوم کرنے کے لیے آپ کے جسم کا معائنہ کیا۔"

شام کے اس سفر میں، سر ولیم میور کا یہ خیال ہے کہ:۔

"زمانۂ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقامات نے جن کو خیالی قصوں، عجیب و غریب روایات اور دلکش روایتوں نے اور بھی موثر بنا دیا تھا، اور گرجاؤں صلیبوں مورتوں، آراستہ مذہبی نشانات و آثار اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے غور و فکر کرنے والے دل و دماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑا اور پائیدار اثر ڈالا تھا۔"

سرسید نے، سر ولیم میور کے جواب میں اول تو ترمذی کی یہ روایت پیش کی ہے کہ "ابو طالب نے محمد ...... صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا" وہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۲ دو سال چھوٹے تھے، اور بلالؓ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بارہ ۱۲ سال کی تھی، اس لیے آپ کو ان دونوں حضرات کے ساتھ شام سے واپس بھیجنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، لیکن، اگر اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی سرسید کے نزدیک یہ بات ہرگز لایق تعجب نہیں ہے کہ بحیرہ راہب کو آپؐ کے بارہ میں نبی ہونے کا گمان ہوا ہو، کیونکہ اس وقت یہود و نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر یہ بات کہ بارہ ۱۲ سال کی عمر میں، آپ نے محض ایک ہی سفر میں اور معمولی سی وقت میں بحیرہ راہب سے نبوت کا کامل سبق پڑھ لیا، اور تقریباً تیس ۳۰ برس کے بعد اس کو اچانک لوگوں کے سامنے پیش فرمایا یہ بات سر ولیم میور کے شر انگیز لیکن زرخیز ذہن کی پیداوار تو ہو سکتی ہے لیکن کیا ایسا ہونا ممکن بھی ہے؟ اور پھر سر ولیم میور یہ بھی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرگی زدہ شخص تھے، اس موقع پر سرسید احمد خاں فرماتے ہیں کہ:

"ہم سر ولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص کے دل و دماغ میں غور و فکر کی اس قدر صلاحیت ممکن ہے، اگرچہ سر ولیم میور کا یہ بیان نہایت دلچسپ ہے، مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ اسی لڑکے نے "جس کا دماغ صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامتوں کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا تھا" بعد میں انہی چیزوں کی مخالفت کی صلیب کو توڑا، مورتوں کو پھوڑا، ان کی پرستش سے منع کیا، اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتلایا، اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا، اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا،

میں وہ ایک دل رکھتا تھا، کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزری تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں صلیبوں، مورتوں اور دین عیسوی کی علامات تک، وہ اس قدر عقل و فہم و ذکا سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں کو دیکھ کر انہی کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات پیش کر سکا، وہ لڑکا بلاشبہہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی، اور وہی تھا، جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ کہکر بشارت دی تھی، کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمھارے لیے ضرور ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی احمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے پاس نہیں آوے گا، اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمھارے پاس بھیج دوں گا۔''

(خطبات احمدیہ: ص ۷۵۲)